پاکستان
میں بین الاقوامی مداخلتیں
ذبیح اللہ صدیق بلگن

# پاکستان میں بین الاقوامی مداخلتیں

ذبیح اللہ صدیق بلگن

نگارشات

نام کتاب: پاکستان میں بین الاقوامی مداخلتیں
مصنف: ذبیح اللہ صدیق بلگن
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
PH:0092-42-37322892 FAX:37354205
مطبع: حاجی منیر پرنٹر، لاہور
کمپوزنگ: عبدالستار
سال اشاعت: 2015ء
قیمت: -/500 روپے

# انتساب!

پاک فوج اور دیگر عسکری اداروں کے نام۔۔۔۔

جوارض پاک کی جغرافیائی، نظریاتی اور ثقافتی سرحدوں کے دفاع کیلئے غیر ملکی مداخلت کے آگے سینہ سپر ہیں اور جرأت و بہادری سے دشمن کی سازشوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

# فہرست

# پیش لفظ

پاکستان میں بین الاقوامی مداخلت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود پاکستان کا وجود۔ دراصل قیام پاکستان کے وقت ہی سے بین الاقوامی طاقتوں کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اسلام کی بنیاد پر وجود میں آنے والی نوزائیدہ ریاست کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی؟۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی طاقتوں نے مختلف انداز میں پاکستان میں مداخلت کر کے اس کی قومی اور خارجہ پالیسی کو اپنی مرضی کے مطابق استوار کرنا چاہا۔ پاکستان چونکہ بھارت سے الگ ہوا تھا لہذا بھارت کو پاکستان کا وجود ایک آنکھ نہ بھاتا تھا یہی وجہ ہے کہ وسائل کی تقسیم کے معاملے میں بھارت نے صریحاً بددیانتی کا مظاہرہ کیا اور پاکستان کے حصے آنے والی رقوم اور دیگر وسائل ہڑپ کر گیا۔ اسی طرح علاقوں کی تقسیم کی معاملے میں بھی ریڈ کلف کمیشن کے ذریعے پاکستان کے ساتھ ناانصافی کی گئی اور مسلم اکثریتی علاقے بھارت کو دے دیے گئے۔ مذکورہ غیر منصفانہ تقسیم ہی کی وجہ سے پاکستان معاشی طور پر دگرگوں حالت تک جا پہنچا جبکہ اس کے پاس سرکاری ملازمین کو تنخواہیں ادا کرنے کیلئے رقم بھی موجود نہ تھی۔

بھارت نے نہ صرف پاکستان کو معاشی طور پر مفلوج کیا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی سلامتی کا دشمن بن بیٹھا اور سازشوں کے جال بنتا رہا۔ بھارت نے اپنی خفیہ ایجنسی را کے چیف رامیش ورناتھ کاؤ کے ذریعے پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی جامع منصوبہ بندی کی جبکہ پاکستان کو ایک ناکام ریاست میں تبدیل کرنے اور دو قومی نظریہ جو تخلیق پاکستان کا جواز بنا تھا اس کو باطل قرار دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

مشرقی پاکستان، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں شرمناک کھیل کھیلا گیا اور بھارتی ایجنٹ پیدا کئے گئے۔ بھارت کی شدید خواہش ہے کہ وہ مشہور زمانہ ''کاؤ بوائے منصوبہ'' پر

عملدرآمد کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کی طرح خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کو بھی پاکستان سے الگ کردے، یہی وجہ ہے کہ بھارتی ریشہ دوانیاں بدستور جاری ہیں۔ اسی طرح امریکہ نے ہر دور میں پاکستان میں کھلم کھلا مداخلت جاری رکھی اور اپنی پسند کی حکومتوں کے قیام کیلئے اکھاڑ پچھاڑ کا موجب بنتا رہا۔ محض اتنا ہی نہیں امریکہ نے کبھی این جی اوز اور کبھی اپنے پاکستانی ایجنٹوں کی زریعے پاکستان کے ثقافتی، سماجی اور مذہبی تشخص کو تبدیل کرنے کیلئے متعدد سازشیں کیں جو ہنوز جاری ہیں۔ دراصل امریکہ کو اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست میں مدارس و مساجد کی کثرت پریشان کئے ہوئے ہے اور اس کی شدید خواہش ہے کہ پاکستان کے تعلیمی نصاب کو تبدیل کر کے پاکستانیوں کو اسلام اور جہاد سے دور کر دیا جائے۔ اس خواہش کی تکمیل کیلئے جنرل پرویز مشرف کے دور کی وزیر تعلیم زبیدہ جلال بھرپور کوشش کر چکی ہیں تاہم اس کے وقت کے وزرائے اعظم میر ظفر اللہ جمالی اور چودھری شجاعت حسین نے اس منصوبے کو پنپنے نہ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب سے پاکستان ایٹمی قوت بنا ہے اسلام اور پاکستان دشمن قوتوں کی آنکھوں میں خار کی طرح چبھ رہا ہے۔ اسرائیل، امریکہ اور بھارت پاکستان کو ایٹمی قوت بننے کی ''سزا'' دینا چاہتے ہیں۔ یہ چونکہ میڈیا کا دور ہے لہذا اسرائیلی، امریکی اور بھارتی سازشیں و ناپاک منصوبے اکثر بے نقاب ہو کر منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ ہمارے مغرب میں واقع افغانستان کا حال یہ ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ افغانستان میں سیاسی استحکام اور ترقی کیلئے مخلصانہ کوششیں کیں لیکن افسوس افغانستان کا جھکاؤ ہمیشہ روس اور بھارت کی جانب رہا۔ ہنوز افغانستان نے بھارت، اسرائیل اور امریکہ کو پاکستان میں مداخلت کیلئے اپنی سرزمین فراہم کر رکھی ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا کہ افغانستان میں قائم بھارتی قونصل خانے پاکستان کے عسکریت پسندوں کو مالی امداد فراہم کر رہے ہیں تازہ صورتحال یہ ہے کہ آپریشن ضرب عضب کی وجہ سے افغانستان فرار ہو جانے والے عسکریت پسندوں کو بھارت محفوظ پناہ گاہیں فراہم کر رہا ہے۔ یہ کہنے میں حرج نہیں کہ پاکستان چاروں اطراف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے اور یہ دشمن پاکستان کی سلامتی پر سوالیہ نشان ثبت کئے ہوئے ہیں۔ کتاب ''پاکستان میں بین الاقوامی مداخلت'' میں امریکہ، روس، بھارت، اسرائیل اور

افغانستان کی پاکستان میں مداخلت کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ کتاب کی ضخامت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایران، ترکی، سعودی عرب، چین اور دیگر ممالک کی مداخلت کو موخر رکھا گیا ہے۔ زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ مستقبل قریب میں ان مماک کی پاکستان میں مداخلت کا تفصیلی جائزہ بھی لیا جائے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ تاریخ کے طالب علموں کیلئے یہ کتاب ممد معاون ثابت ہوگی اور ان کے لئے بہتر معلومات کا زریعہ ثابت ہوگی۔ میں اپنی اس کاوش میں معاونت کرنے پر ملیحہ ہاشمی، امجد اقبال (روزنامہ جنگ) محمد عثمان (جیوٹی وی) آصف محمود (روزنامہ نئی بات)، طیبہ ذبیح، آمنہ مطیع بلگن، عطاء اللہ ملہی، چودھری عدنان احمد بلگن، ندیم بشیر میر، محترمہ مریم طاہر اور بلال علی برکت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ذبیح اللہ صدیق بلگن

4 اگست 2014ء، لاہور پاکستان

zabeehullah76@gmail.com
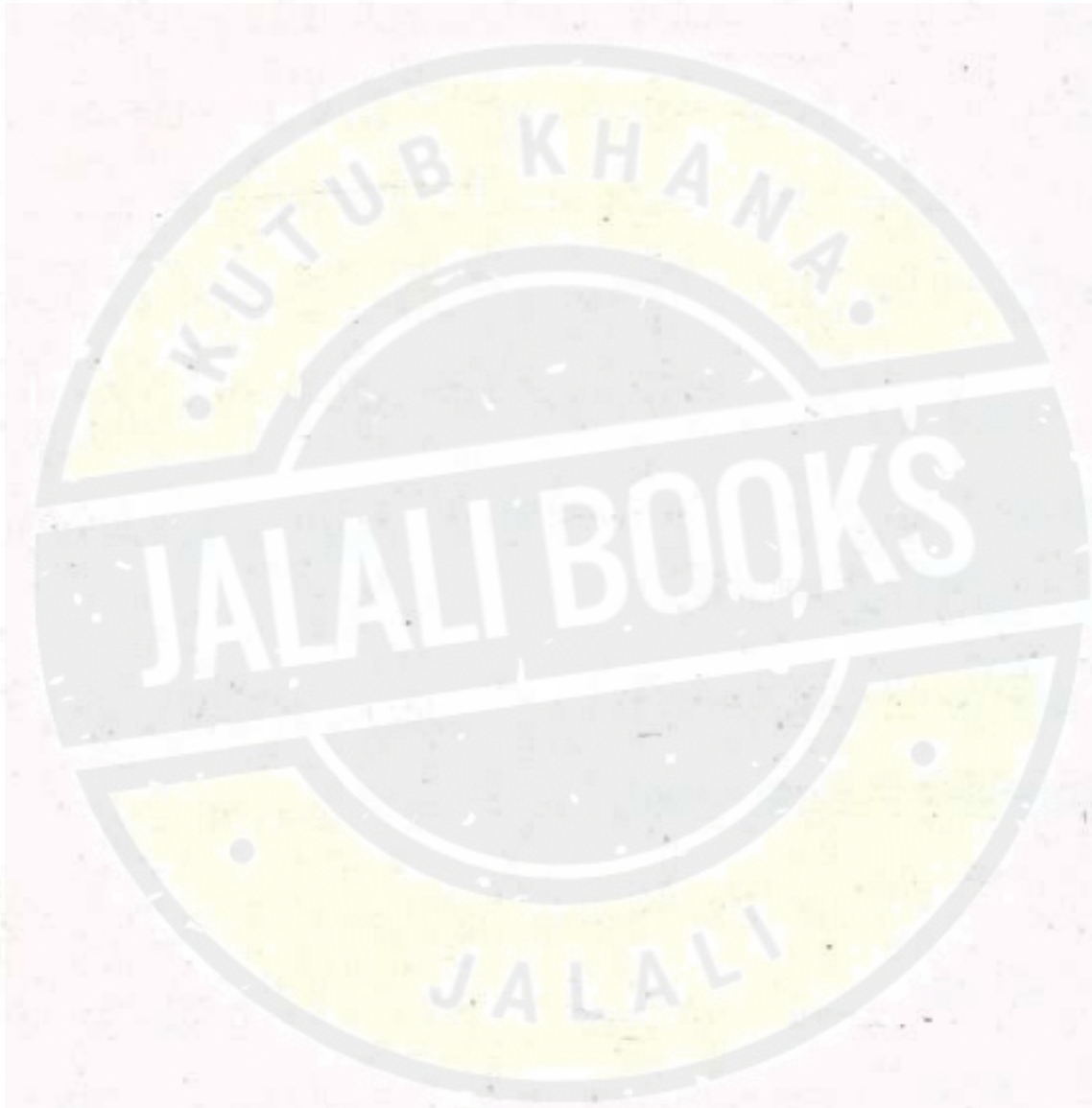
باب نمبر 1

# پاکستان میں بھارتی مداخلت

## ہندوستان کے قدیم باشندے، گوتم بدھ اور مسلمانوں کی آمد

براعظم ایشیا کے جس خطے پر آج پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش واقع ہیں اسے برطانیہ کی آمد سے پہلے ہندوستان یا ہند لکھا اور بولا جاتا تھا جبکہ انگریزوں نے اسے انگلش زبان کے لفظ ''sub continent'' کے نام سے لکھنا شروع کیا تو مقامی تحریروں میں اس لفظ کے اردو ترجمے 'برصغیر' (خشکی کا ایک چھوٹا حصہ یا ٹکڑا) کے لفظ نے رواج پایا۔ بعض لکھنے والے اسے بر عظیم (یعنی خشکی کا بڑا حصہ یا ٹکڑا) لکھتے ہیں۔ جو لوگ اسے جانتے ہیں ان کے نزدیک یہ دنیا کے زرخیز علاقوں میں سے ایک ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ یہ ایک ہزار سال تک بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث بنا رہا۔ بقول شبلی نعمانی یہاں سے کئی علوم عرب دنیا، چین اور وسطی ایشیائی ریاستوں تک پہنچے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مذکورہ علاقوں میں دو اطراف سے انسانوں کی آمد ہوئی۔ شمال سے نارڈک لوگ اور جنوب مغرب سے عرب کے خطوں سے لوگ موجودہ سندھ کے علاقوں میں داخل ہوئے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نمرود کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر یہاں تک پہنچے تھے، یہی حوالہ ٹھٹھہ کو ہندوستان کا قدیم ترین شہر ہونے کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ تاریخ میں درج ہے کہ ان لوگوں کی پیروی کرتے ہوئے عرب تاجر بھی قبل از اسلام مالا بار کے ساحلی علاقوں تک آتے رہے ہیں جنہوں نے ظہور اسلام کے وقت ہی ہندوستان میں اسلام کو متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔

یہ بات تاریخی شواہد سے ثابت ہو چکی ہے کہ محمد بن قاسم سے تقریباً 75 یا 77 سال قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ہو چکی تھی۔ اگر نصابی تاریخ کو بھی حوالے کے طور پر تسلیم کر

لیا جائے جس میں محمد بن قاسم کی سندھ پر حملہ کرنے کی وجہ، کراچی (ان دنوں اس شہر کا نام دیبل تھا) کے راجہ داہر کے ہاتھوں حجاج اکرام کے قافلوں کو لوٹنا اور ان میں موجود خواتین کی بے حرمتی تھی تو اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عرب کی طرف حج بیت اللہ کے لیے جانے والے مسلمان ہی ہو سکتے ہیں، دوسرا یہ کہ یہ مسلمان ہندوستان میں کہاں سے آئے تھے جو 712 عیسوی یا 77 ہجری کو بیت اللہ کی طرف سمندری راستے سے حج کی غرض سے جا رہے تھے۔ یہ وہی مسلمان عرب تاجر اور ان کے اہل خانہ تھے جو مالا بار کی ساحلی ریاستوں میں اسلام کے ابتدائی دنوں میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور مقامی راجے نے ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر نہ صرف ان کو تجارت کرنے کی اجازت دے رکھی تھی بلکہ ان کے لیے قوانین میں بھی نرمی کر رکھی تھی۔ ان مسلمان عرب تاجروں نے مقامی لوگوں سے شادیاں بھی کیں جن کی اولادوں اور اہل خانہ کو راجہ داہر نے روک کر لوٹا تھا۔ (یاد رہے کہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں عربوں کی قبل از اسلام آمد کا ذکر شیخ اکرام نے بھی اپنی کتاب ''پاکستان کا ثقافتی ورثہ'' میں کیا ہے)۔ اس کے علاوہ ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر نے اپنی کتاب 'طلوع سحر' میں تاریخ ازبکستان کے حوالے سے مسلمانوں کی برصغیر میں آمد کے متعلق لکھا ہے کہ'' آپ ﷺ کے اشارے سے جب چاند دو ٹکڑے ہوا تھا جسے شق القمر کہا جاتا ہے تو ہندوستان میں بھوپال کے راجہ نے بھی اسکا نظارہ کیا تھا جو اس وقت اپنے محل کی چھت پر اہل خانہ کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے اس واقعہ کے متعلق جاننے کے لیے اگلے دن پنڈتوں اور ہندو دانشوروں کو بلا کر اس کی وجہ دریافت کی۔ پنڈتوں اور اس وقت کے اہل علم ہندو مفکرین نے اسے بتایا کہ ان کی قدیم کتب میں لکھا ہے کہ عرب میں مسلمانوں کے آخری نبی ﷺ آئیں گے جن کا نام احمد یا محمد ﷺ ہوگا۔ انکے معجزوں میں سے ایک چاند کو دو ٹکڑے کرنا بھی لکھا ہے۔ ''طلوع سحر'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ راجہ نے اپنے بیٹے کو تحائف دیکر عرب روانہ کیا جو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اسلام قبول کر کے وہاں شادی بھی کی۔ جب وہ واپس ہندوستان آیا تو اس کا باپ مر چکا تھا۔ اس نے حکومت سنبھالنے تک اپنے اسلام کو مخفی رکھا کیوں کہ اس کے ساتھیوں میں سے صرف 35 افراد کے علاوہ سب اسلام سے منحرف ہو چکے تھے۔ اس نے جب حکومت مضبوط کر لی تو اسلام کا برملا اظہار کیا اور ایک مسجد تعمیر کرائی جو برصغیر کی سب سے پہلی

مسجد کہلاتی ہے ایک جگہ تاریخ از بکستان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے

ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کی آمد کا موضوع ایک الگ کتاب کا متقاضی ہے۔ ہندوستان کی طرف ابتدا میں آنے والے لوگوں کو بعض مورخین نے نارڈک بھی لکھا ہے جو اس کی وسیع وعریض چراگاہوں کو اپنے ساتھ لائے مویشیوں کے لیے موزوں خیال کرتے تھے۔ وہ اپنا سازوسامان انہی پر رکھ کر سفر کرتے تھے۔ کچھ مورخین نے ہندوستان میں ان لوگوں کی آمد دو ہزار اور کچھ نے پچیس سو سال قبل مسیح لکھی ہے۔ یہ دریائے رہائن سے بحیرہ کیسپین تک ایک ہی زبان کے مختلف لہجوں میں باہم گفتگو کرتے تھے۔ یہ گارے اور لکڑیوں سے اپنے جھونپڑے بناتے لیکن ان میں مستقل قیام پذیر نہ رہتے۔ اہتمام سے دفن کرنے کی بجائے اپنے رہنماؤں کو جلا دیتے اور ان کی راکھ ارن میں بھر کر ان کے لیے ایک بڑا دائرے کی شکل کا استھان بنا دیتے تھے۔ یہ لوگ عام مُردوں کو بھی جلا دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں کی سماجی زندگی اپنے راہنماؤں کی زندگی کے گرد گھومتی تھی۔ راہنما یا سردار عمومی مفاد کے لیے تمام مویشیوں اور چراگاہوں کے مالک ہوتے تھے جبکہ جنگلات اور دریا کو فطرت کی ملکیت قرار دیا جاتا تھا۔

ان نیلی آنکھوں والوں سے پہلے بھورے بالوں والے دراوڑی اس علاقے میں آباد تھے جو اپنے مُردوں کا جلایا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو دراز استھانوں میں نشست کے انداز میں دفن کرتے تھے۔ ہندوستان میں دراوڑیوں کی آمد سے قبل انسان زراعت سے خوراک حاصل کرنے کی مہارت سیکھ چکا تھا۔ 1500 قبل مسیح میں انہوں نے لوہے کا استعمال شروع کیا، کچی دھاتوں کو پگھلانے کا فن انہی لوگوں کا دریافت کردہ ہے۔ یہ لوگ آج کے اسپین، اطالیہ، برطانیہ، آئرلینڈ، یونان اور فرانس تک بھی گئے جہاں انہوں نے وہاں مقیم باشندوں کو ان کے علاقوں سے دور بھگا دیا اور ایک ہزار سال قبل مسیح میں بیشتر یونان کے مرکزی حصے اور جزیروں سے قدیم ایجیئن تہذیب کا صفایا کر دیا۔ تاہم آج سے تین ہزار سال پہلے بالکن جزیرہ ہائے سپین کے راستے ان آریائی قبائل نے قدیم دنیا کی تہذیب کے مرکز میں قدم رکھا۔ اس سے بھی کئی سو سال قبل وہ جنوبی علاقوں میں داخل ہوئے اور ایشیائے کوچک سے بھی گذرے۔ آریاؤں کے پھیلاؤ کی دوسری انتہا پر جنوب میں ایسے ہی قبائل ان کے برابر ترقی

حاصل کر چکے تھے۔ تاہم سنسکرت بولنے والے آریائی اسی دوران یا اس سے چند سو سال پہلے شمالی ہندوستان میں داخل ہوئے جہاں ان کا سامنا قدیم بھورے بالوں والوں کی دراوڑی تہذیب سے ہوا، جس سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ دوسرے آریائی قبائل وسطی ایشیا کے سلسلہ ہائے کوہ میں مشرقی سمت میں دور تک پھیل گئے۔

مشرقی ترکستان میں ہنوز سفید رنگت، نیلی آنکھوں والے نارڈک لوگ موجود ہیں لیکن وہ اب منگول زبانیں بولتے ہیں۔ نویں صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی قبل مسیح تک مورخین کے پاس یہی موضوع رہا کہ ان آریاؤں نے اقتدار کس طرح حاصل کیا اور کس طرح انہوں نے سامی، ایجیئن اور مصری تہذیبوں کو اپنا مطیع کیا۔ ایک طرح سے آریائی ہمیشہ فاتح رہے۔ فتح کے بعد جنگی مہارت حاصل کرنے اور عصائے سلطانی مکمل طور پر آریاؤں کے ہاتھ آجانے سے دنیا میں جنگ کا سماں پیدا ہوا جو کئی صدیوں تک جاری رہی اور بعد ازاں تاریخ کے تمام ادوار میں جاری رہی اور ایک اعتبار سے آج بھی جاری ہے۔ ول ڈیورنٹ نے ''story of civilization'' کے باب ''بدھ سے اندرا گاندی تک'' کے ہندوستان میں لکھا ہے کہ اگر تہذیب کی تعریف ایک ایسے سماجی نظام کے طور پر کی جائے جو ثقافتی تخلیق کو فروغ دیتی ہے تو پھر ہندوستانی تہذیب اتنی ہی پرانی ہے جتنی ماہرین آثار قدیمہ کی اب تک کی تحقیق قدیم ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے واقع موہن جوداڑو میں سر جان مارشل نے 1924 میں چار یا پانچ اوپر تلے تعمیر کردہ شہروں کے کھنڈرات دریافت کیے جن میں سینکڑوں پکی اینٹ کے مکانات اور دوکانیں موجود تھیں، انہیں وہاں پر پہیوں والی گاڑیاں، گھریلو استعمال کی اشیاء پینٹ کیے ہوئے برتن، سکے مہریں، بندے اور گلو بند ملے۔ ان (ول ڈیورنٹ) کے بقول ''تقریباً 3000 ہزار سال پہلے ہندوستان میں آریائی لوگوں نے بطور فاتحین رہائش اختیار کی، ذات پات کا ایک نظام رائج کیا، سنسکرت زبان کو ترقی دی اور ادب تخلیق کیا جس کے کچھ شذرے چاروں ویدوں اور کچھ اپشندوں (استاد اور شاگرد کے درمیان مذہبی فلسفیانہ سوال و جواب) کی صورت میں ہم تک پہنچے۔ وہ صدیوں تک سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہے۔ لیکن یہ ہندوستانی فلسفہ کی قدیم ترین صورتیں نہیں ہیں''۔ ہم تفصیل میں جانے کے بجائے آگے بڑھتے ہیں۔

## سدھارتھ گوتم بدھ

بدھ کی کہانی قصوں سے اس قدر بھری پڑی ہے کہ اس کے وجود کے متعلق شک ہونے لگتا ہے۔ ایک کہانی نے اسے کنواری ماں کا بیٹا قرار دیا۔ اس نے خود ملکہ مایا کے پہلو کو کھولا، کوکھ میں داخل ہوا اور دس ماہ تک وہاں رہنے کے بعد باہر نکلا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''وہ ناپاک رطوبتوں سے بالکل پاک تھا''، لیکن ''سیڑھیاں اترتے ہوئے آدمی کی طرح اور موتی کی طرح چمکتا ہوا۔'' بایں ہمہ اس کا باپ ہمالیہ کے نزدیک کپل وستو کا بادشاہ تھا۔ بدھ کا نام سدھارتھ گوتم رکھا گیا۔ اسے ہر قسم کے دکھ اور تکلیف سے دور رکھا گیا۔ اس کے لیے 500 سو دوشیزاؤں میں سے ایک خوبصورت بیوی منتخب کی گئی، وہ ایک مسرور باپ بنا اور امن و آشتی کی زندگی گذاری۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے باپ، بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر 6 سال تک سچائی کی تلاش میں جنگلوں سے گھاس اور بیج کھائے۔ لیکن ایک دن گوتم کو خیال آیا کہ خود اذیتی درست نہیں اور نہ ہی اسے کوئی بصیرت حاصل ہوئی ہے، دوسرا خود اذیتی سے وہ تکبر میں مبتلا ہو گیا جس نے کسی بھی ممکنہ تقدس کو زہر آلود کر دیا تھا۔ اس نے رہبانیت ترک کی اور نروان کے حصول کے لیے ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ گوتم نے خود سے سوال کیا کہ انسانی دکھ، بیماری، بڑھاپے اور موت منبع کیا تھا؟ اس نے ایک رو میں لاتعداد جنموں اور اموات کا سلسلہ دیکھا۔ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ جنم تمام برائی کی جڑ ہے۔

بدھ سوچتا کہ جنم کا سلسلہ رک کیوں نہیں جاتا، کیوں کہ قانون کرم دوبارہ جنم کا تقاضا کرتا ہے تا کہ روح سابقہ جنموں کے برے اعمال کا کفارہ ادا کر سکے۔ تاہم اگر کوئی شخص بلا تکان صبر، انصاف اور ہمدردی کی زندگی جیئے اور دل عارضی چیزوں کے ساتھ نہ لگائے تو دوبارہ جنم سے چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ اس کے لیے برائی کا سوتا خشک ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص تمام خواہشات رکھتے ہوئے بھی سب کے ساتھ اچھائی کرنے کی کوشش کرے تو انفرادیت جو نوع انسانی کا بنیادی واہمہ ہے پر فتح پانا ممکن ہے۔ انجام کار روح لاشعور لامتناہیت میں ضم ہو جائے گی۔ وہ دل کیسا پرسکون ہے جو خود کو تمام ذاتی خواہشات سے پاک کر لے۔ نروان کے ساتھ خواہشات سرد پڑ جانے سے سکون ممکن ہوتا ہے۔ چناں چہ سات سال تک مراقبہ کے بعد گوتم

نوع انسانی کو نروان کی تعلیم دینے نکل کھڑا ہوا۔ جلد ہی اس کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے تعلیمات لینے لگی کیوں کہ وہ اپنی پرواہ نہیں کرتا تھا اور ایک قابل بھروسہ استاد بن چکا تھا۔ اس نے شاگردوں کو سمجھایا کہ ''غصے پر نرمی سے اور برائی پر اچھائی سے غلبہ حاصل کرو، نفرت ہرگز نفرت کو ختم نہیں کر سکتی، یہ صرف محبت سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔'' شاگردوں نے اس کا نام 'بدھ' یعنی جاگا ہوا یا بیدار رکھ دیا۔ مگر اس نے کبھی کسی دیوتا کا اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس نے تمثیلات کے ذریعے اخلاقی تعلیم دی، یا پھر پانچ جملوں پر مشتمل ہدایات دیں۔

کوئی شخص کسی جان دار چیز کو ہلاک نہ کرے،

کوئی ایسی چیز نہ لو جو تمہیں دی نہ دی گئی ہو،

جھوٹ نہ بولو،

نشہ آور اشیا استعمال نہ کرو، اور بدکاری نہ کرو۔

بدھ کا تصور مذہب خالصتاً اخلاقیاتی تھا۔ اس نے طرز عمل کے ہر پہلو پر زور دیا۔ بدھ کی تعلیم کے مطابق روح جسم کی حیات بخش قوت اور ایک شخصیت کے طور پر باقی رہتی ہے اور اس جنم میں کیے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر روح ہی کسی دوسرے جسم میں دوبارہ جنم لیتی ہے۔ بدھ مت تیسری صدی قبل مسیح میں بادشاہ اشوک کے عہد میں پھلنے پھولنے کے بعد ہندوستان میں تیزی سے انحطاط کا شکار ہو گیا اور صرف سری لنکا میں اسے کامیابی ملی۔ دریں اثنا سیاسی و عسکری ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہندوستان پر سکندر اعظم نے حملہ کر دیا۔ پھر ہن آئے، ان کے بعد عرب، ترک، تیمور، پرتگیزی، فرانسیسی اور آخر میں انگریزوں نے ہندوستان کی دولت لوٹی اور عوام کو غربت و فلاکت سے دوچار کیا۔

## انگریزوں کی آمد اور تقسیم ہند

تاریخ دنیا کی مختلف قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک قوم کے زوال کے وقت تاریخ کسی دوسری قوم کے عروج کی داستان مرتب کر رہی ہوتی ہے۔ جب برطانوی انگریز برصغیر میں آئے تو وہ اس سے پہلے دو سو سال کا جنگی تجربہ اور دنیا بھر

کی دولت سمیٹ چکے تھے جس میں امریکہ اور آسٹریلیا تک کے امیر خطے شامل تھے۔ برصغیر پر قبضہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ انگریز سرکار کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہونے کے باوجود انہوں نے یہاں تاجروں کے روپ میں قدم رکھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جسے تاج برطانیہ کی مکمل حمایت حاصل تھی پہلے یہاں کی معیشت اور پھر اقتدار پر قابض ہوئی تو ہندوستانی ان کی غلامی میں چلے گئے۔ 1857 کا معرکہ جسے انگریز غدر اور ہم جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، سے پہلے ان کے پاس لاکھوں کی فوج تھی جس میں 70 فیصد مقامی سپاہی اور چھوٹے رینک کے افسران تھے۔ مورخین کے مطابق بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کا 23واں بادشاہ تھا۔ 1857 کی جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اور دہلی میں آخری مسلمان بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو جنگ کے بعد رنگون کے قلعے میں بند کر دیا گیا۔ اگلے پچاس سال مسلمانوں کی اکثریت نے ایک اطاعت گزار رعایا کے طور پر گذارے، سوائے تحریک شیخ الہند (تحریک ریشمی رومال) سے وابستہ مسلمانوں کے ایک گروپ کے جو خفیہ طریقے سے جرمنی اور ترکی کی مدد سے انگریزوں کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ چناں چہ 29 جنوری 1917 کا منصوبہ ناکام ہوا اور ایک بڑی تعداد میں مسلمان حریت پسند گرفتار ہو کر عقوبت خانوں کے مہمان ہوئے اور انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔

بیسویں صدی کا پہلا عشرہ بھی نہیں گذرا تھا کہ برطانیہ میں کنزرویٹو کے بعد لبرل پارٹی اقتدار میں آئی جو برصغیر میں تبدیلیوں کی بھی خواہاں تھی کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی معیشت تباہ و برباد ہو چکی تھی اور اس کے لیے اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برصغیر میں مسلمانوں کا ایک وفد یکم اکتوبر کو شملہ میں وائسرائے سے ملا۔ اس وفد نے مطالبہ کیا کہ متوقع اصلاحات کے موقع پر مسلم قوم کو علیحدہ نیابت کی بنا پر مقننہ اور مقامی اداروں میں اس کا جائز حصہ دیا جائے۔ اس نوع کے جلسوں، تنظیموں اور قراردادوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک الگ جماعت کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ یوں ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ خان کی دعوت پر 30 دسمبر 1906 کو آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے چالیس سال تک جدوجہد کے مختلف مراحل سے گذر کر بالآخر 14 اگست 1947 کو ایک الگ ملک حاصل کر لیا جس کا نام پہلے سے پاکستان تجویز کیا جا چکا تھا۔ اس طرح البیرونی

کی ایک ہزار سال قبل کی ہوئی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی کہ مختلف مذاہب، تہذیبوں اور نسلوں کے لوگ آزادمرضی سے طویل عرصے تک اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

## ہندوستان کی تقسیم کے دوران جارحیت اور مسلم علاقوں پر قبضہ

### ریڈکلف ایوارڈ اور باؤنڈری کمیشن

3 جون کے منصوبے کے تحت بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے تقسیم کے حق میں دیے گئے فیصلے کے بعد دونوں صوبوں میں دو باؤنڈری کمیشن قائم کیے گئے جن کا چیئرمین لارڈ ریڈکلف تھا۔ پنجاب کے باؤنڈری کمیشن میں پاکستان کی طرف سے جسٹس دین محمد، جسٹس محمد منیر جبکہ ہندوستان کی طرف سے جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ نے نمائندگی کی۔ اسی طرح بنگال کا باؤنڈری کمیشن جسٹس بی کے مکرجی، جسٹس سی سی وسواس، جسٹس ابو صالح محمد اکرم اور جسٹس ایس اے رحمان پر مشتمل تھا۔ سرحدوں کے تعین کے فارمولے کے مطابق مذکورہ کمیشن کے ارکان کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے کیونکہ انگریز کانگریس کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ لہٰذا 17 اگست 1947ء کو ریڈکلف نے اپنی طرف سے اعلان کرتے ہوئے بٹالہ، فیروزپور، جالندھر، گورداسپور کے مسلم اکثریتی اضلاع ہندوستان کے حوالے کر دیے۔ اسی طرح بنگال میں بھی پراسرار طور پر سرحدوں کا تعین کرتے ہوئے فارمولے کی خلاف ورزی کی گئی اور کلکتہ کا شہر مرشد آباد ہندوستان کو دے دیا گیا جس سے پاکستان کو 6 ہزار مربع میل کے علاقے سے محروم ہونا پڑا۔ مسلم لیگ جو پہلے سے چیئرمین کے فیصلے کو قبول کرنے پر متفق ہو چکی تھی نے اسے قبول کر لیا۔ قائداعظم اور مسلم لیگ نے اقوام متحدہ یا پریوی کونسل کے ذریعے حد بندی کے مسائل کو نبٹانے کی تجاویز بھی دیں جنہیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریس نے حیلوں بہانوں سے مسترد کر دیا۔ کانگریس اور ماؤنٹ بیٹن نے ایک خفیہ سمجھوتے کے تحت کشمیر اور جوناگڑھ پر قبضہ کرنے کی اسکیم تیار کر رکھی تھی جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کسی بیرونی ادارے کی موجودگی اس میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔ ریڈکلف جو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی آشیرباد سے کمیشن کا چیئرمین مقرر ہوا تھا 8 جولائی 1947ء کو دہلی پہنچا۔ اس نے چار دن بعد کلکتہ اور پھر

لاہور کا دورہ کیا اور واپس دہلی چلا گیا۔

چودھری ظفر اللہ جو پاکستان کی طرف سے اس کام میں وکالت پر مامور تھے نے انکشاف کیا کہ ریڈ کلف نے لاہور قیام کے دوران اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہوائی جہاز کے ذریعے ایک خاص علاقے پر پرواز کر کے اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ خاص علاقہ پٹھانکوٹ تحصیل میں مادھوپور ہیڈورکس اور تحصیل گورداسپور بٹالہ اور ضلع امرتسر کے ملحقہ علاقوں پر مشتمل تھا۔ ریڈ کلف کمیشن کے رکن جسٹس دین محمد کو بھی اس دورے پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر ان کی صحت نے اجازت نہ دی۔ اگرچہ جسٹس دین محمد نے ریڈ کلف کے اس مشکوک رویے کی شکایت مسلم لیگ کے اکابرین اور قائداعظم سے بھی کی مگر انہوں نے اس پر توجہ نہ دی۔ تاریخی شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن 3 جون کے منصوبے میں ردوبدل کی ہاں پنڈت نہرو سے کر چکا تھا جس کے مطابق مسلم اکثریت والا ضلع گورداسپور مکمل طور پر پاکستان میں شامل کرنے کی بجائے اسے تقسیم کر کے پٹھانکوٹ کی تحصیل ہندوستان کو دینے کی منافقانہ چال چلی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کی اس ناانصافی اور سازش کی سزا آج تک پاکستان اور کشمیری مسلمان بھگت رہے ہیں۔

پٹھانکوٹ کی تحصیل بھارت کو دینے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کشمیر تک راستہ مل گیا۔ اس تحصیل کا شمالی سرا جموں و کشمیر کے علاقے سے ملتا ہے۔ پٹھانکوٹ میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لئے اسے باقی ضلع سے کاٹ کر بھارت میں شامل کرنے کا بہانہ موجود تھا۔ لیکن دیگر کئی مقامات پر اس فارمولے کی بھی خلاف ورزی کی گئی۔ پاکستانی جج جو کمیشن کے ارکان تھے فوری طور پر یہ سمجھ گئے کہ ریڈ کلف اس علاقے کا فضائی دورہ کیوں کرنا چاہتا تھا۔ جسٹس دین محمد نے اپنے موکل ظفر اللہ خان سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ مطالبات مرتب کرنا مسلم لیگ کا کام ہے، میرا کام صرف مطالبات کی وکالت کرنا ہے۔ اس طرح اپنوں کی سستی اور غیر کی عیاری سے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا۔ ضلع گورداسپور کی تقسیم کو قبول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ''صوبائی مسلم لیگ کے صدر نواب ممدوٹ نے مطالبات مرتب کرتے وقت موقف اختیار کیا کہ ضلع گورداسپور کی تقسیم کا اصول خود تسلیم کر لیا جائے اور ضلع فیروزپور کی تقسیم پر زور دیا جائے تاکہ نواب ممدوٹ کی جاگیر کو پاکستان میں لایا جاسکے''۔

مگر ایسا نہ ہو سکا بلکہ کانگریس اور ماؤنٹ بیٹن کی ملی بھگت سے گورداسپور کی تین تحصیلیں پٹھانکوٹ، گورداسپور اور بٹالہ جبکہ فیروزپور کی دو تحصیلیں فیروزپور اور زیرہ بھی بھارت کے حوالے کر دی گئیں۔ جب پاکستانی کمیشن (جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر) نے اس کی شکایت قائداعظم اور لیاقت علی خان سے کی تو انہوں نے کہا ’اس کے بدلے میں ان کو کچھ ضرور ملے گا‘۔

ماؤنٹ بیٹن کے پبلسٹی سیکرٹری کیمبل جانسن نے اپنی سوانح عمری میں انکشاف کیا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو ریڈکلف ایوارڈ 9 اگست کو دہلی میں موصول ہوا لیکن اس نے اس ایوارڈ، جس میں فیروزپور اور زیرہ کو پاکستان میں شامل کر دیا گیا تھا، میں تبدیلی کر کے بھارت میں شامل کر دیا اور 8 دن بعد 17 اگست کو اسے شائع کیا۔ ریڈکلف اور ماؤنٹ بیٹن نے جو سلوک پاکستان سے کیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بنگال میں بھی مرشد آباد، کلکتہ شہر اور نادیہ اور بندرگاہ کے علاقے بھی بھارت میں شامل کر دیئے گئے۔ یہ ایوارڈ انتہائی غیر منصفانہ، ناقابل فہم اور غیر معقول تھا جس سے پاکستان کے زرخیز ترین علاقے کاٹ کر بھارت کے سپرد کر دیے گئے۔ سب سے زیادہ شدید ضرب ضلع گورداسپور پر پڑی جس کی دو تحصیلیں گورداسپور اور بٹالہ جن میں مسلمانوں کی آبادی 52.1 اور 55.6 فیصد تھی بٹالہ جیسے صنعتی شہر سمیت بھارت میں شامل کر دی گئیں۔ لیکن پٹھانکوٹ کو جس اصول کے تحت بھارت میں شامل کیا گیا اس اصول کو امرتسر کی تحصیل انبالہ جہاں 60 فیصد مسلم آبادی تھی کو بھارت میں شامل کر کے یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ اسی طرح فیروزہ اور زیرہ میں بھی مسلمان اکثریت میں تھے لیکن مختلف حیلوں بہانوں سے ان کو بھارت میں شامل کر کے انصاف کا خون کیا گیا۔ اس کا مقصد سوائے ہندو راہنماؤں کو خوش کرنے کے اور کچھ نہ تھا جنہوں نے پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا اور متحدہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے سہانے خواب دیکھے تھے۔ قائداعظم نے باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کو غیر منصفانہ اور مکروہ قرار دیتے ہوئے کہا ”ہم اس کو قبول کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں لیکن سرحدوں کے تعین میں ہمیں ضرب لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی“۔

## جونا گڑھ، مناوَاور منگرول

ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر بمبئی اور کراچی کے درمیان جونا گڑھ کی ریاست واقع تھی۔ اس چھوٹی ریاست کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی مگر اس کا حکمران مسلمان تھا جو کہ نواب آف جونا گڑھ کہلاتا تھا۔ تقسیم ہند کے قانون کے تحت اس نے مسلمان ہونے کے ناطے جونا گڑھ کی پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا اور اس کی اطلاع قائد اعظم کو بھی دے دی۔ قائد اعظم نے 5 ستمبر 1947ء کو الحاق کی با قاعدہ منظوری دے دی اور اس کارروائی سے ہندوستان کو بھی آگاہ کر دیا۔ حکومت ہند کو مناوَ اور منگرول کے نوابوں نے بھی اپنی پاکستان میں شمولیت کے فیصلے سے مطلع کر دیا۔ حکومت ہندوستان نے جونا گڑھ کے نواب اور مناوَ اور منگرول کے شیوخ کے الحاق کے اس فیصلے پر شدید احتجاج کیا۔ ہندوستان نے جو استدلال دیا وہ یہ تھا کہ ان ریاستوں کے پاکستان میں شامل ہونے سے بھارت کی علاقائی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوگا۔ جونا گڑھ کے نواب کو رائے شماری کروانا چاہئے تا کہ وہاں کے عوام کی رائے معلوم کی جا سکے اور یہ رائے شماری ہندوستان اور جونا گڑھ ریاست کی مشترکہ نگرانی میں ہونی چاہئے۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس سے کچھ ہفتے قبل بھارت کشمیر میں رائے شماری کے اصول کو ٹھکرا کر وہاں کے ہندو راجہ کے الحاق کی خواہش کی رٹ لگا رہا تھا مگر جونا گڑھ کے معاملے میں وہ حکمران کی خواہش کے برعکس عوام کی صوابدید کا پرچار کرنے لگا۔ یہ نظریاتی تضاد درحقیقت ہندوستان کی جارحانہ حکمت عملی کا ایک حصہ تھا۔ اس وقت اس کی حیثیت ایک باؤلے کی مانند تھی جو کہ ہر ایک کو کاٹنے کے لئے پاگل پن میں کبھی ادھر دوڑتا ہے اور کبھی اُدھر۔ بہر حال اس رائے شماری کا مطالبہ تو محض دکھلاوا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اس ریاست کو ہڑپ کرنے کے منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔

ہندوستان نے احتجاج کے ساتھ اپنی فوجیں ریاست جونا گڑھ میں داخل کر دیں اور اس سے قبل اس نے ریاست کے تمام رسل و رسائل کے ذرائع کو منقطع کر دیا۔ ریلوے اور سڑکوں کو کاٹ دیا گیا جس کے نتیجے میں ریاست کی حیثیت پر برا اثر پڑا۔ ہندوستان نے ایک اور قدم یہ اٹھایا کہ بمبئی میں ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی جس نے رضا کار بھرتی کر کے

ریاست کے نظم ونسق کو مفلوج کر دیا۔ پھر اس نے بین الاقوامی رائے عامہ کو دھوکہ دینے کے لئے گفت وشنید کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کی حکومت نے رائے شماری کی تجویز پیش کی مگر ہندوستان نے اس تجویز سے ٹال مٹول سے کام لینا شروع کر دیا۔ ادھر ریاست میں اندرونی حالات انتہائی خطرناک شکل اختیار کر رہے تھے۔ معاشی مقاطع کی وجہ سے ریاست میں ابتری پھیل رہی تھی۔ ان حالات میں ہندوستان کی حکومت اس کو بزور شمشیر ہڑپ کر گئی۔

یکم نومبر 1947ء کو ہندوستانی افواج نے مناوٗ اور منگرول کی ریاستوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ 7 نومبر 1947ء کو جدید اسلحہ سے لیس بیس ہزار فوج نے ریاست جونا گڑھ کا انتظام سنبھال لیا۔ ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد حکومت ہندوستان نے حکومت پاکستان کو یہ اطلاع دی کہ دیوان کی درخواست پر ہندو عوام کی حفاظت کے لئے فوج جونا گڑھ میں داخل ہوئی ہے۔ پاکستان نے اس جارحیت پر احتجاج کیا اور ہندوستانی افواج کے انخلاء کا مطالبہ کیا۔ ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد بین الاقوامی رائے عامہ کو دھوکہ دینے کے لئے بھارت نے اپنی نگرانی میں رائے شماری کرائی اور یک طرفہ نتائج مرتب کر کے یہ اعلان کر دیا کہ ریاست کے عوام نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔ یہ غاصبانہ قبضہ آج تک قائم ہے اور اب ریاستوں کا الحاق ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ پاکستان میں قائداعظم کی وفات کے بعد گروہی سیاست نے جنم لیا اور مسلم لیگ کے دور حکومت میں اس جانب کوئی جراٗت مندانہ قدم نہ اٹھایا گیا۔ یہ معاملات تا حال اقوام متحدہ میں زیر غور ہیں۔

## پختونستان کا شوشہ

قیام پاکستان کے وقت صوبہ سرحد (آج کا خیبر پختون خواہ) میں ریفرنڈم کروایا جا رہا تھا تو سرحدی گاندھی عبدالغفار خان عوام کو بھارت کے حق میں ووٹ ڈالنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ اس لئے رائے شماری کا بائیکاٹ کر دیا گیا جس میں صوبہ سرحد کے عوام سے پاکستان میں شامل ہونے سے متعلق رائے لی گئی تھی۔ اپنے ارادوں میں ناکامی کے بعد انہوں نے پختونستان کا شوشہ چھوڑ دیا اور خان عبدالغفار خان نے اعلان کیا کہ پختونستان کے قیام کے لئے زندگی بھر جدوجہد کرتا رہوں گا اور 1930ء میں جن اصولوں پر کاربند تھا آج بھی ان پر عمل

پیرا ہوں۔ میرا راستہ قطعی صاف ہے اس راستے سے نہیں ہٹوں گا۔ خواہ دنیا میں تنہا ہی کیوں نہ رہ جاؤں۔ قائداعظم اور حکومت پاکستان کو اس سیاسی مسئلہ سے بھی نمٹنا پڑا۔

## کشمیر کا تنازع

پاکستان کی نئی مملکت معرض وجود میں آئی تو اس کے سامنے سب سے زیادہ اہم اور خطرناک کشمیر کا تنازعہ تھا۔ برصغیر کی تقسیم کرتے وقت تمام اخلاقی اصولوں کو پامال کر کے دھونس ودھاندلی کی گئی اور انگریز ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ایسا جھگڑا پیدا کر گیا جو دونوں ممالک کے درمیان وجہ کشیدگی بنا ہوا ہے۔

3 جون 1947ء کے منصوبے کے تحت ریاستوں کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان اور ہندوستان میں جس کے ساتھ چاہیں شامل ہو جائیں۔ ریاست جموں و کشمیر بھی دیگر ریاستوں کی مانند آزاد اور خودمختار تھی، اسے بھی حق حاصل تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرے یا ہندوستان کے ساتھ یا وہ خودمختار بھی رہ سکتی تھی مگر عملاً یوں ہوا کہ تمام ریاستیں ہر دو ممالک کے ساتھ الحاق پر مجبور تھیں کیونکہ ان کی علیحدگی کے امکانات کم تھے۔ جموں و کشمیر کی ریاست کی 80 فیصد آبادی مسلمان تھی۔ ریاست کے باشندے اور پاکستانی باشندے نسلاً ایک تھے۔ اس کی سرحد کئی میل پاکستان کے ساتھ مشترک ہے، ان کی تہذیب وتمدن ایک ہے، ان کی معاشی زندگی کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے جموں و کشمیر پاکستان ہی کا حصہ ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کے ساتھ مل کر پنجاب میں سے کشمیر تک پہنچنے کا ایک ایسا راستہ تلاش کیا کہ اس معاملے میں وہ مسلم اکثریت کے علاقے ہندوستان کے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے بھارت کی کشمیر پر قبضہ کی راہ ہموار کرنے کے لئے ریڈکلف ایوارڈ میں بنیادی ردوبدل یہ کیا کہ بٹالہ، گورداسپور اور اجنالہ کی مسلم اکثریت کی تحصیلیں ہندوستان کے حوالے کر دیں یہ صریحاً دھاندلی اور دریدہ دہنی تھی۔

کشمیر کی ابتدائی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو بات یوں سامنے آتی ہے کہ انگریزوں نے سکھوں کی پنجاب حکومت کے خاتمے پر ان پر تاوان جنگ عائد کیا۔ لاہور کی سکھ حکومت مطلوبہ رقم ادا نہ کر سکی چنانچہ انگریزوں نے جموں و کشمیر کا سکھ علاقہ گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاں

فروخت کر کے لاکھ روپے کی رقم وصول کر لی۔ یہ کشمیری عوام کے ساتھ انگریزوں کی پہلی زیادتی تھی۔ یہ راجہ ظالم اور جابر تھا، اس نے کشمیری عوام پر جبر واستبداد سے حکومت کی اور ان کو بیگاری ومزدور بنا کر ہی رکھا۔ کشمیری مسلمان راجہ کے اس ظالمانہ طرز عمل کے خلاف متعدد بغاوتیں کرتے رہے۔

ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تو ہندو راجہ کے مظالم کے پیش نظر یہ لازمی امر تھا کہ کشمیری مسلمان پاکستان کے ساتھ شامل ہوں گے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے اگست 1947ء میں پاکستان کے ساتھ حالت موجودہ کو برقرار رکھنے کا معاہدہ کر لیا۔ ادھر شمالی پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا اور اس سازش میں مہاراجہ کشمیر بھی شریک تھا۔ مسلح ہندوؤں اور سکھوں نے جموں و کشمیر کے مسلمانوں پر حملے شروع کر رکھے تھے۔ پونچھ کے مسلمانوں نے مجبور ہو کر راجہ کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے اور جموں وکشمیر کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ یہ شکستہ دل اور بدحال مسلمانوں کے قافلے پاکستان کے سرحدی علاقوں کے قریب پہنچے تو ان میں کشمیری بھائیوں پر مظالم سے جوش وخروش پیدا ہوا تو وہ کشمیری مسلمانوں کی امداد کے لئے سر بکف ہو کر نکل پڑے۔ آزادی کی اس جنگ میں مجاہدین کا پلڑا بھاری تھا۔ مہاراجہ اور اس کی سینا بھاگ چکی تھی۔ ان حالات میں جبکہ مجاہدین جموں کے گردونواح میں پہنچ چکے تھے، مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کی درخواست کر دی۔ اس پر ہندوستان نے راجہ کی درخواست پر اپنی فوجیں ہندوستان میں داخل کر دیں۔ بھارت نے الحاق کی درخواست اس شرط پر منظور کی کہ اس کا قطعی فیصلہ کشمیری عوام کی رائے سے ہوگا۔

بھارت کے اس جارحانہ اقدام سے پاکستانی عوام میں اشتعال پھیل گیا۔ صورتحال ایسی تھی کہ پاکستان بھارت کے اس اقدام کے خلاف جنگی کارروائی کرتا تو وہ اس میں بالکل حق بجانب تھا مگر قائداعظم نے کشمیر کا مسئلہ امن و آشتی کے ساتھ حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ہندوستان نے یہ شرط لگائی کہ قبائلی لشکر کشمیر سے چلا جائے اور امن وامان کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستان کشمیر سے اپنی فوجیں واپس بلا لے گا۔ پنڈت نہرو نے یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں مشترکہ طور پر اقوام متحدہ کو درخواست کریں کہ وہ جلد از جلد

کشمیر میں رائے شماری کرادے۔ تاہم یہ دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے قدم اٹھایا گیا۔ ہندوستان کی اصل نیت جموں وکشمیر کو ہڑپ کرنے کی تھی اور وہ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لئے ٹال مٹول سے کام لے کر اپنے عزائم کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیاقت علی خان نے نومبر 1947ء کو بحیثیت وزیراعظم پاکستان اقوام متحدہ کو کشمیر میں مسلمانوں پر ہندوستان کے مظالم بند کرانے کے لئے کہا۔ انہوں نے اس عالمی ادارے کو غیر ملکی فوجوں کی واپسی کا اہتمام کرنے کو بھی کہا اور استصواب کروانے کے لئے غیر جانبدار حکومت کے قیام پر زور دیا۔ ہندوستان کی حکومت کو کہا گیا تو اس نے شیخ عبداللہ کو دہلی بلایا اور شیخ صاحب نے مہاراجہ کے مظالم کی داستان کو دہرایا اور پنڈت نہرو کو عوام پر اعتماد کرنے اور ریاست میں ذمہ دار حکومت کے قیام کا مشورہ دیا۔ ادھر یہ مذاکرات جاری تھے کہ کشمیر کے آزاد کردہ علاقے میں آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا جس کا سربراہ سردار محمد ابراہیم کو نامزد کیا گیا۔ پلندری صدر مقام قرار پایا۔ سردار محمد ابراہیم نے شیخ عبداللہ سے تعاون کی اپیل کی مگر پنڈت نہرو اسے دوسری جانب کھینچ رہے تھے۔ ان نازک حالات میں 17 اکتوبر 1947ء کو کشمیر کا نئی دہلی سے الحاق کا اعلان کر دیا گیا۔ اس وقت ماؤنٹ بیٹن بھارت کا گورنر جنرل تھا۔ اس نے فوراً الحاق کی توثیق کر کے فوجوں کو ریاست میں بھیج دیا۔ مجاہدین مقابلے پر آئے تو ہندوستان نے پاکستان کو جارح قرار دے کر اقوام متحدہ کو ثالثی کی تجویز پیش کر دی جسے پاکستان نے منظور کر لیا اور بعد ازاں بھارت اس سے بھی منحرف ہو گیا۔ وہ آج تک کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کئے ہوئے ہے۔

## لیاقت علی خان کا قاتل کون تھا؟

لیاقت علی خان 16 اکتوبر 1951ء کو جلسہ عام سے خطاب کرنے کی غرض سے راولپنڈی پہنچے۔ یہ تقریر بڑی اہم تھی لیکن 4 بجے کے قریب جب وہ کمپنی باغ، جو اب لیاقت باغ کہلاتا ہے تقریر کرنے کیلئے کھڑے ہوئے تو ابھی ان کی زبان سے صرف ''برادران اسلام'' ہی نکلا تھا کہ سید اکبر نامی ایک شخص نے جو ڈائس سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا ان پر گولی چلا دی۔ لیاقت علی خان نے پہلے کلمہ پڑھا پھر کہا گولی لگ گئی ہے، پھر دوبارہ کلمہ طیبہ

پڑھا اور کہا ''خدا پاکستان کی حفاظت کرے''۔ اس کے بعد بیہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں انہوں نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد جلسے میں بھگدڑ مچ گئی اور پولیس نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق قاتل پر حملہ کر کے اسے جان سے مار دیا تا کہ قتل کے ثبوت مٹ جائیں۔ پولیس اہلکاروں نے موقع پر موجود ایک ایس پی کے کہنے پر قاتل اکبر کو گولی ماری تھی۔

لیاقت علی خان کے قاتل کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا واقعہ قتل کی عدالتی تحقیقات کسی نتیجے پر نہ پہنچی۔ اعتزاز الدین جو تحقیقاتی افسر تھے اور انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے، وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی طلبی پر کراچی جا رہے تھے کہ طیارے کو جہلم کے قریب آگ لگ گئی جس کے سبب افسر تحقیقات اور مقدمہ قتل کے اہم کاغذات نذر آتش ہو گئے۔ فروری 1958ء میں معلوم ہوا کہ پولیس کی تفتیشی کارروائیوں کی فائل بھی ریکارڈ سے غائب ہے۔

قاتل کی ایک گولی نے سماں بدل دیا تھا۔ پاکستانی حکام نے قاتل سید اکبر نامی شخص کو ایک افغان شہری قرار دیا۔ افغان حکومت کے ترجمان نے فوراً ہی پرزور دعویٰ کیا کہ اکبر کو اس کی قوم دشمن سرگرمیوں کی بنا پر افغان شہریت سے محروم کیا جا چکا ہے اور یہ کہ انگریز حکام نے انہیں صوبہ سرحد میں پناہ دے رکھی تھی۔ جلد ہی یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ انگریزوں نے اس کا جو وظیفہ مقرر کیا تھا وہ پاکستانی حکومت بھی ادا کرتی رہی تھی۔ روزنامہ ''نیو یارک ٹائمز'' میں ایک ایسوسی ایٹڈ رپورٹ ''حکومت کا وظیفہ خوار پاکستانی قاتل'' کے عنوان سے یوں شائع ہوئی۔

پاکستانی حکام نے آج یہ انکشاف کیا کہ سید اکبر نامی وہ افغان شہری جس نے گزشتہ ہفتے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو قتل کیا تھا وہ حکومت پاکستان سے 450 روپے (155 ڈالر) کا ماہانہ الاؤنس حاصل کرتا تھا۔

اس افسر کا کہنا ہے کہ قاتل کا بھائی مزدک خان بھی حکومت سے 224 ڈالر ماہانہ الاؤنس حاصل کرتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے 1946ء میں افغانستان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر 1946ء میں اس وقت کے غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ سرحد میں چلے آئے تھے۔ یہاں کے سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ برطانوی حکومت نے بعض خفیہ امور کے

لئے ان کے وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ سلامتی کے اسباب کے پیش نظر ان خفیہ امور کو ظاہر نہیں کیا گیا۔

کیا اکبر حکومت پاکستان کا تنخواہ دار خفیہ کا کارندہ تھا؟ لگتا ہے کہ راولپنڈی میں اس کی موجودگی کا مقامی پولیس کو علم تھا اس تاریخ ساز دن وہ اگلی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔۔۔ یہ جگہ عام طور پر سادہ کپڑوں میں ملبوس خفیہ پولیس اہلکاروں کے لئے مخصوص ہوا کرتی ہے۔ جب اس نے دو گولیا چلائیں تو اس کے فوراً بعد پاس بیٹھے افراد اس پر جھپٹ پڑے اور ''نیویارک ٹائمز'' کی رپورٹ کے مطابق انہوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس پر گولیاں بھی چلائی گئیں اور ان میں سے کم از کم ایک گولی ایک پولیس افسر نے چلائی تھی جس نے بعد ازاں یہ شہادت دی کہ گولی چلانے کا حکم ایک اعلیٰ افسر نے دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مرے ہوئے تو اپنی کتھا نہیں سنایا کرتے۔

کیا قاتل ایک جنونی تھا؟ یا وہ ایک سازش کا کردار تھا؟ یا وہ ان سازشیوں کا محض ایک کارندہ تھا جنہوں نے اپنا دامن بچانے کے لئے اسے بھی موقع پر ہی ٹھکانے لگا دیا؟ اگر کوئی سازشی سرگرم تھے تو کیا وہ اپنے نجی یا سیاسی عزائم رکھتے تھے یا اپنے مفادات رکھنے والے کسی بیرونی ملک نے انہیں اپنے مفادات کی خاطر براہ راست یا بلواسطہ طور پر اس قتل کی ترغیب دی تھی؟ قتل سے فوری پہلے کے مہینوں اور ہفتوں کے دوران ایسی کون سی بات ہوئی تھی جس نے مقتول کے دشمنوں کو جو اپنے طور پر یا بیرونی عناصر کے ساتھ مل کر سرگرم تھے یہ طے کرنے پر اکسایا کہ وار کرنے کا وقت آ گیا ہے؟ کیس سازشی مسلمہ سیاسی دشمن تھے یا وہ مقتول کے اپنے سیاسی گروہ سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ رتبوں پر فائز افراد تھے۔۔۔۔۔۔ یعنی ایسے افراد جو مقتول کے خاتمے کے بعد خود اپنی ترقی حاصل کرنے کی توقع رکھتے تھے جسے وہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ قتل کے لئے جو دن منتخب کیا گیا تھا آیا وہ کسی خاص پاکستانی یا غیر ملکی عناصر کے لئے کوئی خاص اہمیت رکھتا تھا؟ کیا لیاقت علی خان کوئی ایسا بڑا قدم اٹھانے والے تھے جو بعض پاکستانی یا بیرونی عناصر کو ناگوار تھا؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے پاکستان میں اقتدار سنبھالا انہوں نے فوراً ہی کسی غیر ملکی قوت کے ساتھ ایسی شرائط پر خفیہ رابطے استوار کئے جو اس مقتول لیڈر کی شرائط سے بہت مختلف تھیں۔

جب کوئی اہم شخصیت اور خصوصاً کوئی صاحب اقتدار شخص اس طرح قتل ہو جاتا ہے تو اس قسم کے سوالات لازماً اٹھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر امریکہ کے صدر جان ایف کینیڈی کے قتل کے بعد بھی ایسے ہی سوالات کا چرچا ہوا تھا۔ امریکہ کے ایوان نمائندگان کی ایک خصوصی کمیٹی نے چند سال پہلے خصوصی سماعت کی تھی جس میں ایسے سوالات کی گہری چھان بین کی گئی تھی۔ امریکہ میں عمومی تاثر یہ تھا کہ ہر اس پہلو کا گہرا تجزیہ جو صدر کے قتل کے المناک واقعہ پر امکانی طور پر روشنی ڈال سکے نہ صرف جواز کا حامل ہے بلکہ ناگزیر بھی ہے۔ جو لوگ امریکہ میں اس قسم کے تصور کی تائید کرتے تھے انہیں منطقی طور پر تسلیم کرنا چاہیے کہ لیاقت علی خان کے قتل کے معاملے میں بھی ایسا ہی طرز عمل درست ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک یا ایک سے زیادہ بیرونی ممالک کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مفادات کی خاطر پاکستان کے امور میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں تو پھر لیاقت علی کے فوراً پہلے اور بعد میں ان کے رویوں کا اس قدر احتیاط سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے جس قدر احتیاط سے اس شہادت کا، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ قاتل "اکیلا" ہی تھا یا اگر کوئی سازش تھی بھی تو وہ صرف پاکستانی تھی۔

اکتوبر 1951ء کے اس المناک دن کے بعد سے خود پاکستانی حکام نے ان سوالات کا تلاش کرنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے؟ لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیقات کا اہتمام کرنے کا ان برسوں پر مشتمل ریکارڈ کچھ زیادہ اعتماد پیدا نہیں کرتا۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے بعد جسٹس محمد منیر کی سرکردگی میں ایک انکوائری کمیشن بنایا گیا جس نے کئی گواہوں کا بیان لیا تھا۔ بالآخر یہ اعلان کیا گیا کہ اس کمیشن کو کسی سازش کی کوئی شہادت نہیں ملی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ قاتل نے خود ہی اپنے طور پر یہ قتل کیا ہے۔ کمیشن کی مرتب کردہ دستاویزات اور اس رپورٹ کو شائع نہیں کیا گیا تھا۔ 1953ء کے اوائل میں وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے بیان کیا تھا کہ اس مقدمے سے متعلقہ بہت سی اہم دستاویزات ایک فضائی حادثے میں ضائع ہو گئی تھیں اور اس کیس کی تفتیش کرنے والا ایک اعلیٰ پولیس افسر بھی اس حادثے کی نذر ہو گیا تھا۔ ایک سال بعد وزیراعظم کی حیثیت سے خواجہ ناظم الدین کی جگہ لینے والے صاحب محمد علی بوگرہ نے اعلان کیا کہ برطانیہ کی سکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک اعلیٰ افسر کی خدمات تفتیش کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے حاصل کی جا رہی ہیں۔ بعد ازاں بیان کیا گیا کہ اس کی تحقیق کا نتیجہ بھی یہی

ہے کہ قتل فرد واحد کا قدم تھا اور یہ کہ دستیاب شہادتوں سے کسی سازش کے وجود کی طرف اشارہ نہیں ملتا اس درآمد شدہ شرلاک ہومز کی رپورٹ بھی عوام کے لئے ریلیز نہیں کی گئی تھی۔ بعد کی کسی حکومت نے بھی اس کیس کو دوبارہ شروع کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ حالانکہ بیگم لیاقت علی خان بار بار یہ کہتی رہی ہیں کہ اس بات کا اطمینان نہیں کہ حکام نے ان کے شوہر کے قتل کی گہری چھان بین کی ہے۔ اس صورت حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر حکومت یہی مناسب سمجھتی رہی ہے کہ اس معاملے کو ٹھپ ہی رکھا جائے۔

صرف ایوب خان نے 1967ء میں شائع ہونے والی اپنی یادداشتوں میں ان افواہوں کا حوالہ دیا تھا کہ کابینہ کے بعض اور اعلیٰ رتبے کے بعض افراد نے قتل کی سازش کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایوب خان نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ان افواہوں پر یقین نہیں رکھتے اور یہ کہ اگر بعض لوگ ایسی سازش میں ملوث ہوتے تو وہ بعد میں بے نقاب ہونے سے نہیں بچ سکتے تھے۔ ایوب خان نے اس مسئلے کو نہیں چھیڑا تھا کہ آیا اس معاملے میں کوئی غیر ملکی ہاتھ تھا یا قتل کے محرکات کے بارے میں ان کے اپنے بھی کوئی خیالات تھے۔

برطانیہ کی حکومت اور خفیہ اداروں میں ایسے عناصر موجود تھے جن کی مسلم لیگ اور پاکستان میں روایتی دلچسپی ایران کی صورت حال کے سبب بڑھ گئی تھی۔ اس معاملے میں برطانیہ کا ہاتھ ہونے کا امکان اس لئے بھی پیدا ہوتا ہے کہ قاتل انگریزوں کا سابق خفیہ کارندہ تھا۔ 1961ء میں شائع ہونے والی پاکستان کی ایک تاریخ میں دو سوویت سکالروں دی گینکووسکی اور ایل آر گورڈن پولونسکیا نے دعویٰ کیا ہے کہ انکوائری کمیشن کی تفتیش کے دوران اخباروں میں ادھر اُدھر سے جو باتیں شائع ہوتی رہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس کا کوئی نہ کوئی ہاتھ ضرور شامل تھا۔ اب اگرچہ سوویت سکالروں کے خیال میں برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس مل جل کر کام کر رہی تھیں۔ تاہم ایک بھارتی مبصر جمنا داس اختر کا دعویٰ ہے کہ "برطانوی ڈپلومیسی" پاکستان پر اپنا قابو برقرار رکھنے کی خواہاں تھی اور اسے لیاقت علی خان کے امریکہ نواز میلانات پر بدگمانی تھی۔ جمنا داس اختر کا کہنا ہے کہ "کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ قاتل انگریزوں اور پاکستان میں ان کے طفیلیوں کا بھاڑے کا جاسوس تھا"۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ لیاقت علی خان نے امریکہ کو ناراض کیا تھا۔

## نیا حکمران ٹولہ

لیاقت علی خان کی وفات کے فوراً بعد کون لوگ پاکستان میں برسر اقتدار آئے؟ ان کے نظریات کیا تھے؟ کس سمت میں وہ پاکستان کو لے جانا چاہتے تھے؟ امریکہ پاکستان کو کس سمت میں لے جانا چاہتا تھا؟ یہ وہ متعلقہ سوالات ہیں جن کا اس موقع پر جائزہ لینا چاہیے۔

گورنر جنرل کے طور پر غلام محمد حکومت کے "مرد آہن" تھے تو قوت کے نئے ڈھانچے میں سیکرٹری دفاع سکندر مرزا، فوج کے سربراہ ایوب خان، وزیر خارجہ ظفر اللہ خان، سیکرٹری خارجہ محمد اکرام اللہ اور سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی ان کے قریبی ساتھی محسوس ہوتے ہیں۔

نئی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ لیاقت علی خان کی پالیسیوں کو جاری رکھے گی۔ تاہم اگر غلام محمد کو لیاقت علی خان کی موت کا دکھ تھا بھی تو وہ ان سے ملنے والوں پر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ بلاشبہ گورنر جنرل کو اہم کام درپیش تھے۔ ان کے پاس اس بارے میں پکے خیالات موجود تھے کہ پاکستان پر کیسے حکومت کی جانی چاہیے۔ ان کے خیال میں پارلیمانی نظام پاکستان کی ضرورتوں کے مطابق نہ تھا وہ اس قسم کے اقتدار کو پسند کرتے تھے جو قائداعظم نے گورنر جنرل کے طور پر استعمال کیا تھا بعد ازاں غلام محمد نے رشبروک ولیمز کو بتایا تھا کہ پاکستان کو سربراہ مملکت کی جانب سے اوپر سے ایسی مضبوط قیادت کی ضرورت ہے جو تمام جماعتی رشتوں اور قربتوں سے آزاد ہونے کے سبب قومی مفادات کے سوا ہر شے کو نظر انداز کر سکے۔

پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان وزیر اعظم کے قتل کے وقت لندن کے ایک ہسپتال میں تھے۔ جب وہ کراچی واپس پہنچے تو انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ کئی برسوں کے بعد انہوں نے اس مشاہدے کو یاد کرتے ہوئے لکھا کہ واپسی پر جب وہ نئی کابینہ کے ارکان سے ملے تو "ان میں سے کسی نے بھی لیاقت علی خان کا نام تک نہ لیا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے ہمدردی یا افسوس کا ایک لفظ تک کہا" ایوب خان مزید لکھتے ہیں:

گورنر جنرل غلام محمد بھی اس واقعہ سے بے خبر دکھائی دیتے تھے حالانکہ ایک قاتل کے گھناؤنے فعل نے پاکستان سے ایک ممتاز وزیر اعظم کو چھین لیا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ لوگ

کس قدر سنگ دل سرد مہر اور خود غرض ہو سکتے ہیں ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طریقے سے ترقی دلا لی تھی۔ وزیر اعظم کا خاتمہ ان کے لئے ایک نئے کیریئر کا آغاز ثابت ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ مجھے یہ واضح احساس ہوا کہ وہ اس بات پر مطمئن تھے کہ وہ شخص منظر سے غائب ہو گیا ہے جو انہیں قابو میں رکھ سکتا تھا۔

اگرچہ یہ جنرل جس کے مقدر میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، بغاوت کا سرغنہ، فیلڈ مارشل اور صدر مملکت ہونا لکھا تھا، اس ساری صورت حال کو "نفرت انگیز اور کراہت انگیز" محسوس کرتا تھا اس کے باوجود اس نے اپنی رائے کو اپنے تک محدود رکھا اور اس کے ابلاغ سے اجتناب کیا۔ دراصل وہ اپنی پوزیشن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ پہلا پاکستانی کمانڈر انچیف بن چکا تھا۔ حالانکہ فوج میں اس سے سینئر افسر موجود تھے اور اس نے کشمیر کی لڑائی میں حصہ بھی نہ لیا تھا۔ اگرچہ لیاقت علی خان نے ایوب خان کو اس اعلیٰ عہدے کے لئے چنا تھا لیکن لگتا تھا کہ انہیں غلام محمد کے ٹولے اور خصوصاً سیکرٹری دفاع سکندر مرزا کی خاص حمایت حاصل تھی۔ ایوب خان مرزا کے دوست اور زیر حمایت تھے۔ سکندر مرزا اپنی میکاؤلی جیسی صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے اور اس حوالے سے لوگ ان سے خوف بھی محسوس کرتے تھے۔ صوبہ سرحد میں انہوں پولیٹیکل افسر کی حیثیت سے انگریزوں کی برس ہا برس تک خدمات انجام دی تھیں۔ دوستوں کے حلقے میں مرزا نے پارلیمانی جمہوریت کے لئے اپنی نفرت کو کبھی چھپانے کی زیادہ کوشش نہ کی تھی وہ خصوصاً "محدود جمہوریت" کے حامی تھے اور غالباً یہ بھی سمجھتے تھے کہ وقت آنے پر وہ خود اقتدار سنبھال سکیں گے۔

بعد کر برسوں میں ایوب خان نے اپنی جرأت اور سچ بولنے کے حوالے سے، بہت سی ڈینگیں ماری تھیں۔ لیکن اس زمانے میں انہوں نے بھی لیاقت علی خان کے مقدر کے بارے میں زبان بند رکھنے اور اپنے پرانے دوست سکندر مرزا اور ان کے نئے آقا غلام محمد کی خدمات بجالانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیاقت علی خان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جنرل ایوب کو موثر روحانی وسیلے۔۔۔ آغا خان۔۔۔۔۔ کی طرف سے پیغام ملا تھا۔ اُن ایام میں آغا خان نائیس کے قریب سمندر کنارے اپنے پر تکلف محل میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے ایوب خان تک اپنی روحانی دانش ان لفظوں میں منتقل کی تھی کہ اگر پاکستان نے پارلیمانی نظام کی راہ پر چلنے کی کوشش

کی تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔ ''میں نے تمہیں یہاں یہ بتانے کے لئے بلایا ہے کہ اس طریقے سے تم ہی ایسے شخص ہو جو اسے بچا سکتے ہو''۔

جنرل صاحب بظاہر اس مذہبی رہنما کے نامناسب جنتر منتر سے متنفر نہ ہوئے۔ آغا خان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''اس نظام کو تبدیل کرنا ہی ہے، ایسا کوئی نظام بنانا ضروری ہے جو تمہاری تاریخ، تمہاری روایات اور تمہارے طرز فکر کے مطابق ہو اور حقیقتاً تم ہی ایسا کر سکتے ہو''۔ جنرل صاحب نے صرف یہی جواب دیا کہ ''ہاں آغا میں سمجھتا ہوں''

گویا تینوں صاحبان جن کا ہم نے حوالہ دیا ہے یعنی غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان لیاقت علی خان کے قتل سے پہلے پاکستان میں اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

## پاک بھارت تعلقات اور تصفیہ طلب 8 مسائل کا ایک جائزہ

چند برس پہلے لاہور کے سرحدی علاقے واہگہ میں زمینوں کی قیمتوں میں اضافے اور اہم اداروں اور شخصیات کی طرف سے زمینیں خریدنے کے بڑھتے ہوئے رجحان سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جلد ہی دوستی اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہونے والی ہے جس کی وجہ سے سرحدوں پر آمدورفت بڑھ جائے گی اور مختلف کاروبار شروع ہو جائیں گے۔ کیونکہ متعدد سرکاری محکموں نے بھی بارڈر کے ساتھ ساتھ اراضی خریدنی شروع کر دی تھی۔ اور یوں کچھ عرصہ پہلے تک ہزاروں میں ملنے والی زمین لاکھوں میں پہنچ گئی اور لاکھوں والی کروڑوں روپے تک جا پہنچی۔ اسی طرح سیالکوٹ سے کنٹرول لائن کے سرحدی گاؤں سچیت گڑھ جانے والی سڑک پر بھی سیالکوٹ شہر سے تعلق رکھنے والے ایک سابق آرمی چیف کے خاندان کے قریبی لوگوں نے موضع ڈالووالی سے آگے کئی ایکڑ زمین خرید رکھی ہے، جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر حل ہونے والا ہے اور سیالکوٹ۔ جموں ٹرین پھر سے شروع ہو جائے گی جو تقسیم کے وقت سے بند ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب نواز شریف کے دوسرے دور حکومت میں اس وقت کے بھارتی وزیراعظم نے لاہور دہلی بس سروس کے ذریعے لاہور کا دورہ کیا تھا۔

پاک بھارت تعلقات کے نشیب و فراز کی کہانی اتنی پرانی ہے جتنا کہ خود ان ممالک کا وجود۔ دونوں طرف کی حکومتوں نے کسی سیاسی یا اقتصادی مصلحت اور کبھی اندرونی و بیرونی دباؤ کے تحت ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن یہ قربت ہمیشہ عارضی ثابت ہوئی۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان بہت سے تنازعات تصفیہ طلب ہیں۔ اگرچہ ان مسائل پر دونوں ممالک کے درمیان کئی بار مذاکرات بھی ہو چکے ہیں تاہم یہ مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔ جون 1997 میں پاکستان اور بھارت کے اعلیٰ حکام نے اتفاق رائے سے جن آٹھ اہم مسائل کی نشاندہی کی تھی اور جن کو مشترکہ طور پر حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ قرار دیا گیا تھا کہ اگر یہ مسائل حل ہو جائیں تو پاکستان اور بھارت کے مابین ہمسائیوں جیسے تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ ایک ایسا ہمسایہ جو دوسرے کو اپنے جیسا ہی سمجھتا ہو۔

اگرچہ چھوٹے بڑے دیگر مسائل بھی ہیں مگر سب سے زیادہ اہمیت کے حامل اور حساس مسائل یہی آٹھ ہیں۔ پاکستان کا موقف یہ ہے کہ کشمیر سمیت تمام مسائل پر ایک ساتھ بات ہونی چاہیے کیونکہ دیگر تمام مسائل کی بنیاد کشمیر کا تنازعہ ہے۔ اگر مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کر لیا جائے تو دیگر مسائل کا حل تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ جبکہ بھارت کا کہنا ہے کہ کشمیر کے علاوہ دیگر مسائل پر بھی گفتگو ساتھ ساتھ ہونی چاہیے اور دیگر امور پر پیش رفت کو کشمیر میں کشیدگی کی وجہ سے نہیں روکا جا سکتا۔

بھارت کا اصرار ہے کہ ریاست کشمیر ہمارا حصہ ہے اور پاکستان کا اصرار ہے کہ کشمیر ہمارا حصہ ہے۔ اس پر اب تک تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ جبکہ وہاں کے عوام کی جدوجہد مسلسل جاری ہے۔ 1948 کے آغاز میں ہی یہ مسئلہ عالمی برادری کی نظر میں آ چکا تھا۔ چنانچہ اس وقت کے بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کشمیری عوام کی رائے جاننے کے لیے اقوام متحدہ میں کشمیر میں ریفرنڈم کرانے کا وعدہ کر لیا یعنی کہ اگر عوام کی اکثریت پاکستان میں شامل ہونا چاہے گی تو کشمیر پاکستان کا حصہ اور اگر عوام کی اکثریت نے بھارت میں شامل ہونے کیلئے ووٹ ڈالا تو کشمیر بھارت کا حصہ ہو گا۔ بھارت کے اس جمہوری طریقہ کار کے مطابق اور اخلاقی طور سے مناسب فیصلے کو ساری عالمی برادری نے سراہا مگر دوسری طرف بھارت نے ریفرنڈم کرانے کی بجائے کشمیر کو آئینی طور پر اپنا حصہ قرار دے دیا۔ اس کے بعد دونوں ریاستیں ایک

دوسرے کی جانی دشمن بن گئی۔ جس کی وجہ سے دیگر تصفیہ طلب مسائل بھی پیدا ہوتے چلے گئے۔ مفاد پرست طاقتیں بھارت اور پاکستان میں مفاہمت کرانے کی بجائے مزید ہوا دیتی رہیں۔ چنانچہ اب تک پاکستان کہتا رہا ہے کہ کشمیری عوام ہندوستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے جبکہ ہندوستان کا کہنا ہے کہ 1987 تک کشمیری ہندوستان کے آئین کے مطابق اس کے زیر انتظام علاقے میں ہونیوالے عام انتخابات میں حصہ لیتے رہے ہیں اور اب کشمیر بھارت کا حصہ ہے۔ 1987 میں بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں ہونیوالے انتخابات میں اس وقت کی بھارتی حکومت کے ایما پر کافی بدعنوانیاں ہوئی تھیں جس کو ناانصافی سمجھتے ہوئے کشمیر کے عوام نے بھارت کے خلاف اپنے حق کے حصول کی خاطر جاری جنگ آزادی کو تیز کر دیا۔ جس کو ہمیشہ کی طرح قابض حکمرانوں کی طرف سے حریت پسندوں کی آزادی کی جدوجہد کو بغاوت قرار دیا گیا۔ جیسا کہ ہندوستان میں انگریز حکمرانوں سے آزادی کی جنگ لڑنے والے حریت پسندوں کو باغی قرار دیا گیا تھا۔ اس بارے میں بھارت کا کہنا ہے کہ یہ شدت پسندی پاکستان کی شہ پر جاری ہے جبکہ پاکستان کا کہنا ہے، وہ کشمیریوں کی صرف سیاسی، اخلاقی اور سفارتی سطح پر حمایت کرتا ہے۔

دوسرا مسئلہ پاکستان اور بھارت میں جونا گڑھ کا تنازعہ بھی موجود رہا ہے جہاں کی سمندری حدود پر متعدد بار گفتگو ہو چکی ہے جبکہ تیسرے نمبر پر انتہائی اہمیت کے علاقے سر کریک کا مسئلہ بھی موجود ہے۔ ہندوستانی ریاست گجرات اور پاکستانی صوبے سندھ کے علاقے میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین بین الاقوامی سرحد کے تعین پر بھی اتفاق ہونا باقی ہے۔ یہ بھی 1947 سے التوا میں چلا آرہا ہے۔ یہ علاقہ سر کریک کا علاقہ کہلاتا ہے۔ ساٹھ سے سو کلومیٹر کے اس علاقے میں بہت سی کریک یعنی خلیج اور دریاؤں کے دہانے ہیں۔ اس علاقے کا تنازعہ 1960 کی دہائی میں سامنے آیا تھا جس پر 1968 میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک ویسٹرن باؤنڈری ٹرائبیونل ایوارڈ قائم کیا گیا۔ لیکن یہ طے نہیں ہو سکا کہ سر کریک کے علاقے میں بین الاقوامی سرحد کا تعین کس قانونی بنیاد پر کیا جائے۔ اس علاقے کا کچھ حصہ آبی ہے اور کچھ حصہ خشک۔ پاکستان اور بھارت کے مابین کئی دفعہ اس مسئلہ پر مذاکرات ہو چکے ہیں لیکن اس پر بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ بھارت کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں سرحد

کے تعین کے لئے بین الاقوامی قانون کا وہ اصول استعمال کیا جائے جو سمندر کے اندر سرحد کے تعین کے لئے بنایا گیا ہے۔ جبکہ پاکستان کا کہنا ہے کہ یہ اصول صرف پانی والے علاقے پر عائد ہوتا ہے لیکن یہاں پانی اور خشکی دونوں موجود ہیں لہذا بھارت کا استدلال غلط ہے۔ دونوں ممالک کی اس علاقے میں دلچسپی یہاں پر ماہی گیری کی وسیع صنعت اور تیل کے وافر ذخائر کی وجہ سے ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان اختلاف اس بات پر ہے کہ آخر سرحد کس جگہ پر قائم کی جائے۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ سر کریک کا پورا علاقہ اسکا اپنا ہے۔ لیکن ہندوستان اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ سر کریک کے علاقے میں سرحدی برجیاں لگانے کے لیے دونوں ممالک نے گزشتہ برس ایک مشترکہ سروے بھی کیا تھا جس کو مقررہ وقت سے پہلے ہی مکمل کرلیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی مسئلہ جوں کا توں باقی رہا۔

چوتھا اہم مسئلہ وولر پروجیکٹ کا ہے جو بھارت دریائے جہلم پر کشمیر میں وولر پروجیکٹ کے نام سے ایک ڈیم بنا رہا ہے۔ جس کی پاکستان شروع سے ہی مخالفت کرتا رہا ہے۔ بھارت کا یہ کہنا ہے کہ یہ پروجیکٹ پانی سے بجلی پیدا کرنے کے لئے تعمیر کیا جارہا ہے اور اس کا پانی دیگر ذرائع کیلئے بھی استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ پاکستان کو خدشہ ہے کہ گرمی کے موسم میں دریائے جہلم میں پانی کی کمی واقع ہوسکتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے ہاں پانی کے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں کیونکہ پاکستان کو پہلے ہی پانی کی کمی کا سامنا ہے۔ جبکہ اندرون ملک بھی پانی کے ذخائر بنانے پر اختلافات موجود ہیں۔ دریائے جہلم بھارت کے زیرانتظام کشمیر سے شروع ہوکر پاکستان میں ختم ہوتا ہے۔ جبکہ بھارت وولر پراجیکٹ کی طرح ایک دوسرا پراجیکٹ دریائے چناب پر تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ جسکو پانچواں مسئلہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ دریا بھی ہندوستان کے زیرانتظام کشمیر سے شروع ہوتا ہے اور پاکستان کے دریائے سندھ میں شامل ہوکر سمندر میں گرتا ہے۔ پاکستان کو خدشہ ہے کہ اس دریا پر ہندوستانی پراجیکٹ کی وجہ سے پاکستان میں پانی کی کمی ہوسکتی ہے۔ اسے سلال ڈیم کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ان دونوں منصوبوں پر دونوں ملکوں کا اتفاق ہونا باقی ہے۔ پاکستان کو یہ بھی خطرہ ہے کہ ہندوستان ان منصوبوں کو مستقبل میں سفارتی سطح پر برتری حاصل کرنے کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔

پانی کے حوالے سے پاک بھارت میں مسائل بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ

ان کی اہمیت بھارت کی نزدیک زیادہ نہ ہو مگر پاکستان کیلئے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ پاکستان کو جن دریاؤں سے پانی ملتا ہے ان میں سے اکثریت بھارت کی زیر انتظام کشمیر سے نکلتی ہے اور اگر بھارت ان پر ڈیم بنا لے، جیسا کہ ستلج اور راوی پر بنائے ہوئے ہیں اور پاکستان ان دریاؤں کے پانی سے محروم ہو چکا ہے۔ اب پاکستان کو دیگر دریاؤں کے پانی سے بھی محروم ہونے کا خدشہ ہے جبکہ بھارت کے پاس کئی دیگر دریا بھی بہہ رہے ہیں۔

چھٹا مسئلہ تجارتی تعلقات کا ہے۔ اب پاکستان اور بھارت ڈبلیو ٹی او کے ممبر ہیں جو ایک آزاد تجارتی معاہدہ ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم یعنی ڈبلیو ٹی او کے قوانین کے تحت وقت کے ساتھ ساتھ اس تنظیم میں شامل تمام رکن ممالک کے لیے لازمی ہے کہ دنیا میں آزاد تجارت قائم کرنے کے لئے ایک دوسرے کو ایم ایف این یعنی خصوصی مراعات یافتہ قوم کا درجہ دیں۔ ایم ایف این کا درجہ جس ملک کو دیا جاتا ہے وہاں سے اشیاء کی درآمد اور برآمد میں تاجروں کے لئے آسانی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں بات چیت تو جاری رہتی ہے مگر ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

ایک ساتواں دیگر مسئلہ جو ابھی چند سال سے ہی پیدا ہوا ہے وہ ہے گیس پائپ لائن منصوبہ۔ پاکستان اور ایران نے 1995 میں ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے جس کے تحت ایران سے کراچی تک ایک گیس پائپ لائن بچھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ پاکستان کو ایران کی قدرتی گیس ترسیل کی جا سکے۔ بعد میں ایران نے یہ مشورہ دیا کہ اس گیس پائپ لائن کو بھارت تک لے جایا جائے تاکہ ایران سے بھارت کو بھی گیس فراہم کی جا سکے۔ پاکستان اور بھارت اصولی طور پر اس گیس پائپ لائن کے منصوبے پر متفق ہیں لیکن دیگر مسائل کی طرح سیاسی کشیدگی کی وجہ سے اب تک اس معاملے پر بھی معاہدہ نہیں ہو سکا۔ چونکہ یہ گیس پائپ لائن پاکستان سے گذرے گی اس لئے بھارت کو عدم تحفظ کا خطرہ لاحق رہے گا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ گیس پائپ لائن بچھائی جائے تو پاکستان کو اپنی سرزمین سے گیس کی ترسیل کے لئے تقریباً 70 کروڑ ڈالر کا سالانہ محصول ملے گا۔

آٹھویں نمبر پر پاکستان کا بھارت کے درمیان ایک اور تنازعہ چل رہا ہے وہ سیاچن کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ تنازعات کی فہرست میں 1984 میں شامل ہوا جب ہندوستان نے اپنی

افواج کو ہمالیہ کی ان چوٹیوں پر یہ کہتے ہوئے بھیج دیا کہ پاکستان ان پر قبضہ کرنے والا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ 1947 کے بعد سے اس علاقے میں دونوں ممالک میں سے کسی کی بھی فوج نہیں تھی کیونکہ یہ علاقہ انتہائی بلند ہونے کی وجہ سے یخ ٹھنڈا علاقہ ہے۔ جہاں پر درجہ حرارت منفی سے بھی بہت نیچے تک رہتا ہے اور عام حالات میں وہاں پر زندہ رہنا انسانی جسم کیلئے ممکن نہیں۔ اس پر بھی دونوں ممالک میں جنگ ہو چکی ہے جو دنیا بھر میں انتہائی بلندی پر لڑی جانے والی ایک مہنگی جنگ تھی۔ جہاں دونوں ملک اپنی افواج کو وہاں رکھنے کے لئے کروڑوں روپے روزانہ صرف کرتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے مابین اس پر کئی بار مذاکرات ہوئے کہ اس علاقے سے اپنی اپنی افواج واپس بلالی جائیں، مگر دونوں ممالک کسی فیصلے تک نہ پہنچ سکے۔ سیاچن گلیشیر اور سرکریک کے متنازعہ معاملات پر بات چیت کے لیے بھارت کا وفد اس سلسلے میں پاکستان بھی آیا تھا، مگر بات چیت کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکی۔ سیاچن گلیشئر سے فوجیں ہٹانے کے معاملے پر بھارت اور پاکستان کے درمیان دہلی میں بھی بات چیت ہوئی جو بے نتیجہ ختم ہو گئی۔ بھارت کا موقف ہے کہ سیاچن گلیشئر پر فی الوقت جہاں فوج موجود ہے اگر اس پوزیشن کو تسلیم کر لیا جائے تو فوجیں ہٹائی جا سکتی ہیں۔ لیکن پاکستان صرف 1984 سے قبل کی صورتحال ماننے کو تیار ہے جب سیاچن گلیشئرز بھارتی فوج سے پوری طرح خالی تھیں۔

بھارت کے سابق ایڈمرل رام داس کا کہنا تھا کہ پاکستان اور بھارت میں امن کی تحریک کو ابتدا ہی سے کئی چیلنج درپیش رہے ہیں۔ ان میں دونوں ملکوں میں شدید غربت، مذہبی بنیاد پرستی، ملٹری کارپوریٹ کلچر، نیوکلیئر، طرز فکر اور تعصبات اور بیرون ممالک خاص طور پر امریکہ کا اثر ونفوذ شامل ہیں۔ رام داس نے تجویز دی کہ امن کے عمل میں نوجوانوں کو شامل کیا جائے اور اس تحریک کا جائزہ لینے کے لیے سال میں ایک مرتبہ دونوں طرف کے لوگ مل بیٹھیں۔ جبکہ بھارت کے سابق وزیر اعظم منموہن سنگھ کا بھی کہنا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کے سب سے بلند محاذ جنگ، سیاچن گلیشئر کو 'امن کی پہاڑیوں' میں تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ من موہن سنگھ کا یہ بھی زور دیکر کہنا کہ امن کے لیے سرحدوں کی از سرنو حد بندی نہیں کی جائیگی بھارت کے اخلاص کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ منموہن سنگھ بھارت کے پہلے وزیر اعظم تھے جنہوں نے سیاچن کا دورہ کیا تھا، وہاں پر تعینات ہندوستانی فوجوں کو خطاب

کرتے ہوئے مسٹر سنگھ نے کہا' سیاچن کو دنیا کا سب سے اونچا محاذ جنگ کہا جاتا ہے، جہاں زندگی گزارنا بڑا مشکل ہے۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ اس محاذ جنگ کو پرامن پہاڑیوں میں تبدیل کردیا جائے۔

## پاک بھارت تجارت، تاریخ، سارک، مسئلہ کشمیر اور خدشات

جب میاں نواز شریف وزیراعظم بنے تو 2013ء میں ہی کنٹرول لائن پر فورسز کی کشیدگی شروع ہوگئی جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے فائرنگ کے سلسلہ میں جانی نقصان کی خبریں بھی میڈیا میں آنا شروع ہوگئیں۔ اس موقع پر وزیراعظم میاں نواز شریف نے کہا ''ہم بھارت کے ساتھ کشیدگی نہیں امن چاہتے ہیں''۔ پاکستان کے داخلی معاملات کے تناظر میں ممکن ہے یہ بات ان کو درست معلوم ہوئی ہو۔ اس کے فوری بعد جنوری 2014ء کے آغاز میں وفاقی وزیر تجارت 5ویں سارک تجارتی کانفرنس میں شرکت کے لئے دہلی گئے جہاں بھارتی ہم منصب کے ساتھ دوطرفہ تجارتی معاملات پر تفصیل سے باہمی گفت وشنید ہوئی۔ وفاقی وزیر تجارت خرم دستگیر نے بھارت میں صنعتی کنفیڈریشن کے نمائندوں سمیت کئی فورسز پر پاک بھارت تجارت کے خدوخال پر بات چیت کی جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

پاکستان اور بھارت نے ایک دوسرے کو اپنی منڈیوں تک بلاامتیاز رسائی دینے پر اتفاق کرلیا۔ اب واہگہ کے راستے پورے ہفتے چوبیس گھنٹے تجارت ہوگی۔ نامزد بینک دونوں ممالک میں برانچیں کھولیں گے۔ جبکہ ایک خبر یہ بھی تھی کہ بھارت سے 500 میگاواٹ بجلی بھی خریدیں گے۔ موجودہ حکمرانوں نے حالیہ انتخابات میں اپنی کامیابی کو عوام کی جانب سے بھارت سے تعلقات کی بحالی کا مینڈیٹ قرار دیا اور حکومت سنبھالتے ہی سابق سیکرٹری خارجہ کو ایلچی بنا کر بھارت بھیجا۔ پاکستان کے عوام بھی بھارت سے دوستی چاہتے ہیں لیکن بھارت میں صورت حال مختلف ہے۔ بھارت میں پاکستان کے لیے نفرت میں اضافہ کیا گیا۔ بھارتی میڈیا پاکستان مخالف زہریلا پراپیگنڈا کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ہر جگہ شور شرابے کا ہدف پاکستان ہے۔ اس عمل کی موجودگی میں بھارت سے تجارت میں اپنے مفادات حاصل کرنا کیسے ممکن ہوگا۔ بھارتی منڈیوں تک رسائی اور فائدہ حاصل کرنے کا جہاں تک تعلق ہے تو جو

بھارت پاکستانی میڈیا کو اپنے عوام تک رسائی دینا برداشت نہیں کرتا، وہ پاکستانی صنعکاروں اور تاجروں کو کیسے برداشت کریگا۔ چین پاکستان کا دوست ملک ہے۔ کسی بھی محاذ پر جس میں تجارت وصنعت بھی شامل ہے وہ پاکستان سے متعلق منفی سوچ نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود پاک چین تجارت کا توازن چین کے حق میں ہے۔ اسٹیٹ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق پاک بھارت تجارت میں پانچ سو فیصد عدم توازن ہے۔ اس معاہدے کے بعد یہ عدم توازن کہاں تک جائے گا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ عام اشیاء سے لے کر خام مال اور بجلی تک کے معاملے میں بھارت کو مقتدر بنا دیا جائے جو پاکستان کو کمزور کرنے کا کوئی موقع خالی نہیں جانے دیتا۔ امریکہ پاکستان کو زندہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا اور مردہ بھی نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ پاکستان زندگی اور موت کے بیچ کہیں معلق رہے۔ پرچون کی اشیاء سے بجلی تک اپنے معاملات بھارت کے سپرد کیسے کیے جاسکتے ہیں۔

دونوں ممالک کے درمیان تجارت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسئلہ کشمیر تصور کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں کشمیر پالیسی کو رواں دواں رکھنے والے اس خدشے کا اظہار کرتے آ رہے ہیں کہ اس طرح بھارت کو کشمیر سے باہر نکالنے کے لئے درکار جوش وجذبہ ماند نہ پڑ جائے۔ اقتصادی اصولوں کی بات کی جائے تو جنوبی ایشیا کی معاشی ترقی کی ناہمواری میں بھارت کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کھلی تجارت میں بھارت کو فوائد زیادہ ملتے ہیں لیکن اس نے ہر ایک کے ساتھ تعلقات بگاڑ رکھے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں زیادہ قیمتوں والی اشیاء کا 78 فیصد بھارت پیدا کرتا ہے۔ پاک بھارت تجارت میں ہمیشہ بھارت کو پاکستان پر غلبہ حاصل رہا اور پاکستان نقصان اٹھاتا رہا ہے۔ اگر مارچ 2014ء سے پاک بھارت تجارت شروع ہوئی تو 5 سالوں میں پاکستان کو 1300 ارب کا نقصان ہوگا۔ پاکستان ایگری فورم کے چیئرمین نے پاکستانیوں کو اس دوطرفہ تجارت کے فوائد ونقصانات گنواتے ہوئے کہا کہ ہمارے کھیت اور فیکٹریاں تباہ ہو جائیں گی۔ اور ایک کروڑ افراد بے روزگار ہو جائیں گے۔ ان میں 60 لاکھ زرعی اور 40 لاکھ صنعتی مزدور شامل ہوں گے۔ کیونکہ بھارت 1320 ارب روپے کی سالانہ سبسڈی دیتا ہے جس سے وہاں زرعی وصنعتی پیداواری لاگت پاکستان کی نسبت 50 فیصد سے بھی کم ہے۔ اگر ہم بھارت سے برآمدات کے خواہاں

ہیں تو حکومت کو یوریا کھاد کی قیمت فی بوری 600 روپے میں کسانوں کو دینا ہوگی جو آج کل 1950 روپے میں فروخت ہو رہی ہے۔ اسی طرح ڈی اے پی کھاد فی 50 کلو 2 ہزار روپے میں فراہم کرنا ہوگی۔ جس کی قیمت اب 4 ہزار روپے ہے۔ اسی طرح ڈیزل 90 روپے لیٹر اور قرضوں پر شرح سود 8 فیصد کرنا ہوگی۔ مزید یہ کہ صنعت و زراعت کے لئے بجلی کی قیمت 9 روپے فی یونٹ تک لانا ہوگی۔ اس کے بعد پاکستان کو بھارت کے ساتھ مقابلے کرانے میں کوئی حرج نہیں۔

اوورسیز انوسٹرز چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے 2014 کے ایک سروے کے مطابق پاکستان میں کئی مشکلات اور مسائل کی وجہ سے ایف ڈی آئی کم ہو رہی ہے جو کہ اب ایک ارب ڈالر سے بھی کم ہے جبکہ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے 8 ارب ڈالر کے مواقع پائے جاتے ہیں۔ بھارت میں 2013ء میں ملکی سرمایہ کاری کا حجم 30 ارب ڈالر، چین 100 ارب ڈالر سے زائد اور ویت نام میں 23 ارب ڈالر سے زائد ہے۔ اس کی وجہ سے سلامتی اور انرجی کے شعبوں میں درپیش چیلنجوں کا سدباب نہ کرنا ہے۔ سروے میں پاک بھارت تجارتی تعلقات کے حوالے سے بھی ایک دلچسپ بات سامنے آئی جس کے مطابق 2011ء میں 61 فیصد کاروباری لوگ بھارت کے ساتھ تجارت کے حق میں تھے 2013ء میں یہ تعداد 43 فیصد رہ گئی۔ 2011ء میں ایم ایف این کے حق میں 38 فیصد افراد تھے جو اب 25 فیصد رہ گئے ہیں۔ اگر پاکستان میں امن ہو جائے تو یہ کاروباری سہولیات کے حوالے سے بھارت سے بہتر ملک ہے۔ پاک بھارت تجارت میں تسلسل کیوں قائم نہ رہ سکا۔ دونوں ممالک میں ماضی میں ہونے والی تجارت کی تفصیل کا جائزہ لینے کے بعد اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اپنی تشکیل کے تھوڑے عرصہ بعد سارک تنظیم یہ طے کر چکی تھی کہ جنوبی ایشیا کو آزاد تجارتی علاقہ ہونا چاہئے۔ لیکن اس خطہ کی آپسی تجارت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس خطہ کی معیشتوں نے 1982ء کے بعد آپسی تجارت شروع کی لیکن اس کا نقطہ عروج بھی ان کی کل تجارت کا ایک انتہائی معمولی حصہ بنا۔ 1992ء میں پاکستان نے بھارت کو 135.5 ملین ڈالر کی اشیاء برآمد کیں جبکہ اس کی کل برآمدات 7 بلین ڈالرز کی تھیں۔ اسی طرح بھارت نے پاکستان کو 27 ملین کی اشیاء برآمد کیں جبکہ اس کی کل برآمدات 25.6 بلین ڈالر کی تھیں۔ پاکستان میں

550 سے قدرے زائد اشیاء بھارت کو فروخت کرنے کی اجازت تھی اور اس میں اتنی رکاوٹیں حائل رہی ہیں کہ اس تجارت کو بڑھانا تو کجا صرف انہی اشیاء کی مقدار میں اضافہ ناممکن ہو گیا۔

1947ء میں ہندوستان میں کل 14 ہزار صنعتی یونٹوں کے غیر منقسم ورثے سے پاکستان کا حصہ 1000 چالو صنعتی یونٹوں کا تھا۔ جو کہ بھارت کی کل مصنوعات کا صرف 5 فیصد تیار کر رہے تھے۔ اسی طرح غیر منقسم ہندوستان کے 3.14 ملین صنعتی کارکنوں میں سے پاکستان کے حصے میں صرف 2 لاکھ صنعتی کارکن آئے جبکہ اس کی معیشت کا انحصار غالب طور پر زراعت اور خام مال پر تھا۔ دونوں معیشتیں باہم پیوست تھیں اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ کسی کو نقصان پہنچائے بغیر فائدہ مند باہمی تجارت کی جائے گی۔ 1949ء تک ایک ''خاموش'' معاہدے پر عمل درآمد ہوتا رہا جس کے تحت محصولات اور تجارت کے دوسرے قوانین کو نرم رکھا گیا۔ پاکستان کے پاس اشیائے خوردنی، پٹ سن اور کپاس کی فاضل پیداوار تھی جس کے بدلے بھارت کپڑا، اسٹیل اور دوسری مصنوعات پاکستان کو برآمد کرتا تھا۔

اس کے بعد دونوں ممالک اثاثوں کی تقسیم کے مسئلہ پر جھگڑتے رہے، جس کا اثر باہمی تجارت پر پڑا۔ چونکہ اس عمل میں پاکستان کو انتہائی دباؤ میں لایا گیا لہٰذا اس کے ردعمل میں پاکستان نے بھارت کے تخفیف قیمت کے اقدام پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور مغربی پاکستان میں پٹ سن پر برآمدی ڈیوٹی عائد کر دی جس کو بھارت تیار کرتا تھا۔ تجارتی ''رشتہ'' 1949ء میں ختم ہوا اور اس کے بعد یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کو مراعات دینے کی بجائے مقابلہ بازی پر اتر آئے۔ بھارت نے کپاس اگانا شروع کی جبکہ پاکستان نے عالمی منڈی میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا ٹیکسٹائل کا شعبہ قائم کر لیا۔ بھارت کی معیشت کو سوشلسٹ ماڈل غالب رجحان درآمدات کے خلاف رہا جس کی وجہ سے اس نے درآمدی پالیسی میں سخت قوانین نافذ کر دیئے۔

جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا تو اسے افغانستان میں جنگی صورت حال کا سامنا تھا لہٰذا اس نے بھارت کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششیں شروع کیں۔ 1981ء میں دونوں ممالک کے ایوان ہائے صنعت و تجارت کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ مذاکرات کریں اور تجارت کو بڑھانے کے لئے تجاویز دیں۔ 1982ء میں پاکستان نے 140 اشیاء کا اعلان کیا اور

تجارت کو بڑھانے کے لئے تجاویز دیں۔ 1983ء میں ایک مشترکہ کمیشن نے اس فہرست میں مزید آٹھ اشیاء کا اضافہ کر دیا۔ لیکن پاکستان میں اس تجارت کا انتظام ٹریڈ کارپوریشن آف پاکستان "ٹی سی پی" کے تحت کیا جاتا تھا۔ 1984ء میں چار ذیلی کمیشنوں نے باہمی تجارت کے دائرہ کو مزید بڑھایا جس کے تحت پاکستان بھارت سے کچا لوہا، سٹیل، رول، سٹین لیس سٹیل کی چادریں، ابرق اور اس کی مصنوعات کیمیائی مادے، پٹ سن اور اس کی مصنوعات، چائے، کافی اور بیٹری درآمد کرتا تھا جبکہ بھارت پاکستان سے خام کوئلہ، خام لوہا، دھوبی سوڈا، خشک اور تازہ پھل، پٹرولیم مصنوعات، کھادیں، چٹانی نمک، سنگ سلیمانی اور صنعتی الکوحل درآمد کرتا تھا۔

1986ء میں پاکستان نے اپنے نجی شعبے کو ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے وسیلہ کے بغیر براہ راست بھارت کے نجی شعبہ کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت دے دی اور قابل تجارت اشیاء کی تعداد بڑھا کر 250 کر دی جبکہ 1988ء میں اس فہرست میں مزید 322 اشیاء کا اضافہ کر دیا گیا۔

1995ء تک پاکستان نے بھارت کے ساتھ فاضل یعنی سرپلس تجارت کی ہے اور منافع کمایا ہے اور اس کی بنیادی وجہ قابل تجارت اشیاء کی محدود اور متعین فہرست ہے۔ یہ فرق اوسطاً 50 ملین ڈالر کا رہا ہے۔ اشیاء کی تعداد میں اضافے کے بعد پاکستان کی فاضل تجارت میں کمی واقع ہوئی لیکن پاکستان کے ساتھ بھارت کی فاضل تجارت کی شرح کبھی بھی 4.5 بلین ڈالر سے زیادہ نہیں بڑھ سکی۔ بھارت کو پاکستان کی برآمدات اس کی کل برآمدات 0.30 فیصد بنتی ہے۔ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے ساتھ "بچے کھچے" تجارتی پارٹنرز کا سا سلوک کرتے ہیں اور انہوں نے آپس میں سنجیدہ تجارتی تعلقات قائم نہیں کئے۔

بھارت کا رقبہ شاید اس کے ہمسایہ ممالک کے لئے ایک ڈراؤنی چیز ہے اس کے پاس جنوبی ایشیا کی 77 فیصد آبادی ہے، اس کے پاس جنوبی ایشیا کے کل جی ڈی پی کا 77 فیصد ہے اور وہ اس خطہ کی کل منافع بخش مصنوعات یعنی ویلیو ایڈڈ کا 74 فیصد پیدا کرتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں کی جانے والی کوئی تجارت آزادانہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بڑی احتیاط سے اس کی درجہ بندی کرنا پڑے گی۔ بھارت پاکستان کی نسبت اپنے تجارتی قوانین کو نرم کرنے میں سست رہا ہے۔ جس نے پاکستان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ قابل تجارت اشیاء کی فہرست کے حوالے سے

بھارت کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھے۔ اگر محصولات اور ادائیگیوں کے نظام کو درست کرنا ہے تو ساؤتھ ایشیا فری ٹریڈ ایسوسی ایشن (SAFTA) کی تجاویز پر بہت احتیاط سے عمل کرنا ہو گا۔

سارک تعلقات کے ایک ماہر ایک مشہور رائٹر، کشور گھرانہ کے مطابق بھارت کی اپنے ہمسایوں کے ساتھ موجودہ مسائل کو حل کرنے میں ہچکچاہٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علاقائی تجارت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس کے بنگلہ دیش کے ساتھ پانی کے تنازعات، اس کے سری لنکا کے ساتھ تاملوں کے مسئلہ کے تنازعات، اس کے نیپال کے ساتھ تجارت اور دریائی پانی کے تنازعات اور اس کے پاکستان کے ساتھ مسئلہ کشمیر سمیت کئی دوسرے تنازعات ابھی تک حل طلب ہیں اور دوسرے تعلقات کو معمول پر لانے کی راہ میں حائل ہیں۔ اس کی جنگ کے لئے تیاریاں اور مسلسل بڑھتی ہوئی جنگی مشینری اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ ہمسایوں کے ساتھ اپنے تجارتی مسائل کو اپنی چودھراہٹ کے دباؤ کے تحت "بزور طاقت" حل کرے گا۔

ان تنازعات نے دفاعی اخراجات میں اضافہ کر دیا ہے۔ بھارت اپنے دفاعی اخراجات پر 7.4 بلین ڈالر سالانہ خرچ کرتا ہے۔ جو کہ اس کی مجموعی آمدنی (GDP) کا 3.3 فیصد ہے اس کے ساتھ ساتھ اسے قرضوں کی ادائیگی کے شدید مسائل کا سامنا ہے۔ اس کے دفاع اور قرضہ جات کی ادائیگی کے اخراجات اس کے محصولاتی بجٹ کا 60 فیصد ہیں جس کا مطلب ہے کہ اس کے پاس حکومت کو چلانے کے لئے اور ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے بجٹ کا صرف 40 فیصد ہے۔

دونوں ممالک کو تجارت کی "بین الاقوامیت" کے چیلنج کا سامنا ہے اور دونوں ممالک کو (Gatt) کے نافذ کردہ قوانین پر عمل درآمد میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ دیو قامت جنگی اخراجات کی وجہ سے انہیں سرمائے کی کمی کا بھی سامنا ہے۔ لہذا یہ بھاری منافعوں کے متلاشی بیرونی سرمائے کو آوازیں دے رہے ہیں۔ جیسے جیسے موجودہ سرکاری بیرونی امداد میں کمی ہو رہی ہے ویسے ویسے ان پر جنگی اخراجات کو کم کرنے کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ اگر پاکستان اور بھارت اپنے جنگی اخراجات میں 25 فیصد کمی کر لیں تو اس سے ترقیاتی منصوبوں کے لئے 3.4 بلین ڈالر حاصل ہوں گے اور یہ رقم جنوبی ایشیا کو ملنے والی کل سالانہ امداد (ODA) سے زیادہ ہو گی۔

# پانی کی جنگ، کوہ ہمالیہ کا تباہ ہوتا ہوا ماحولیاتی نظام

یوں تو انسان روز اول ہی سے آگے بڑھنے اور ماحول کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی آرزو اور کوشش کرتا رہا ہے مگر آج واقعی انسان اس مقام پر ہے، جس کے لئے غالب نے بڑے گھمنڈ سے کہا تھا۔

"ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے......

گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے......

ہے موجزن اک قلزم خوں، کاش یہی ہو......

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے......"

16ویں صدی عیسوی میں انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی راہیں اپنائیں، مگر 20ویں صدی کے آغاز تک ان راہوں پر سفر اتنا تیز رفتار نہیں تھا البتہ 20ویں صدی کی ہر آنے والی دہائی نے سائنسی ترقی کی رفتار کو دوگنا کیا اور انسان نے قدرت کے نظام کو پوری طرح سمجھے بغیر ہی تسخیر کرنا شروع کر دیا اس دوران انسان نے بہت سی ایسی غلطیاں بھی کی تھیں جن سے انسان کو سیکھنے کا موقع ملا۔ روس میں اشتراکی انقلاب 1930ء تک مستحکم ہو چکا تھا اور یہ وہی دور تھا، جب پہلی بار عالمی سطح پر آزاد معیشت یعنی سرمایہ دارانہ نظام کو کساد بازاری کا چیلنج درپیش ہوا۔ دنیا بھر میں بھوک، غربت اور بیروزگاری عام ہوئی اور بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق اسی عالمی کساد بازاری کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) ہوئی۔ بہرحال، عالمی کساد بازاری کے زمانے میں بھی سوویت یونین میں خوش حالی تھی صنعتی ترقی عروج پر تھی۔ پھر سوویت یونین نے وسطی ایشیا میں بہنے والے دریاؤں کے پانی کو ڈیمز بنا کر روک دیا، جو چاروں جانب سے خشکی میں گھرے سمندر، بحیرہ، کیسپین میں گرتے تھے۔ سو دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں کروڑوں ایکڑ رقبے پر فصلیں لہلہانے لگیں اور ہر طرف خوش حالی آ گئی، مگر اگلے پندرہ، بیس برسوں میں بحیرہ کیسپین میں چونکہ میٹھے تازہ پانی کی آمد بالکل بند ہو گئی اس لئے جب سمندر میں پانی کی مقدار کم ہوئی، تو نمکیات کے اضافے کی وجہ سے سمندری حیات ختم ہو گئی اس کے نتیجے میں ہزاروں ماہی گیر بے روزگار ہوئے، تو ان کو زرعی مزدور یعنی کسان بنا دیا گیا اگلے پندرہ،

بیس برس میں سمندر ساحل سے پچاس' پچاس میٹر اندر کی طرف مزید سکڑ گیا یوں' پورے ماحول کا توازن بگڑ گیا۔ خشک ساحل پر موجود نمکیات کی پیڑیاں' آندھیوں اور بگولوں سے اڑ کر سکڑوں میل تک جہاں فصلیں لہلہا رہی تھیں' کھیتوں اور آبادیوں پر برسنے لگیں اور نتیجتاً فصلیں جل کر برباد ہونے لگیں۔ علاقے میں رہائش پذیر افراد کو آنکھوں کے امراض اور جلدی بیماریاں کثرت سے ہونے لگیں' تو سوویت سائنس دان سر جوڑ کر بیٹھے اور پھر یہ طے پایا کہ ان دریاؤں کا سارا پانی ڈیمز کے ذریعے روک لینا ٹھیک نہیں تھا اس کے لئے دوبارہ ان ڈیمز سے پانی کی ایک خاص مقدار بحیرہ کیسپین میں جانے کی اجازت دی گئی' جس سے قدرے توازن تو پیدا ہوا' لیکن قدرتی ماحول کو جو نقصان پہنچا تھا' اس کا مکمل طور پر ازالہ نہیں ہو سکا۔

ہمالیہ' دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہے سنسکرت کی دیومالائی داستانوں میں اس پہاڑ کو ''ساگر ماتا'' یعنی سمندروں کی ماں کہا جاتا ہے ہمالیہ سنسکرت کا لفظ ہے۔ جس کے معنی برف کا گھر ہے اس کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی 8848 میٹر ہے کوہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلے کوہ قراقرم' ہندوکش پاکستان کی طرف' پامیر' افغانستان اور وسطی ایشیا کی طرف' جب کہ باقی مقبوضہ کشمیر و بھارت اور چین و نیپال کی جانب ہیں دنیا میں 8000 ہزار میٹر سے بلند چوٹیوں کی تعداد 14 ہے اور یہ سب ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں واقع ہیں ان 14 بلند ترین چوٹیوں میں سے 8 نیپال' 5 پاکستان اور ایک چوٹی چین کے پاس ہے پاکستان میں واقع پانچ بلند ترین چوٹیوں میں سے ایک کے ٹو (بلندی 8611 میٹر) کو گاڈون آسٹن بھی کہا جاتا ہے۔

کہتے ہیں' چین کو آزادی کے وقت اپنی آبادی کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہونے پر فخر تھا کیونکہ آبادی کمیونزم کی وجہ سے بہت منظم تھی۔ اس زمانے میں کسی چینی ماہر زراعت نے یہ انکشاف کیا کہ پرندے فصلوں کی کاشت کے دوران چند مہینوں میں کروڑوں ٹن اناج کھا جاتے ہیں بس پھر کیا تھا' چین کی ساری آبادی کو بتایا گیا کہ پرندوں کو ختم کرنا ہے یوں چند ہی دنوں میں کروڑوں' اربوں پرندے مر گئے مگر پھر چند مہینوں بعد معلوم ہوا کہ پرندوں کے مرنے سے حشرات کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے اور فصلوں کو پہلے سے کہیں زیادہ نقصان ہوا ہے۔ واضح رہے کہ حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑوں کی عمر چند گھنٹوں سے چند دن کے درمیان ہوتی ہے اور اس دورانیے میں بھی 90 فیصد حشرات الارض کو پرندے' سانپ'

چھپکلیاں اور چوہے وغیرہ کھا جاتے ہیں ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر حشرات الارض کی عمر صرف ایک برس ہی ہو جائے تو ایک سال میں کرہ ارض پر ان کیڑے مکوڑوں کی ڈھائی فٹ موٹی تہہ جم جائے اس لئے دنیا کے کسی بھی ایکولوجیکل زون میں اس کے ایکولوجیکل سسٹم کے تحت حشرات خاصی اہمیت رکھتے ہیں واضح رہے کہ ایوکلوجیکل سسٹم کسی مخصوص علاقے کا ایسا قدرتی نظام ہوتا ہے جس میں ایک سائیکل یا دائرے کی صورت میں پرندے، رینگنے والے جانور، جنگلی جانور، درخت، جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اس سائیکل سے ایک بھی چیز مکمل طور پر ختم ہو جائے، تو پورے ایکولوجیکل زون میں قائم ایکو سسٹم عدم توازن کا شکار ہو کر پیداواری عمل کو بانجھ کر سکتا ہے۔

آج دنیا کی صورت حال یہ ہے کہ ایک جانب، تو میڈیکل سائنس میں ترقی کی وجہ سے معیاری علاج اور ادویہ کی ایجادات سے صرف پچاس برسوں میں انسان کی اوسط عمر ترقی یافتہ ملکوں میں 83 اور پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں 65 برس تک پہنچ گئی ہے اور دنیا کی مجموعی آبادی، جو آج سے صرف سوا سو برس پہلے ایک ارب تھی اب نہ صرف 7 ارب سے زیادہ ہے بلکہ ہر 13 برس بعد اس میں ایک ارب کا اضافہ بھی ہو رہا ہے بدقسمتی سے دنیا کی نصف آبادی کوہ ہمالیہ کے دامن میں آباد ممالک یعنی ہمارے خطے میں مقیم ہے اور اس آبادی میں گزشتہ 70 برسوں میں تقریباً تین گنا اضافہ ہوا ہے 10 اگست 2012ء کو برطانوی اخبار ''گارجین'' میں کوہ ہمالیہ کے بارے میں ایک چشم کشا رپورٹ شائع ہوئی اس رپورٹ میں ماہرین نے بتایا ہے کہ چین اور بھارت کی جانب سے پانی پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے جو ڈیمز تیزی سے تعمیر کئے جا رہے ہیں ان کی وجہ سے دنیا کے بلند ترین پہاڑ کے ایکو سسٹم کو شدید خطرہ ہے۔ رپورٹ میں شامل کی گئی تحقیق کے مطابق، چین، بھارت، نیپال، بھوٹان اور پاکستان 400 ڈیمز کی تعمیر کا منصوبہ رکھتے ہیں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بجلی، برطانیہ میں زیر استعمال بجلی سے تین گناہ زیادہ ہوگی۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو اطلاعات کے مطابق پاکستان، مستقبل میں ایسے 10 منصوبوں کی تعمیر کا ارادہ رکھتا ہے چین، ہمالیہ ریجن میں تبت کے علاقے میں مستقبل قریب میں 100 ڈیمز کی تعمیر کا ارادہ رکھتا ہے مزید یہ کہ چین ہائیڈرو پاور کے لئے 60 ڈیمز دریائے مکانگ پر بھی تعمیر کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد کرے

گا اس طرح آئندہ 20 برسوں میں دنیا کے سب سے عظیم پہاڑی سلسلے کے درمیان واقع گہری کھائیوں، گھاٹیوں اور وادیوں میں جہاں ہمالیہ سے نکلنے والے بڑے، چھوٹے اور درمیانے دریاؤں کی گزرگاہیں ہیں، سینکڑوں ڈیمز تعمیر ہوں گے بھارت 292 ڈیمز تعمیر کر کے 400 میگاواٹ سے زیادہ بجلی حاصل کرے گا۔ چین، دنیا کے سب سے بڑے ڈیمز تعمیر کر کے دنیا کو حیران کر چکا ہے، جب کہ بھارت میں ڈیمز کی تعداد سینکڑوں میں ہے بھارت اور چین کی جانب سے ہمالیس کے علاقے میں ڈیمز کی تعمیر کے بعد آئندہ 20 برسوں میں یہ علاقہ دنیا میں سب سے زیادہ ڈیمز والا خطہ بن جائے گا منصوبے کے مطابق یہ ڈیمز 28 سے 32 وادیوں کے درمیان تعمیر ہوں گے ہمالیہ ریجن میں ڈیمز کی تعمیر کے حوالے سے کینیڈا کی یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا کے محقق، شاشی تسیر ینگ کا کہنا ہے، ہمیں اس حوالے سے مستقبل میں ہونے والی خطرناک نوعیت کی تباہی کا اندازہ نہیں ہے چین، جو یہاں کا 40 فیصد پانی کے ذخائر رکھنے والا ملک بن گیا ہے، آئندہ چند برسوں میں انسانی تاریخ میں پانی ذخیرہ کرنے والا سب سے بڑا ملک ہوگا اس وقت چین ڈیمز کی تعمیرات کے حوالے سے ٹیکنالوجی اور صلاحیت رکھنے والا دنیا کا اہم ترین ملک بھی ہے جو نہ صرف اپنے ملک میں ڈیمز تعمیر کر رہا ہے، بلکہ پاکستان، برما اور دوسرے ممالک کو بھی ڈیمز کی تعمیر میں مدد دے رہا ہے اس رپورٹ سے ایک بات یہ بھی عیاں ہوتی ہے کہ جس طرح بھارتی ڈیمز کی تعمیر سے پاکستان اور بنگلہ دیش کو اپنے دریاؤں کے پانی کے بہاؤ میں کمی کے خطرات ہیں اسی طرح بھارت کو چین سے خطرات ہیں بھارتی جیو پولیٹیکل تجزیہ گار براہما چیلانی کا کہنا ہے کہ بھارت چین تنازعات اب زمین سے ہٹ کر پانی پر منتقل ہو رہے ہیں دونوں ملکوں میں پانی کے حوالے سے مرکزیت اختیار کر رہے ہیں اس تجزیہ کار کا کہنا ہے بھارت کے مقابلے میں چین کو دو بنیادوں پر برتری حاصل ہے ایک تو دریائے برہما پترا سمیت بھارت آنے والے پانی کا نصف حصہ چین سے بھارت آتا ہے، تو دوسری جانب اس وقت صرف چین ہی میگا ڈیمز بنانے کی صلاحیت اور ٹیکنالوجی رکھتا ہے یوں چین مستقبل قریب میں اقتصادی اور تکنیکی اعتبار سے بغیر گولی چلائے وہ سب کچھ حاصل کر سکتا ہے جو جنگ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اب جہاں تک بھارت کا تعلق ہے تو بھارتی ہائیڈرو پاور پروجیکٹ کی وجہ سے بنگلہ دیش کو مستقبل قریب میں تباہی کا سامنا ہوگا بنگلہ دیشی ماہرین کیمطابق بھارت

سے آنے والے پانی کے بہاؤ میں 10 فیصد کمی سے 80 فیصد چھوٹے کسان جن کی مجموعی تعداد 5 کروڑ ہے بری طرح متاثر ہوں گے۔ یاد رہے کہ اس سلسلے میں بھارت کئی سالوں سے بنگلہ دیش کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ بھارت دریائے گنگا کا پانی بنگلہ دیش کی سرحد کے صرف 17 کلومیٹر کے فاصلے پر اپنے فرخا ڈیم کے ذریعے روک لیتا ہے جو زیریں ریاست کی اجازت کے بغیر بنایا گیا ہے۔ اس پانی کی تقسیم کا کوئی قابل عمل معاہدہ بھی نہیں کیا گیا۔ 1980 میں مرار ڈیسائی کی حکومت نے بنگلہ دیش سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے 80 فیصد پانی بنگلہ دیش کو دینے پر رضامندی ظاہر کی گئی تھی لیکن یہ معاہدہ بھی اندرا گاندھی نے ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھارت نے 40 دوسرے دریاؤں پر بند باندھے ہیں جو بنگلہ دیش سے گذرتے ہیں۔ بھارت کے اس مسلم کش اقدام سے بنگلہ دیش کا جنوب مغربی حصہ بنجر ہو چکا ہے۔

ڈیمز کی انجینئرنگ اور ماحولیات کے شعبوں کے ماہرین کے مطابق بدقسمتی سے انسانی آبادی اور ماحولیات کے اعتبار سے ڈیمز کی تعمیر کے ضمن میں ریسرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو تھوڑی بہت تحقیق ہوئی بھی ہے تو اس کی بنیاد پر نہایت خطرناک صورتحال سامنے آتی ہے۔ مثلاً ڈیمز کی تعمیر کی وجہ سے سیلاب اور زلزلوں جیسی قدرتی آفات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ساؤتھ ایشیا نیٹ ورک ڈیمز، ریورز اینڈ پیپلز کے کوآرڈینیٹر ہمیانشو ٹھاکر نے ہائیڈرو پاور پروجیکٹ کے حوالے سے سماجی ماحولیات کے مسائل کے بارے میں کہا ہے کہ چین اور بھارت نے نرماد اور تھری جارج جیسے بڑے ڈیمز کی تعمیر کے لئے کروڑوں افراد کو ان کے آبائی علاقوں سے نکالا مگر ان کی بحالی اور آبادکاری کے لحاظ سے ان دونوں ملکوں کی جانب سے کوئی اعداد و شمار سامنے نہیں آئے۔ پاکستان میں بھی تھر میں کوئلے سے بجلی پیدا کرنے کا آغاز ہوا تو اس پر کسی نے غور و فکر نہ کیا کہ علاقے کے ماحول پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ وہاں بیک وقت بڑی تعداد میں پالتو بھیڑیں اور جنگلی مور کیوں مر رہے ہیں؟ چین، بھارت اور امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ آلودگی پھیلانے والے ممالک ہیں۔ انہوں نے دانستہ اور نادانستہ طور پر دنیا کی آب و ہوا کو تلپٹ کر دیا ہے۔ کرہ ارض کے گرم ہونے اور گلیشیئر پگھلنے پر ان ممالک نے قدرتی ماحول کی حفاظت کا احساس نہ کیا۔

ہمالیہ گلیشیرز کا علاقہ ہے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ 2050ء تک گلیشیرز تیزی سے پگھلنے سے دریاؤں میں پانی کی مقدار 10 سے 20 فیصد تک کم ہو جائے گی۔یوں ڈیمز کے ذریعے بجلی کی پیداوار میں کمی سے علاقائی سطح پر سیاسی بحران شدت اختیار کر جائیں گے۔بھارت کی جانب سے تیز رفتاری کے ساتھ ڈیمز کی تعمیر کے خلاف نہ صرف اس کے ہمسایہ ممالک احتجاج کر رہے ہیں' بلکہ اس کے اپنے صوبوں ہماچل پردیش' سکم اور آسام میں بھی احتجاج ہوا۔اس سلسلے میں ڈی جی اگروال نے 50 روز تک احتجاجی بھوک ہڑتال بھی کی۔ان کو اسپتال تک لے جایا گیا مگر ان تمام باتوں کے باوجود بھارتی حکومت ڈیمز کی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کو تیار نہیں۔ان منصوبوں میں پانی کو ایک بار روکا جاتا ہے اور جب ڈیم پانی سے بھر جاتا ہے تو اس پانی کو ٹربائن چلانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے یوں پانی سے بجلی بن جاتی ہے اور پھر اس پانی کو دریا میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔مگر ماہرین کا موقف یہ ہے کہ جب ایک پوائنٹ سے دوسرے پوائنٹ تک دریا کا بہاؤ رک جائے تو اس سے ماحول کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔گارجین میں شائع ہونے والی رپورٹ کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمالیہ ریجن کی ایکولوجی کو آسان انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

## پاک بھارت پانی کے تنازعے کا پس منظر (سندھ طاس معاہدہ)

پاکستان اور بھارت کے درمیان پانی کا تنازع بنیادی طور پر انگریز کا پیدا کردہ ہے۔جس طرح انگریزوں نے ہندوستان کی تقسیم کے معاملے میں مسلمانوں سے ناانصافی کی ایسے ہی پانی کی تقسیم کے معاملے میں پاکستان سے ناانصافی کی گئی۔پانی کے معاملے میں کچھ ناانصافیاں اور پریشانیاں وہ ہیں جو انگریز نے ہمارے لیے کھڑی کیں اور کچھ وہ ہیں جو ہم نے خود اپنے لیے کھڑی کیں۔وہ مسائل جو انگریز نے ہمارے لئے کھڑے کئے۔مثلاً کشمیر پر ہمارا حق تھا جو بھارت کو دیدیا گیا، جس سے کشمیر سے آنے والے دریا بھارت کے قبضے میں چلے گئے۔یہی حال پنجاب کی تقسیم میں ہوا۔پنجاب کی تقسیم کے وقت دریائے راوی پر مادھو پور ہیڈورکس اور دریائے ستلج پر فیروز پور ہیڈورکس کا کنٹرول ریڈکلف نے بھارت کو دیدیا۔مادھو پور ہیڈورکس 1851ء میں انگریزوں نے مادھو پور کے مقام پر بنایا تھا۔مسلم آبادی

کی اکثریتی تحصیلیں گورداسپور اور تحصیل بٹالہ پر اصولاً پاکستان کا حق تھا اگر یہ دونوں تحصیلیں پاکستان کو مل جاتیں تو مادھوپور ہیڈورکس اور اس سے نکلنے والی تمام نہریں ماسوائے ایک دو کے باقی سب پاکستان کو مل جاتیں۔ مادھوپور ہیڈورکس کی پاکستان کیلئے اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستانی پنجاب کا 75 فیصد زرعی علاقہ اس ہیڈورکس کی نہروں سے سیراب ہوتا تھا۔ فیروزپور ہیڈورکس 1920 میں بنایا گیا تھا اور اس سے تین نہریں نکالی گئیں۔

1۔ دیپالپور کینال، یہ نہر ضلع لاہور اور ضلع ساہیوال کے 1044300 ایکڑ رقبے اور کچھ مشرقی پنجاب کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی۔ تقسیم کے بعد یہ نہر پاکستان کے حصے میں آ گئی اور اس کا پانی بھارت لے گیا۔

2۔ دوسری نہر ایسٹرن کینال تھی۔ یہ نہر ریاست بہاولپور کے 170000 ایکڑ رقبے اور کچھ مشرقی پنجاب کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی۔

3۔ تیسری نہر بیکانیز تھی جو مشرقی پنجاب (بھارتی پنجاب) کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی۔ ان اعداد و شمار سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں ہیڈورکس کی پاکستان کیلئے کیا اہمیت تھی۔ تقسیم ہند کے وقت جب سرحدوں کی حد بندی کیلئے کمیٹیاں بنائی گئیں تو اس وقت پانی کے معاملات کو طے کرنے کیلئے بھی کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ اسی طرح ہیڈورکس سے پاکستان کی نہروں کو پانی دینے کے انتظامات کیلئے دو چیف انجینئرز پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ پاکستان کی طرف سے اس کمیٹی کی نمائندگی شیخ اے حمید نے کی اور بھارت کی نمائندگی سردار سروب سنگھ نے کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ فی الحال ایک عارضی معاہدے کے تحت بھارت پاکستان کی نہروں کو 31 مارچ 1948ء تک پانی دیتا رہے گا اور بعد میں اس معاہدے کی توسیع کر کے اسے مستقل شکل دیدی جائیگی۔ افسوس یہ مدت ختم ہونے سے پہلے پاکستان نے اس معاہدے کی توسیع کیلئے کوئی کارروائی نہ کی۔ یہی غلطی بعد میں تین دریاؤں کی فروخت کا سبب بنی۔ اس فاش غلطی کا ارتکاب دانستہ ہوا یا یہ ایک اتفاق تھا یہ سربستہ راز ہے۔ بہر حال عارضی معاہدہ کی میعاد 31 مارچ 1948 تک تھی۔ جیسے ہی یکم اپریل کا سورج طلوع ہوا، بھارت نے پاکستان کی نہروں کا پانی بند کر دیا جو مسلسل 34 دن تک بند رہا۔

دونوں ہیڈورکس بھارت کو دینے کی ایک وجہ تو انگریز کی انتہا درجے کی مسلم دشمنی

تھی۔دوسری وجہ ہمارے اپنے لوگوں کی نااہلی تھی۔اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ پنجاب میں سرحدوں کی حد بندی اور پانی کی تقسیم جیسے معاملات کو حل کرنے کیلئے ایک کمیشن تشکیل دیا گیا۔اس کمیشن کیلئے دوممبر جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر مسلم لیگ نے نامزد کئے اور دوممبر کانگریس کی طرف سے تھے۔کمیشن کے سامنے دلائل دینے اور قانونی جنگ لڑنے کیلئے مسلم لیگ نے ظفر اللہ خان کو مقرر کیا۔افسوس! ظفر اللہ خان نے پانی کے مسئلے کو صحیح طرح واضح نہ کیا اور نہ ہی یہ بات باور کروائی کہ مادھو پور اور فیروز پور، ہیڈورکس کی نہریں مغربی پنجاب کی زمینوں کو سیراب کررہی ہیں۔اس لئے ان نہروں پر صرف پاکستان کا حق تھا، یہ نہریں پاکستان کیلئے زندگی اور موت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ظفر اللہ خان کے دلائل ایک گورکھ دھندہ تھے انہوں نے معاملے کو سلجھانے کی بجائے الجھادیا۔دوسری بات یہ ہوئی کہ شیخ عبدالحمید جو کہ سینئر چیف انجینئر پنجاب تھے نے پاکستان بننے کے بعد انجینئروں کو بتایا کہ باؤنڈری کمیشن کی کارروائی کے دوران وہ دومرتبہ اپنے ہم منصب انجینئرز کے ساتھ جسٹس دین محمد جو کہ کمیشن کے سینئر مسلمان ممبر تھے،ان سے ملنے گئے تا کہ انہیں مادھو پور اور فیروز پور ہیڈورکس کی اہمیت اور ان ہیڈورکس سے پاکستان میں وسیع رقبہ جات کو سیراب کرنے والی نہروں کے بارے میں معلومات دی جائیں۔جسٹس دین محمد نے اس وفد سے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کردیا کہ وہ بطور جسٹس کسی سے ملکر اپنے ذہن کو متاثر نہیں کرنا چاہتا۔جسٹس دین محمد کا یہ انکار ایک انتہائی فاش غلطی تھی۔کاش وہ انجینئروں سے مل لیتے تو آج صورتحال مختلف ہوتی اور پاکستان کو اپنے تین دریا نہ بیچنے پڑتے۔جسٹس دین محمد صرف جسٹس ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی تھے۔مسلمان ہونے کے ناطے انہیں اسلامی ریاست کے مفادات کا خیال رکھنا چاہیے تھا لیکن افسوس! وہ ایسا نہ کرسکے جس کا خمیازہ ہم آج بھگت رہے ہیں اور آئندہ بھی بھگتیں گے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ پنجاب میں پانی کی تقسیم کیلئے پہلے ایک عارضی معاہدہ کیا گیا تھا۔معاہدہ یہ تھا کہ دونوں ملک پانی کے صورت حال کو جوں کا توں رکھیں گے اور ایک دوسرے کا پانی بند نہیں کیا جائیگا۔یہ معاہدہ پاکستان کے حق میں تھا جو 20 دسمبر 1947ء کو ہوا۔ اس دوران دونوں صوبوں (مغربی اور مشرقی پنجاب) کے وزیر اور انجینئر آپس میں کئی دفعہ ملے۔مغربی پنجاب کا ریونیو منسٹر سردار شوکت حیات تھا اور اس کا مشرقی پنجاب میں ہم منصب

سردار سورن سنگھ تھا جو بعد میں ہندوستان کا وزیر خارجہ بھی بنا۔ایک دفعہ شوکت حیات نے سکھ وزیر سے ازراہ مذاق کہا "اوئے سکھا توں ساڈا پانی تے بند نئیں کر دیں گا"۔اس پر سورن سنگھ نے جواب دیا "توں کی گل کر دا پیاں ایں' کدے کسے نے بھراواں دا پانی وی بند کیتا اے"۔یہ سب اس وقت کی باتیں تھیں بعد میں نہ ہندو اپنے قول پر قائم رہے اور نہ ہی سکھ بلکہ مغربی پنجاب کا پانی بند کر دیا گیا۔ پاکستان کو چاہیے تھا کہ اس معاہدے کو مستقل شکل دیتا۔معاہدے کی معیاد ختم ہونے کے ساتھ ہی بھارت نے پانی بند کر دیا۔پانی بند ہونے سے پاکستان کی 1.66 ملین ایکڑ کی آبپاشی ختم ہوگئی، کسان اور جانور پانی کی بوند بوند کو ترس گئے۔ان تشویشناک حالات میں پاکستان کا ایک وفد دہلی گیا۔اس وفد کے سربراہ غلام محمد (یہ اس وقت پاکستان کے وزیر خزانہ تھے اور بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے) تھے۔ان کے ہمراہ پنجاب کے دو وزیر شوکت حیات خان اور ممتاز دولتانہ بھی بھارت گئے۔بھارتی وفد کے ساتھ میٹنگ میں مشرقی پنجاب کے نمائندوں نے اس بات پر زور دیا کہ بند نہروں کا پانی اس وقت تک نہیں کھولا جائیگا جب تک مغربی پنجاب کے نمائندے یہ نہیں مانتے کہ ان کا متنازعہ پانی پر کوئی حق نہیں۔بالآخر پاکستانی وفد کو مجبوراً 4 مئی 1948ء کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑے۔جب یہ مرحلہ طے ہوگیا تو پاکستانی وفد نے کہا کہ چار مئی کی کارروائی سمجھوتہ نہیں تھا بلکہ محض ایک "بیان" تھا۔اس پر بھارت نے کہا نہیں یہ باقاعدہ معاہدہ تھا۔بہر حال یہ بیان تھا یا معاہدہ جو بھی تھا اس پر چار جون 1948ء کو دونوں ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے۔اس معاہدے پر پاکستان کی طرف سے غلام محمد اور اس کے ساتھ جانے والے دو وزیروں اور مشرقی پنجاب کے وزیروں نے دستخط کئے۔جس کی مندرجہ ذیل تین اہم شقیں تھیں۔

1۔متنازعہ پانی (ستلج، بیاس اور راوی کا پانی) کے سارے حقوق مشرقی پنجاب کی حکومت کے پاس ہیں اور ان پر مغربی پنجاب کی حکومت کوئی حق نہیں رکھتی۔

2۔مشرقی پنجاب کی حکومت بند نہروں کا پانی کھول دے گی لیکن اس کو بتدریج کم کر دیا جائیگا اسی اثناء میں مغربی پنجاب کی حکومت انہی نہروں کیلئے متبادل ذرائع سے پانی کا بندوبست کرے گی۔

3۔مغربی پنجاب کی حکومت مشرقی پنجاب کی حکومت کو اس دیئے گئے پانی کی قیمت

ادا کرے گی۔ یہ معاہدہ جو بھی تھا اس نے تین دریاؤں کے فروخت ہونے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اس سے بھی بڑی دکھ کی بات یہ ہے کہ بعد میں بھی حکومت پاکستان نے اس معاہدہ کے بارے میں کوئی مضبوط اور اصولی موقف اختیار نہ کیا بلکہ اس پر ایک لمبی خاموشی اختیار کر لی گئی۔ اس معاہدہ کے بعد اگرچہ بھارت نے دیپالپور کی نہروں اور سنٹرل باری دوآب کی نہروں کا پانی کھول دیا لیکن بہاولپور کی ریاستی نہر اور نو چھوٹے راجباہوں میں جو سنٹرل باری دوآب کا حصہ تھے کا پانی بند رکھا، اس طرح بہاولپور کا بہت سا حصہ صحرا بن گیا۔ 4 جون 1948ء کے معاہدے کے متعلق پاکستان نے دو سال بعد یعنی اگست 1950ء میں اپنا پہلا ردعمل ظاہر کیا" جب ہزاروں جانور پانی کی وجہ سے مرنے لگے۔ کسانوں کی کھیتیاں گرمی سے جھلس کر خشک ہونے لگیں، جب انسانی جانیں پانی نہ ملنے کی وجہ سے قریب المرگ ہو گئیں تو پاکستان کو چار مئی کے افسوسناک بیان پر دستخط کرنے پڑے"۔

پاکستان کے اس ردعمل پر نہرو بہت سیخ پا ہوا۔ اس نے 12 ستمبر 1950ء میں پاکستان کے نام ایک مراسلہ میں لکھا کہ "مجھے یہ جان کر تعجب ہوا ہے کہ پاکستان کو راضی نامے پر مجبوراً دستخط کرنے پڑے۔ حالانکہ پاکستان نے بخوشی راضی نامے پر دستخط کیے اور سارے معاملات دوستانہ ماحول میں طے پائے"۔ اس کے ساتھ نہرو نے دھمکی دی کہ چار مئی کے معاہدے کی روشنی میں مشرقی پنجاب کی حکومت کے پانی پر مکمل حقوق تسلیم کیے جائیں، آئندہ ہونے والی میٹنگوں کی بنیاد چار مئی کے معاہدہ پر ہو گی اور اگر پاکستان نے اس معاملے کو بلاوجہ طول دیا تو بھارت کو حق حاصل ہو گا کہ وہ چار مئی کے انتظامات کو مناسب نوٹس دینے کے بعد ختم کر دے۔" نہرو کی یہ دھمکی اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اب پاکستان کو ہمیشہ کیلئے تین دریاؤں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

## دولت مشترکہ کی رکنیت اور بھارت کا انحراف

جس ناانصافی کی بنیاد انگریز نے رکھی تھی اس پر باقی رہی سہی کسر بنیا کی چالاکی و عیاری اور ہمارے حکمرانوں کی نااہلی و نالائقی نے پوری کر دی۔ تین دریاؤں کے کھوئے جانے کی بنیاد ہم نے خود ہی تقسیم ہند سے پہلے رکھ دی تھی۔ اس کے بعد جو کوشش کی گئی وہ

ادھوری ہی تھی۔ مثلاً پاکستان نے بھارت کو پیشکش کی کہ نہروں کے پانی کے تصفیہ کیلئے بین الاقوامی عدالت انصاف سے رجوع کیا جائے۔ بھارت نے پاکستان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان دولت مشترکہ کا رکن تھا اس لئے پاکستان، بھارت کی رضامندی کے بغیر یہ معاملہ اکیلا عالمی عدالت انصاف میں نہیں لے جا سکتا تھا۔ چونکہ پانی کا مسئلہ انتہائی اہم نازک اور حساس تھا، اس مسئلہ کے تصفیہ کیلئے پاکستان کو چاہیے تھا کہ وہ دولت مشترکہ سے نکل جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ فیصلہ بھی نہ کیا جا سکا۔ اگر ہم دولت مشترکہ سے نکل کر یہ معاملہ عالمی عدالت انصاف میں لے جاتے تو فیصلہ ہمارے حق میں ہو جانا تھا۔ اس لئے پانی کے استعمال کے بین الاقوامی قوانین کی رو سے ہم حق پر تھے اور بھارت کا رویہ ناانصافی پر مبنی تھا۔

27 مارچ 1950 کو کراچی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں پاکستانی وفد کی قیادت چوہدری محمد علی، ان کی معاونت شیخ عبدالحمید چیف انجینئر اور پیر محمد ابراہیم چیف انجینئر (آبپاشی) نے کی۔ بھارتی وفد کا قائد اے این کھوسلہ (چیئرمین سنٹرل پاور آبپاشی) تھا۔ یہ بہت سمجھدار انجینئر اور اصول پسند آدمی تھا۔ وفد کے دوسرے ممبر جی کے گھوکھلے اور ایم آر سچدیو تھے جبکہ وفد کے متعصب ہندو ممبر این ڈی گولاٹی کی ثانوی پوزیشن تھی۔ چوہدری محمد علی نے پانی کے باہمی جھگڑے کو نمٹانے کیلئے عملی اقدامات پر زور دیا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ پاکستان اور بھارت نہروں کے پانی کے استعمال کے سابقہ ذرائع برقرار رکھیں اور نئی ضروریات طغیانی کے پانی سے پوری کی جائیں جو سمندر میں جا رہا ہے۔ اس مقصد کیلئے ستلج، راوی اور بیاس پر ڈیم بنائے جائیں جن کے اخراجات دونوں ملک مشترکہ طور پر ادا کریں۔ اس پر دونوں ملکوں کے نمائندوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ یہ تجویز بہت معقول تھی اور پاکستان کے حق میں تھی۔ اس تجویز کی ایک شق یہ تھی کہ صرف دریائے ستلج کا پانی مکمل طور پر بھارت کے تصرف میں رہنے دیا جائے، دریائے راوی اور دریائے بیاس کا پانی پاکستان استعمال کرے۔ اے این کھوسلہ نے پاکستانی وفد کے ساتھ میٹنگ میں جو ''ہاں'' کی وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد ''نہ'' میں بدل گئی۔ اگلی میٹنگ کیلئے جب پاکستانی وفد دہلی گیا تو وہاں این اے کھوسلہ کی بجائے این ڈی گولاٹی نے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے پاکستانی وفد کا استقبال

کیا جو سخت متعصب ہندو تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بھارتی وفد نے انتہائی سرد مہری سے پاکستانی وفد کا استقبال کیا۔ چنانچہ گولائی نے سابقہ تجاویز سے منحرف ہوتے ہوئے نئی تجاویز پیش کر دیں کہ

1۔ نہ صرف ستلج بلکہ بیاس اور راوی بھی مکمل طور پر بھارت کے تصرف میں دے دیئے جائیں۔

2۔ چناب سے ایک سرنگ کے ذریعے 10 ہزار کیوسک پانی راوی میں ڈال کر بھارت کے استعمال میں دے دیا جائے۔ ان تجاویز کا مطلب تھا کہ تین دریاؤں کے علاوہ چناب کا پانی بھی بھارت لے جائے۔ تاریخی طور پر ستلج، بیاس اور راوی کا پانی پاکستان میں 5.6 ملین ایکڑ زمین کو سیراب کرتا تھا اور اس آبپاشی سے پانچ ملین لوگوں کی روزی بھی وابستہ تھی۔ بھارت کے اس نئے منصوبے کا مطلب ان لوگوں کو ہلاکت کی طرف دھکیلنا تھا۔ بھارتی وفد اپنی تجاویز پر ڈٹا رہا اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی سے انکار کر دیا بعد ازاں پاکستانی وفد نہرو سے ملا اور اسے بھارتی وفد کی تجویز کے منفی پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ نہرو نے بظاہر اس پر بڑی تشویش کا اظہار کیا مگر اس نے یہ کہہ کر عملی مداخلت سے انکار کر دیا کہ "میں اریگیشن انجینئر نہیں، اس لئے اس معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکتا"۔ ایک طرف پانی کا یہ تنازع چل رہا تھا تو دوسری طرف بھارت ستلج، بیاس اور راوی کے پانیوں پر قبضہ کرنے کے منصوبوں کو عملی شکل دے رہا تھا۔ وہ پانی جس کی قیمت جار مئی 1948ء کے معاہدہ کے تحت بھارت پاکستان سے وصول کر چکا تھا وہ بھی بہت کم دیا جاتا یا خاص کر ان اوقات میں جب فصلوں کو کاشت کرنے یا پکنے کیلئے پانی درکار ہوتا تو کم کر دیا جاتا۔ اس کے ساتھ نئی نہریں تعمیر کی جانے لگیں اور بھاکڑا ڈیم جس کی تعمیر کا منصوبہ انگریزوں نے بنایا تھا اس کی اونچائی طے شدہ بلندی سے بڑھا کر 740 فٹ کر دی گئی۔ اس طرح بھارت بڑی منصوبہ بندی اور حکمت عملی سے آہستہ آہستہ پاکستان کے حصے کا پانی غصب کر رہا تھا اور وہ پہلے دن سے ہی اس بات کا ارادہ کئے بیٹھا تھا۔ اس کی تائید بھارت کے اریگیشن اینڈ پاور منسٹر مسٹر پٹیل کے اس بیان سے ہوتی ہے جو اس نے یکم اگست 1957 کو بھارتی لوک سبھا میں دیا۔ اس نے کہا "وہ منصوبے جن کی منظوری کیلئے میں فنڈز مانگ رہا ہوں ان میں وہ کام شامل ہیں جن میں بھارت سے پاکستان جانے والے دریاؤں کے پانی کا استعمال شامل ہے جونہی یہ منصوبے مکمل ہونگے پاکستان کے

حصے کا پانی بھارت کی ان نہروں میں استعمال کیا جائیگا۔خواہ پاکستان اپنے متبادل ذرائع کا انتظام کرے یا نہ کرے"۔

## امریکہ اور ورلڈ بنک کی شمولیت

پاکستان اور بھارت کے پانی کے جھگڑے کی آواز امریکہ تک جا پہنچی۔ وہاں ایک انجینئر ڈیوڈ ای مل لیلنتھال جو کہ اٹامک انرجی کمیشن کا سابق چیئرمین تھا نے اس معاملے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس نے فروری 1951ء میں پاکستان اور بھارت کا دورہ کیا۔لیاقت علی خان سے ملنے کے بعد جب وہ بھارت پہنچا تو نہرو نے اسے سرکاری مہمان کا درجہ دیا اور اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ پھر اس نے مقبوضہ کشمیر کا دورہ کیا اور شیخ عبداللہ سے بھی ملا۔ اس نے واپس جا کر اپنی حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اپنے میگزین میں ایک طویل مضمون، جس کا عنوان تھا۔ "Another korea in the making"، ایک اور کوریا بن رہا ہے؟" لکھا۔اس مضمون کے چند ایک نکات تھے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان نہری پانی کا تنازع ایک ڈائنامائٹ کی طرح ہے، اس ڈائنامائٹ کی موجودگی میں برصغیر پاک وہند میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔

پاکستان کے علاقے سندھ اور پنجاب دنیا کے بہترین خوراک پیدا کرنے والے علاقے ہیں۔ آبپاشی کا پانی نہ ملنے کی وجہ سے مستقبل میں یہ علاقے ریگستان میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پانی بند ہونے سے 20 ملین ایکڑز زمین خشک اور 10 ملین افراد فاقوں کا شکار ہو جائیں گے۔کوئی بھی قوم اتنی بڑی تباہی نہیں پھیلا سکتی، جتنی بڑی تباہی ہندوستان محض پانی بند کر کے پاکستان میں پھیلا سکتا ہے۔ تقسیم ہند کے وقت پنجاب کے آب حیات کے بہاؤ کی تقسیم میں اس قدر بے پرواہی سے کام کیوں لیا گیا؟ اس کا جواب ہمیشہ تشنہ رہے گا......؟

اس کے بعد ڈیوڈ نے دونوں ملکوں کے درمیان پانی کے تنازعہ کو حل کرنے کے لئے چند تجاویز دیں۔ یہ ساری کی ساری تجاویز سندھ طاس کے اردگرد گھومتی اور بھارت کے حق میں تھیں۔اس لئے بھارت نے ان تجاویز کو کچھ تحفظات کے ساتھ قبول کرلیا۔اس کے ساتھ ہی

پاکستان کی اپنے غصب شدہ پانی کے حق میں آواز کمزور پڑنے لگی۔ڈیوڈے نے اپنی تجاویز کی ایک ایک کاپی دونوں حکومتوں کو اور ایک کاپی ورلڈ بینک کو دی۔ پاکستان کو چاہئے تھا کہ وہ سندھ طاس کی بجائے اپنے غصب شدہ پانی کی بات کرتا لیکن خدا جانے وہ کون سی مصلحتیں تھیں جنہوں نے ہمارے حکمرانوں کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔اس کے بعد ورلڈ بینک نے ان تجاویز میں کافی زیادہ ردو بدل کیا۔یہ معاملہ کئی سال تک دونوں ممالک اور ورلڈ بینک کے درمیان گردش کرتا رہا۔5 فروری 1954ء کو جب ورلڈ بینک نے اپنا منصوبہ دونوں ملکوں کو حتمی طور پر دیا تو پاکستانی وفد کا قائد شیخ حمید زیر عتاب آ گیا۔اس پر الزم تھا کہ اس کی نا اہلی کی وجہ سے ورلڈ بینک نے ستلج، بیاس اور راوی بھارت کو پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔تاہم اس کا ذمہ دار ورلڈ بینک بھی تھا اور ہم خود بھی تھے۔اس لئے کہ اس معاملے کے اصل ذمہ دار تو ہم ہی تھے کیونکہ ہمارے قومی مفادات پر جب کاری ضرب لگ رہی تھی تو ہمارا حق تھا کہ ہم ڈٹ جاتے۔مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا بلکہ حالات اس سے بھی بدتر ہو گئے۔

پاکستان کا وہ وفد جو ورلڈ بینک یا بھارت سے پانی کی مسئلے پر مذاکرات کر رہا تھا، یہ منسٹری آف انڈسٹریز کے تابع تھا۔اس منسٹری کے ایک سیکرٹری معین الدین نے اپنے کیریئر کا آغاز انڈین سول سروس سے کیا تھا۔یہی شخص دولت کا بھوکا اور صنف نازک کا رسیا تھا۔جب شیخ حمید کو برطرف کیا گیا تو اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کوشش کر کے اپنا نام وفد کے سربراہ کے طور منظور کرا لیا۔اس نے دسمبر 1954ء میں اپنی ذمہ داری سنبھالی۔اس طرح وفد کی سربراہی جو خالصتاً ٹیکنیکل آدمی کے پاس ہونی چاہئے تھی ایک عیاش، ابوالہوس اور شرابی بیورو کریٹ کو منتقل ہو گئی۔یہ پاکستان کی انتہائی بدقسمتی تھی۔معین الدین کے بھارتیوں سے خوشگوار تعلقات تھے اور وہ اس کے لئے شراب وشباب کا انتظام کرتے تھے۔ ورلڈ بینک نے 5 فروری 1954ء کو اپنا منصوبہ پیش کیا۔اس منصوبہ کے تحت تین دریا ستلج، راوی اور بیاس بھارت کو دے دیئے گئے۔اس کے علاوہ دیگر تین دریاؤں کے پانی کے استعمال کا حق بھی بھارت کو دے دیا گیا۔دیگر دریاؤں سے بھارت کو پانی استعمال کرنے کا جو حق دیا گیا اس کی تفصیل یہ ہے۔دریائے سندھ سے ہر سال 70 ہزار ایکڑ فٹ، جہلم سے 4 لاکھ ایکڑ، دریائے چناب سے 2 لاکھ 31 ہزار ایکڑ پانی بغرض آبپاشی استعمال کیا جا سکتا ہے۔اس پانی کی مجموعی تعداد 5 ملین ایکڑ فٹ بنتی ہے جو کہ منگلا ڈیم کے پانی کے برابر ہے۔

## معاہدے کے پاکستانی معیشت پر اثرات

سندھ طاس معاہدے سے ملک کو بے شمار نقصانات ہوئے۔ پاکستان کا تقریباً 170,000 ایکڑ رقبہ بھارت کی سرحد اور بی آر بی نہر کے درمیان واقع ہے۔ بھارت نے سندھ طاس معاہدے (1960ء) کے بعد تقریباً 10 سال مجبوراً مادھو پور اور فیروز پور ہیڈ ورکس سے ان زمینوں کو پانی دیا، اس کے بعد پانی مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔ اس علاقے کا زیر زمین پانی آبپاشی کے لئے اچھا نہیں، اس لئے ٹیوب ویلوں سے آبپاشی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کشش ثقل کے بہاؤ (Gravity Flow) سے اس کی آبپاشی ممکن نہیں۔ مذکورہ بالا بہاؤ سے اس علاقے کی آبپاشی صرف بھارتی نہروں سے ہو سکتی ہے۔ سندھ طاس کا منصوبہ اس اصول پر بنایا گیا تھا کہ پاکستان کی پانی سے محروم شدہ نہروں کے لئے تین مغربی دریاؤں (سندھ، چناب، جہلم) سے گریویٹی فلو سے پانی دیا جائے گا۔ مندرجہ بالا 170,000 ایکڑ کی پانی سے محرومی اس اصول کے منافی ہے۔ اگر اب ان علاقوں سے مرفاع آبپاشی (Lift Irrigation) کے انتظامات کئے جائیں تو ان کا بنیادی خرچہ کروڑوں روپے ہے۔ اصولاً ان اخراجات کی ادائیگی بھارت کے ذمہ ہونی چاہیے تھی۔

متبادل انتظامات کے لئے جو ڈیم اور ہیڈ ورکس بنائے گئے ان کے نیچے آنے والی 260000 ایکڑ زمین کی ہمیشہ کے لئے قربانی دینی پڑی۔ اس زمین سے بے دخل ہونے والے ڈیڑھ لاکھ افراد کو معاوضہ دے کر دوسری جگہ زرعی زمین پر آباد کرنا پڑا۔ اس مقصد کے لئے پاکستان نے 1960ء کی دہائی میں 100 کروڑ روپے خرچ کئے دوسرا نقصان یہ ہوا کہ پاکستان اس زمین کی زرعی پیداوار سے محروم ہو گیا۔ اس نقصان کا تخمینہ 40 لاکھ ملین من گندم کا ہے۔ ان سارے نقصانات اور اخراجات کا بوجھ پاکستان پر ہے۔

## کالاباغ ڈیم کی مخالفت پاکستانی بقاء کی مخالفت

ایک دفعہ مسلم لیگ ن کے سینٹر جعفر اقبال نے سینٹ میں بیان دیا کہ "بھارت کالا باغ ڈیم کی تعمیر روکنے کے لیے سالانہ 12 ارب روپے خرچ کر رہا ہے۔" اس پر پیپلز پارٹی اور

اے این پی کے ارکان نے بہت شور مچایا اور ایوان میں جعفر اقبال کا مائیک بند کرنا پڑا۔ بیگم نسیم ولی خان نے کہا "امریکہ نے کالا باغ ڈیم کی مخالفت کرنے کے لیے مجھے ایک کروڑ ڈالر کی پیشکش کی، میں نے ٹھکرا دی"۔ اعظم ہوتی نے کہا "اسفند یار ولی نے امریکہ سے 3 ارب ڈالر لیکر پختونوں کے مفادات کا سودا کیا۔" کیا یہ کالا باغ ڈیم کے لیے ہوا یا پختونستان کے لیے۔ یہ ہمارے بعض سیاسی قائدین کی حالت زار ہے۔ آبی ماہر محمد سلیمان خان لکھتے ہیں کہ "کشن گنگا ڈیم اور پھر وولر ڈیم کے بعد پنجاب کی وادی کو بنجر بنانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ اپنے دریاؤں کے پانیوں کی حفاظت اور کالا باغ ڈیم کی تعمیر ملکی سلامتی کے چند سلگتے ہوئے مسائل ہیں۔

اللہ رب العزت نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا اور ہر زندہ چیز اپنی بقاء اور تسلسل کیلئے پانی کی محتاج ہے جبکہ روز افزوں ضروریات کیلئے درکار پانی کی مقدار میں مسلسل کمی آرہی ہے۔ دنیا بھر کے ممالک اپنے آبی وسائل کو ترقی دینے اور ان میں اضافے کیلئے اقدامات کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ پاکستان کو قدرت نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح وافر آبی وسائل سے بھی نوازا ہے، بلند و بالا پہاڑوں پر سردیوں میں پڑنے والی بارشوں کا پانی جھرنوں، آبشاروں، ندیوں اور نالوں سے ہوتا ہوا دریاؤں کا روپ دھارتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ ملکی معیشت میں زراعت کی کلیدی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں، ملک کا 35 بلین ایکڑ رقبہ نہروں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعے سیراب ہوتا ہے۔ 1947ء سے 1976ء کے دوران نہروں کے ذریعے دستیاب پانی کی مقدار 67 ملین ایکڑ فٹ سے بڑھ کر 106 ملین ایکڑ فٹ تک پہنچ گئی پانی کی مقدار میں مذکورہ اضافہ منگلا، تربیلا اور چشمہ کے آبی ذخیروں کی تعمیر سے ممکن بنایا جاسکا۔ 1976ء کے بعد سے اب تک نہری پانی کی دستیابی میں مزید اضافہ نہیں ہوسکا پانی کی موجودہ مقدار تین فیصد سالانہ کے تناسب سے بڑھتی ہوئی ملکی آبادی کی ضروریات کیلئے کافی نہیں، دوسری جانب تربیلا، منگلا اور چشمہ کے آبی ذخیروں میں پانی محفوظ کرنے کی گنجائش میں 2012ء تک 5.58 ملین ایکڑ فٹ کی واقع ہوچکی تھی۔

پاکستان کی آبادی میں مسلسل اضافہ اور آبی وسائل میں متواتر کمی آرہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ 1951ء میں 5650 مکعب میٹر فی کس پانی دستیاب تھا جو 2012 میں کم

ہو کر 1145 مکعب فی کس رہ گیا۔ پانی کی شدید قلت کے شکار ممالک میں شامل ہونے سے بچنے کیلئے کم از کم ایک ہزار مکعب میٹر فی کس پانی کی دستیابی ضروری ہے پانی میں کمی کی یہی صورتحال رہی تو 2014ء میں پاکستان کو پانی کی شدید قلت کا سامنا ہوگا۔ شعبہ آب میں سرمایہ کاری کی منصوبہ بندی کے مطالعات کے مطابق پاکستان کو 13-2012 کے دوران بارہ ملین ٹن غلہ کی قلت کا سامنا تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ 2014 میں زیادہ سے زیادہ نئی اراضی کو زیر کاشت لایا جائے، اگر آبپاشی کیلئے ضروری وسائل مہیا ہوں تو مزید 22.5 ملین ایکڑ اراضی کو زیر کاشت لا کر غذائی قلت سے نمٹا جا سکتا ہے۔ ایک طرف آبی وسائل کی کمی کے نتیجے میں ہماری فصلوں کی پیداوار میں کمی آ رہی ہے تو دوسری تھرمل بجلی کے حصول پر اٹھنے والے اخراجات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جس سے زراعت اور صنعت کے شعبوں میں بھی اضافی لاگت کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ دسمبر 2011ء میں ایوان صنعت وتجارت لاہور کا دورہ (جولائی 2012ء) کرنے والے عالمی بنک کے تین رکنی مشن نے نشاندہی کی کہ پاکستان میں صنعتوں کی پیداواری لاگت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ہونے کے باعث غیر ملکی سرمایہ کاری اور مشترکہ منصوبوں کے امکانات کم ہو رہے ہیں۔ یہ صورتحال تقاضا کرتی ہے کہ ہم آبپاشی کی بہترین سہولتوں کے ذریعے اپنی اراضی سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کا حصول ممکن بنائیں اور تھرمل کے مقابلے میں سستی پن بجلی کے ذریعے صنعتی پیداواری لاگت کو کم کریں تاکہ عالمی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں جاری مسابقت میں اپنی جگہ بنا سکیں، مسئلہ آبپاشی کیلئے اضافی پانی کے انتظام کرنے کا ہو یا پن بجلی کے منصوبوں کا، ہر دو مقاصد کیلئے ہمیں بڑے آبی ذخائر کی ضرورت ہے یہی وہ صورتحال ہے۔ جس میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ فوری طور پر ایک بڑا ڈیم تعمیر کیا جائے، بڑے ڈیموں کی تعمیر کا جب بھی ذکر ہوتا ہے فوری طور پر کالاباغ ڈیم کا نام سامنے آتا ہے یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ گزشتہ کم وبیش پانچ عشروں سے اس موضوع پر جاری بحث میں فنی ماہرین نے چاہے ان کا تعلق کسی بھی صوبے یا علاقے سے ہو ہمیشہ یہ بات کہی ہے کہ کالاباغ ڈیم پاکستان کی ترقی وخوشحالی کیلئے نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ کسی بھی دوسرے مجوزہ ڈیم کے مقابلے میں اس کی لاگت کم اور افادیت زیادہ ہے۔ ضلع میانوالی کے شہر کالاباغ کے قریب اس مجوزہ ڈیم پر کام کا آغاز 1953ء میں ہوا جو 1989ء تک کسی نہ کسی شکل میں جاری

رہا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر 36 سال میں جتنا تحقیقی اور فنی کام اس منصوبے پر ہوا ہے، کہیں اور نہیں ہوا، نہ ہی ڈیم کیلئے اس سے بہتر اور کوئی قدرتی جگہ ہو سکتی ہے اس مجوزہ آبی ذخیرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پاکستان کے دوسرے آبی ذخائر کے مقابلے میں اس کی زندگی دراز ہے۔ تربیلا اور منگلا کی زندگی اس لئے محدود ہے کہ وہاں گاد جمع ہوتی رہتی ہے اور اسے صاف کرنے کا کوئی آسان طریقہ دستیاب نہیں ہے جبکہ دریائے سندھ پر تربیلا سے 210 کلومیٹر زیریں جانب اور جناح بیراج سے 26 کلومیٹر بالائی جانب واقع اس مجوزہ منصوبے کی صورتحال مذکورہ ڈیموں سے مختلف ہوگی، اس کا مقام جغرافیائی اعتبار سے ایسا ہے کہ وہاں ریت جمع نہ ہو سکے گی اس کے گیٹ دریا کی سطح سے نیچے رکھے گئے ہیں، جونہی گاد آئے گی، بہہ کر آگے نکل جائے گی۔ ڈیم ٹیکنالوجی پر اتھارٹی کا درجہ رکھنے والے چینی ماہر ڈاکٹر زنگ لیان ژن کے علاوہ ڈاکٹر جان کینیڈی (امریکہ) ڈاکٹر ڈبلیو روؤنی وائٹ (انگلستان) نے بھی کالا باغ ڈیم کو نہایت موزوں قرار دیا۔ کالاباغ ڈیم سے آبپاشی بجلی کی پیداوار اور سیلاب سے بچاؤ کے طور پر 60 ارب روپے سالانہ کا فائدہ ہوگا۔ ڈیم سے سالانہ 6.1 ملین ایکڑ فٹ پانی آبپاشی کیلئے دستیاب ہوگا جس سے ربیع کی فصلوں کو اکتوبر اور مارچ کے دوران اور خریف کی فصلوں مثلاً کپاس، گنا اور چاول کیلئے اپریل اور مئی کے دوران وافر مقدار میں پانی فراہم ہو سکے گا جس سے ساڑھے 12 ارب روپے کا فائدہ ہوگا۔ کالاباغ ڈیم سے سالانہ 11 ہزار 400 ملین یونٹ بجلی پیدا ہوگی کالاباغ ڈیم اور تربیلا ڈیم کو ایک ساتھ چلانے کے نتیجے میں تربیلا کی موجودہ پیداواری صلاحیت کے مقابلے میں 336 ملین یونٹ زیادہ بجلی موجودہ پیداواری سہولت سے ہی حاصل ہوگی محتاط اندازے کے مطابق بجلی کی پیداوار سے 46 ارب روپے کا فائدہ ہوگا اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ کالاباغ ڈیم سے حاصل ہونیوالی بجلی کی بدولت تھرمل بجلی پر انحصار کم ہوگا جس سے تیل کی درآمد پر خرچ ہونے والے قومی زرمبادلہ کے اخراجات میں کمی آئے گی۔ کالاباغ ڈیم کی تعمیر سے زیریں علاقوں کے سیلاب کے نقصانات اور خطرات میں کمی آئے گی جس سے سالانہ ایک عرب 50 کروڑ روپے فائدہ کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ کالاباغ ڈیم سے وافر پانی کی دستیابی سے چاروں صوبوں کی زرعی پیداوار بڑھے گی اضافی پانی کی فراہمی کے باعث صوبہ سندھ میں 8 لاکھ ایکڑ، صوبہ خیبر پختونخواہ

میں 4.4 لاکھ ایکڑ پنجاب میں 6.8 لاکھ ایکڑ اور بلوچستان میں 5.1 لاکھ ایکڑ اراضی کو فائدہ ہوگا۔ حتمی تکمیل کے بعد کالاباغ ڈیم سے 3600 میگاواٹ بجلی میسر ہوگی جو کہ اس وقت کی زیادہ سے زیادہ ضرورت کا بیس فیصد حصہ ہوگی جس سے ہائیڈل اور تھرمل کا تناسب بہتر بنانے کے علاوہ بجلی کی قیمتیں کم کرنے میں بھی مدد ملے گی اس طرح انقلاب اور تمام اشیائے خوراک میں خود انحصاری کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔ علاوہ ازیں سندھ میں موسم سرما اور غیر معمولی حالات میں پانی کی کمی کا مسئلہ ختم ہو جائیگا اور سیلاب پر قابو پایا جاسکے گا جو کہ سندھ میں 2012ء کے ہولناک سیلاب کی طرح ہر سال تباہی کا موجب بنتا ہے اسی طرح توانائی کی کمی کو پورا کرنے کیلئے اب تک جتنے بھی منصوبے ہیں یا زیر غور ہیں ان میں کالاباغ ڈیم ایسا منصوبہ ہے جس کی تیار شدہ بجلی کی لاگت سب سے کم ہوگی، اگر یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے کہ سوئی گیس کے ذخائر کم ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں سوئی گیس اور سی این جی کی لوڈشیڈنگ کی تکلیف دہ نوبت آچکی ہے تیل کی قیمتوں میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے تو سستی پن بجلی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ان حالات میں آبی ذخائر کی ذخیرہ گنجائش میں ہونے والی کمی کے ازالے بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے اور زراعت کو تباہی سے بچانے کیلئے کالاباغ ڈیم کی تعمیر ضروری ہے۔ انجینئر شاہ نواز خان اور انجینئر شمس الملک جیسے بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین اور واپڈا کے سابق چیئرمین (حسن اتفاق کہ ان دونوں کا تعلق صوبہ خیبر پختونخواہ سے ہے) سمیت لاتعداد ماہرین نے اس ڈیم کی افادیت اور اہمیت سے کبھی انکار کیا نہ اس کی مخالفت کی، بلکہ ان میں سے اکثر ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جب ان پر کوئی حکومتی دباؤ نہیں ہے کالاباغ ڈیم منصوبے کی حمایت کررہے ہیں۔ تاہم یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ امریکہ اور بھارت کالاباغ ڈیم کی تعمیر روکنے کیلئے سازشوں میں مصروف عمل ہیں اور انہیں ہمارے چند پاکستانیوں کی معاونت بھی حاصل ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف تینوں صاحبان کلی اختیارات رکھنے کے باوجود کالاباغ ڈیم نہ بنا سکے۔ جب بھی کالاباغ ڈیم کی تعمیر کیلئے کوئی آواز اٹھتی ہے تو چاروں طرف سے طوفان بدتمیزی پیدا ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کبھی کسی حکومت یا خفیہ ایجنسیوں نے اس منفی سوچ کے عوامل جاننے کی ضرورت محسوس کی

کہ کالا باغ ڈیم کی تکمیل کیخلاف کون پاکستان میں لابی کرتا ہے کالا باغ ڈیم نہیں بنتا تو اس کا فائدہ سب سے زیادہ کن پاکستانی لیڈروں اور غیر ممالک کو ہوگا اور اگر غیر ممالک یا ہمسایہ ملک بھارت کی طرف سے کالا باغ ڈیم کے خلاف آواز اٹھائے جانے پر فنڈنگ کی جاتی ہے تو کن ذرائع سے یہ رقوم مخالفین کالا باغ ڈیم تک پہنچائی جاتی ہے۔ چند سالوں سے محب وطن پاکستانیوں کی جانب سے یہ کہا جارہا ہے کہ بھارت ہر سال 15 ارب روپے سے زائد رقوم کالا باغ ڈیم مخالفین پر خرچ کرتا ہے اس الزام میں کتنے فیصد سچائی ہے اس کا کھوج تو خفیہ ایجنسیاں ہی لگا سکتی ہیں۔ جبکہ دوسری جانب بھارت کی طرف سے مسلسل سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزیاں کی جارہی ہیں۔ بھارت کی پریس کونسل آف انڈیا کے صدر جو کہ ریٹائرڈ جسٹس ہیں انہوں نے گزشتہ دنوں ایک سیمینار میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "وہ انڈیا اور پاکستان کی تقسیم کو نہیں مانتے اور نہ ہی انہوں نے آج تک اس تقسیم کو دل سے قبول کیا ہے"۔

## سانحہ مشرقی پاکستان اور امریکی کردار

سی۔ آئی۔ اے کی خفیہ دستاویز کا انکشاف اس وقت ہوا جب مولانا بھاشانی جو (دسمبر 1971) اس وقت اپنے دیہی مکان سنتوش میں مقیم تھے فسادات کی خبر سن کر وہ فوراً ڈھاکہ پہنچے تھے اور ڈھاکہ کی پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فساد کو غیر ملکی سازش قرار دیتے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ سی آئی اے نے مشرقی پاکستان میں ہنگامہ وفساد کرانے کے لئے ایک خفیہ منصوبہ تیار کیا تھا۔

ایسٹرن ٹریبون کے سیاسی مبصر نے کہا تھا کہ سی آئی اے نے اس دستاویز کا مسودہ 1966`67ء میں تیار کیا تھا۔ اس شرمناک دستاویز میں وسیع پیمانے پر فرقہ ورانہ فسادات کے لئے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کے ذریعے مشرقی پاکستان میں نظم وضبط کو مکمل طور پر تہ وبالا کرنا تھا۔ اس دستاویز میں ترقی پسند قوتوں کا قلع قمع کرنے کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ ترقی پسند قوتیں "آزاد کشمیر پاکستان" کے نظریہ کی راہ میں مزاحم ہوسکتی تھیں۔

## منصوبے کے خدوخال

دستاویز میں مشرقی پاکستان کی آزادی کے اعلان کے لئے یکم اگست 1969ء کی تاریخ مقرر کی گئی تھی اور اس کے لئے مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق رات کے ایک بجے اعلان کیا جانے والا تھا۔ دستاویزات کے مطابق ''مشرقی پاکستان'' کے اعلان کے فوراً بعد تین ہمسایہ ممالک اور ایک بڑی طاقت اس نئی ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں گی۔ آزادی کے اعلان کے چند گھنٹے بعد ایک دوست ملک کی چھاتہ بردار فوج مشرقی پاکستان میں اترے گی جو اس نئی ریاست کو بحری اور فضائی تحفظ دے گی۔ مزید یہ کہ نئی ریاست کے لیے بڑی طاقت کی بحری فوج بحیرہ عرب اور خلیج بنگال میں پہنچ چکی ہو گی۔

اصل میں اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں ایک گروہ کے ذریعے آزادی کے اعلان اور نظم و نسق کو درہم برہم کر کے ایوب حکومت کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس صورت حال کو یقینی بنانے کیلئے بھارت مغربی پاکستان کی سرحدوں پر چھوٹے پیمانے پر جنگ شروع کر دے گا اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں چند قبائل حکومت کے خلاف مسلح تحریک شروع کر دیں گے۔

## جرمن منصوبہ

سی آئی اے کی یہ دستاویز اس سابقہ دستاویز کی طرح ہے جسے مغربی جرمنی کی ایک فیچر ایجنسی نے تیار کرایا تھا۔ یہ ایجنسی بھی سی آئی اے کی مالی امداد سے چلتی ہے۔ اس سابقہ دستاویز کے مطابق سکم، بھوٹان، تری پور، آسام، مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال پر مشتمل ایک نئی ریاست کی تشکیل کرنا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ کی جنگی پالیسی کے مطابق مشرقی پاکستان کا انتخاب کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اول تو یہ کہ اس طرح بحیرہ عرب، خلیج بنگال اور سب سے بڑھ کر بحر ہند پر قبضہ رکھنے میں آسانی ہو گی اور دوم یہ کہ چین کے گرد حصار قائم کیا جائے گا۔

غیر ملکی طاقتوں نے مختلف مواقع پر یہ دلائل پیش کئے تھے کہ اس قسم کے منصوبے پر

عمل درآمد ممکن ہے۔ وہ درحقیقت مشرقی پاکستان کو دوسرا ویت نام بنانا چاہتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت کو اشتراکیت سے بچانے کے لئے ان اقدام میں دلچسپی لینی شروع کی تھی تاکہ ''ہندوستان کے سیاسی مسائل کا کوئی ''فیڈرل'' حل نکل آئے گا'' چنانچہ صدر روز ویلٹ کی خواہش کے مطابق 1964ء میں امریکہ کے نامزد نائب صدر سینیٹر ہمفرے نے یہ اعلان کیا تھا کہ

''امریکہ کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ آخر کار جنوب مشرقی ایشیاء میں کیمونزم کے دفاع کی ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ ایشیائی طاقتوں کا متحدہ محاذ قائم ہو جس میں بھارت کو مرکزی قوت حاصل ہو۔''

اب جب کہ مغربی بنگال میں بائیں بازو کی طاقتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اور مشرقی پاکستان میں بھی ترقی پسند قوتوں کو فروغ حاصل ہو رہا تھا، مفاد پرست حلقے اس صورت حال سے سخت خوف زدہ تھے۔ وہ بھارت اور مشرقی پاکستان کو کیمونزم کے خطرات سے بچانے کے لئے مشرقی پاکستان کے معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتے تھے۔ یہاں پر بنگال لبریشن فرنٹ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ تنظیم مغربی بنگال میں اس وقت قائم ہوئی تھی جب مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر جتوتی باسو تھے، جن کا تعلق چین نواز کیمونسٹ پارٹی سے تھا۔ اس تنظیم نے مسٹر باسو کو دھمکی دی تھی کہ تم بنگال لبریشن فرنٹ کے رضاکاروں کے ساتھ قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اس تنظیم نے مسٹر باسو کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ ہمارا مقصد مغربی بنگال اور مشرقی پاکستان کو ملا کر متحدہ بنگال قائم کرنا ہے۔ کھلنا کے اخبار ''دی ویو'' کے انکشافات کے مطابق ایک امریکی خاتون مس جین ڈکسن نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ مشرقی پاکستان میں 1969ء کے نومبر دسمبر میں دس لاکھ افراد مارے جائیں گے۔ اس امریکی خاتون نے اس قسم کی پیشین گوئی انڈونیشیا کے بارے میں بھی کی تھی جہاں یہ بات درست ثابت ہوئی۔ مس جین ڈکسن کے بارے میں یہ بات ساری دنیا میں مشہور ہے کہ وہ سی آئی اے کی ایک اہم رکن تھی اور سی آئی اے کے منصوبوں کو پیشین گوئی کی صورت میں ظاہر کرتی تھی۔

نومبر 1969 میں جب ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو یکم نومبر کی صبح ایک امریکی صحافی کی ملاقات ایک مقامی پاکستانی صحافی سے ہوگئی۔ پاکستانی صحافی کو معلوم ہوا کہ

امریکی صحافی کو ڈھاکہ میں کسی بڑی خبر کا انتظار ہے۔ امریکی صحافی نے بتایا کہ وہ نائیجریا میں خانہ جنگی کی رپورٹنگ کرتا رہا ہے۔ چند روز قبل اسے ہیڈ کوارٹر سے ہدایت دی گئی ہے کہ وہ فوراً مشرقی پاکستان جائے جہاں ایک بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ اسی دن ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس فساد کے بعد ہی سی آئی اے کی اس دستاویز کے بارے میں مولانا بھاشانی نے انکشاف کیا تھا۔

اس دستاویز کی تفصیلات مکمل طور پر منظر عام پر نہیں آئی تھیں لیکن جن حصوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سی آئی اے مشرقی پاکستان میں کتنے خطرناک منصوبے پر عمل کرنا چاہتی تھی۔ پوری تفصیلات کا علم تو مولانا بھاشانی یا مسٹر طہ کو ہی تھا یا پھر حکومت کو، البتہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس دستاویز کے اہم حصے سربستہ راز ہی رہے۔

## منصوبے کی تفصیلات

یکم نومبر 1969ء کا ذکر ہے۔ ڈھاکہ کی فضا جزوی ہڑتال کے باعث صبح ہی سے کسی قدر مکدر تھی۔ لیکن ایسی کوئی علامت ظاہر نہ تھی جس سے آنے والے خونریز ہنگاموں کا سراغ ملتا۔ اچانک گیارہ بجے کے قریب میرپور کے علاقے میں بنگالیوں اور مہاجرین کے درمیان فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ ٹھیک اسی وقت شاہجہان آباد میں بھی فسادات کا آغاز اور عین گیارہ بجے ایسی دوسری بستیوں میں بھی فسادات برپا ہو گئے جہاں بنگالیوں اور مہاجرین کی ملی جلی آبادی تھی۔ قرائن بتاتے ہیں کہ یہ فسادات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک مقررہ وقت پر شروع کیے گئے۔ شام تک لوٹ مار، خنجر زنی آتشزنی اور مسلح تصادم کی وارداتیں ہوتی رہیں لیکن کسی نہ کسی طرح اسی روز فسادات پر قابو پالیا گیا۔ اس میں پولیس اور انتظامیہ کی کارکردگی سے زیادہ عوام کے سیاسی شعور کا دخل تھا جو آپس کے اس خون خرابے کیخلاف تھے۔ اس طرح یہ خونی ہنگامے ڈھاکہ کی چند بستیوں تک محدود رہے اور مشرقی پاکستان کے دوسرے شہروں تک نہ پھیل سکے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ مولانا عبدالحمید بھاشانی اپنی دیہی قیام گاہ سنتوش سے فوراً ڈھاکہ پہنچے۔ اس روز پریس کلب میں انہوں نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔ فسادات کی مذمت کی۔ بنگالیوں اور مہاجرین کو مل کر رہنے اور اپنے مشترکہ مفادات کے لئے متحدہ

جدوجہد کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے فسادات کا پس منظر بتاتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ امریکہ کے رسوائے عالم محکمہ جاسوسی سی آئی اے نے مشرقی پاکستان میں اس قسم کے فسادات کرانے کے لئے ایک خفیہ منصوبہ تیار کیا ہے۔

مولانا بھاشانی نے بعد میں یہ بھی انکشاف کیا کہ سی آئی اے کی یہ خفیہ دستاویز ان کے قبضے میں آگئی ہے اور اس کی نقلیں وہ صوبائی گورنر اور صدر مملکت کو ضروری کارروائی کے لئے ارسال کر چکے ہیں۔ مولانا بھاشانی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس دستاویز کو سنتوٹ کانفرنس کے موقع پر عوام کے روبرو پیش کریں گے تاکہ وہ آنے والے خطرات سے نہ صرف باخبر ہو جائیں بلکہ ان کا مقابلہ کرنے کیلئے خود کو تیار رکھیں۔ مگر یہ خفیہ دستاویز عوام کے سامنے نہ آسکی۔ اس کوتاہی کا الزام مولانا بھاشانی نے نیشنل عوامی پارٹی کے سابق جنرل سیکٹری جناب محمد طٰہ پر عائد کیا کہ وہ وقت پر اس کی اشاعت کا بندوبست نہ کر سکے۔ جناب طٰہ نے نہ صرف اس الزام کی تردید کی بلکہ موثر طور پر اپنی صفائی بھی پیش کی سنا ہے سنتوش کانفرنس میں سی آئی اے کی خفیہ دستاویز کی کچھ اسٹیکلو اسٹائل نقلیں تقسیم بھی کرائی گئیں مگر اس کی تفصیلات سے عوام پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے۔

آخر یہ دستاویز تھی کیا؟ اگر اس کی صحت پر یقین کر لیا جائے تو بلاشبہ یہ ایک خطرناک منصوبہ تھا۔ یہ نہ صرف مشرقی پاکستان کو ملک سے علیحدہ کرانے بلکہ پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کی ایک ہولناک سازش تھی یہاں اس طویل خفیہ دستاویز کے وہ اہم اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں جن سے سی آئی اے کی سازش کے خطرناک نتائج کا بخوبی اندارہ لگایا جاسکتا ہے۔

"مذہب کے نام پر ملا عوام کو اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بنگال (مشرقی پاکستان) میں مذہب عوام کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ وہ دیوانگی کی حد تک مذہب کے پرستار اور شیدائی ہیں۔ لہٰذا اپنی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے ہمارے آدمیوں کو لازم ہے کہ وہ مذہب کی باہمیت کو محسوس کریں اور مذہبی جذبات کو زیادہ بھڑکائیں۔

طلباء کے بارے میں کیا کیا جائے؟ ان میں زیادہ تر شدت کے ساتھ علیحدگی کے حامی ہیں۔ تعلیم نے ان میں جمہوری اور قوم پرستانہ جذبات سرایت کر دیئے ہیں۔ سب سے

پہلے انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں (مغربی پاکستان) کے تسلط کی چبھن کو محسوس کیا ہے اکے ذہنوں میں مساوی مواقع کا تصور قطعی مبہم ہے وہ جانتے ہیں کہ زندگی میں ترقی کے دروازے بیشتر حالات میں ان پر بند کردیئے گئے ہیں وہ اپنی اس بے چینی اور ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لئے جلوسوں اور مظاہروں کی شکلوں میں سڑکوں پر نکل آئے ہیں لیکن آخری تحریر میں وہ ایک ایسی معمولی اقلیت ہیں جسے آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جاسکتا ہے انہیں رشوت دی گئی ہے فلموں کے ذریعے ملک کے دوسرے بازو (مغربی پاکستان) کے بارے میں طرح طرح کے سہانے خواب دکھائے گئے ہیں اس طرح ان کے ذہنوں کو مسخر کرلیا گیا ہے ان سے قوت ارادی چھین لی گئی ہے ان کی یہ خود اعتمادی ختم کردی گئی ہے کہ بنگالی طلباء علیحدگی کے حق میں ہیں۔

پھر آزادی کس طرح حاصل کی جائے؟ اس نصب العین کو محتاط منصوبہ بندی کے بعد طویل اور شدید جدوجہد، بے غرض لگن دوستانہ بیرونی امداد اور اعلیٰ قیادت کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے سیاسی اقلیت کو مکمل طور پر منظم کیا جائے اور ثقافت کو متاثر کیا جائے۔ مسلح افواج میں جو بنگالی ہیں (جن کے ذہنوں کی صفائی ہوچکی ہے) انہیں اعتماد میں لیا جائے اور دوستانہ بیرونی امداد کو مناسب طور پر کام میں لایا جائے

عوام کو تیار کرنے کیلئے ان میں کس طرح شعور پیدا کیا جاسکتا ہے؟ اس مقصد کے لئے سیاسی پروپیگنڈہ کرنے والوں کو عوام کے درمیان پھیلایا جائے بنگالیوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ ان کی کاروائی کا بنیادی نقطہ فسادات اور وسیع پیمانے پر انتشار پھیلانا ہے عوام میں نفرت اور ہیجان پھیلانا ہے انہیں سب سے پہلے یہ محسوس کرایا جائے کہ وہ بندوقوں گولیوں اور خنجروں کے ذریعے ہی اپنا انتقام لے سکتے ہیں اس کارروائی میں مخالف اور سرکاری سیاسی جماعتوں کو نظر انداز کردیا جائے۔ اقلیتوں کو منظم کیا جائے واضح رہے کہ اسلحہ ایک بنیادی ضرورت ہے ایک مختصر اور وفادار فوج لازمی طور پر تیار کی جائے نئی اور نوجوان قیادت ابھرنی چاہئے ہر ادارے اور ہر تنظیم میں حکمت عملی کے اعتبار سے ہر اہم شعبے میں اثر ورسوخ پیدا کیا جائے ایک تیر سے دو شکار کئے جانے کا امکان ہے یعنی کمیونسٹوں کو غیر بنگالیوں کے ایجنٹ

کی حیثیت سے شہرت دی جائے اور بغاوت کے ذریعے ان کا صفایا کر دیا جائے۔

لیکن علیحدگی کے فیصلہ کن عمل پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کام کرنا چاہیے ہر کارروائی ہر اقدام پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہونا چاہیے بین الاقوامی امداد قطعی اور یقینی ہے امریکہ اس موقع پر بھارت انڈونیشیا برما اور افغانستان کے ساتھ بھر پور تعاون کرے گا۔

اشتراک عمل سب سے اہم اور بنیادی حقیقت ہے ہمیں اب اس کے لئے تاریخ کا تعین کرنا چاہئے جو یکم اور 31 کے درمیان اگست کی کوئی بھی تاریخ ہو سکتی ہے آزادی کی تحریک پوری طرح منظم ہو چکی ہے نئے رہنما ابھرنے کے منتظر ہیں اسلحہ اور ہتھیار تیار ہیں منصوبے کو آخری شکل دی جا چکی ہے افغانستان اور مغربی پاکستان کے درمیان سرحدی جھگڑے شروع ہو چکے ہیں سرحد کے قبائل میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے پاکستان اور بھارت کشمیر کے مسئلہ پر ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہیں۔

پاکستان ''بھارت پر حملہ آور'' ہوتا ہے (یہ حملہ دوسری جانب سے کیا جائے گا) بھارت جارحیت کو ختم کرنے کے لئے تیار ہوگا ہندوستانی فوجوں نے مغربی پاکستان کے لئے سخت مشکلات پیدا کر دی ہوں گی اور افغانستان بھی تر و تازہ ہو کر میدان میں آچکا ہوگا یہ 9 گست 1969ء کی تاریخ ہوگی اس سے مغربی پاکستان کیلئے صورت حال نہایت مشکل ہوگی لیکن بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا مشرقی پاکستان میں فسادات دہشت گردی اغوا لوٹ مار اور عام انتشار کا دور دورہ ہوگا۔

سی آئی اے کے منصوبے کے مطابق یہ تھے پاکستان کے وہ سماجی اور سیاسی حالات اور بین الاقوامی رشتے جن کے پس منظر میں مشرقی پاکستان کو ملک سے علیحدہ کر کے ایک آزار مملکت کے قیام کی سازش تیار کی گئی۔ جن میں ملک دشمن قوتوں کی سرپرستی اور رہنمائی کے فرائض امریکہ خفیہ طور پر انجام دے رہا تھا۔ یہ سازش کمال ہوشیاری اور محتاط طریقے سے تیار کی گئی تھی تاکہ اصل دشمن کا سراغ بہت بعد میں ملتا اور اس وقت نجانے کتنی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوتیں اور حالات کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ اس کا اندازہ سازش کے ٹائم ٹیبل سے ہوتا ہے جس کی تفصیلات سی آئی اے کے منصوبے میں پیش کی گئی تھیں۔

سی آئی اے کے اس خطرناک منصوبے کے بارے میں جو اطلاعات فراہم ہو سکیں،

ان کے مطابق اس سازش پر ستمبر 1965ء کی جنگ کے کچھ ہی عرصہ بعد کام شروع کر دیا گیا تھا۔1966ء کے وسط میں اس کی ترتیب ابتدائی مرحلے میں داخل ہوئی۔سیاسی اور سماجی حالات کا تجزیہ کیا گیا۔خفیہ ملاقاتوں کے ذریعے مختلف طبقوں کے نمائندوں سے تبادلہ خیال کیا گیا۔ان کا ردعمل معلوم کیا گیا اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔اس طرح جب ضروری معلومات اکٹھی ہوگئیں تو سی آئی اے کے ماہرین نے ان کی روشنی میں منصوبے کا خاکہ تیار کیا۔اس کی تفصیلات مرتب کیں اور بالآخر اسے 1967ء میں مکمل کر لیا گیا۔

اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 9 اگست 1969ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ 9 اگست کی تاریخ غالباً اس لئے طے کی گئی تھی کہ پروگرام کے مطابق سازش چند روز میں مکمل ہو جائے گی اور پاکستان کے یوم استقلال یعنی 14 اگست کو مشرقی بنگال کی خودمختار مملکت کا جشن منایا جائے تاکہ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہو کہ عوام اس میں زیادہ جوش وخروش سے حصہ لے سکیں اور پاکستان کے قیام کی تاریخ کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی بھی برقرار رہے۔1969ء کے انتخاب کا جواز بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ دو سال کا عرصہ سیاسی فضا تیار کرنے کے علاوہ ایجنٹوں کی ترتیب اور دوسرے اہم امور کی تکمیل کے لئے رکھا گیا تھا۔

لیکن یہ سازش مقررہ وقت پر نتائج حاصل نہ کر سکی۔اس لئے کہ نومبر 1968ء میں ملک گیر عوامی تحریک ابھری اور اس نے سیاسی حالات یک لخت بدل دیئے۔حالات کی تبدیلی کا یہ عمل اس قدر تیز رفتار اور اچانک ہوا جس کیا اندازہ خود سی آئی اے کو بھی نہ تھا۔ مارچ 1969ء میں ایوب خان کی حکومت ختم ہوگئی۔ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا اور سی آئی اے کا سارا منصوبہ منتشر ہو گیا۔یہاں یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ سی آئی اے نے اپنے پلان کو عملی جامہ پہنانے کی تاریخ آگے بڑھا دی یا فی الوقت اسے ملتوی کر دیا تھا۔ایسی صورت میں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یکم نومبر 1969ء کو بنگالیوں اور مہاجرین کے درمیان جو فسادات برپا کرانے کے لئے سی آئی اے نے اگست کا مہینہ منتخب کیا تھا،اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس دور کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان دنوں مشرقی پاکستان کی مقامی اور مہاجر آبادی کے درمیان شدید کشیدگی پائی جاتی تھی اور یہ نفرت اور کشیدگی سی آئی اے نے اپنی سازش کو کامیاب بنانے کے لئے پیدا کی تھی۔جس کا

اظہار اس کے منصوبے میں بار بار کیا گیا ہے۔

سی آئی اے کے اس خفیہ منصوبے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مقصد مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کر کے ایک ایسی خودمختار مملکت قائم کرنا تھا جو بھارت کے زیر اثر ہو اور جس کی علیحدگی کے بعد مغربی پاکستان تنہا اور کمزور رہ جائے تا کہ اس پر ایک طرف افغانستان اور دوسری طرف سے بھارت حملہ آور ہو کر قابض ہو جائے اس طرح پاکستان کا وجود ختم ہو جائے گا۔ وہ اکھنڈ بھارت کا ایک بار پھر اٹوٹ انگ بن جائے۔ یہیں سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ستمبر 1965ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا تو ایک غیر ملکی خبر ایجنسی نے یہ انکشاف کیا تھا کہ یہ حملہ سی آئی اے کی تحریک پر بھارت نے کیا ہے اس جنگ میں بھارت کو منہ کی کھانی پڑی اور سی آئی اے کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ ایک حصے میں اس وقت کے پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی صورتحال پر بحث کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا یوں جواز پیش کیا گیا۔

''مشرقی بنگال کی آزادی کے بارے میں آج بازاروں میں، گلی کوچوں میں، شاندار بنگلوں والے علاقوں میں اور عالی شان ہوٹلوں میں موضوع گفتگو ہے کہ ہم علیحدگی کیوں چاہتے ہیں؟ علیحدگی سے کس کو فائدہ پہنچے گا؟ اس تحریک کے خلاف کون ہے اور اس کے حق میں کون ہے؟ اور یہ کہ علیحدگی کس طرح حاصل کی جائے؟ وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ حالات میں مشرقی بنگال کو مغربی پاکستان کی نوآبادی کہنا جائز کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہر شعبہ میں عدم مساوات ہے اور ہر میدان میں بے انصافی پائی جاتی ہے۔ شہری اور فوجی ملازمتوں میں بنگالیوں کے لئے مساوی مواقع کا کوئی وجود نہیں۔ اقتصادی آزادی سے قطع نظر نہ اظہار خیال کی آزادی ہے، نہ آزادی فکر ہے نہ آزادی تحریر و تقریر ہے۔ مشرقی بنگال کی دولت کو چرا لیا گیا۔ عوام کی کمر توڑ دی گئی ہے اور سرمائے کی منتقلی (مغربی پاکستان کو) بے حساب ہے۔ عوام اپنی شخصیت اور وجود کو بھولتے جا رہے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی ختم ہو چکی ہے۔ قوت اظہار جواب دے چکی ہے۔ اہلیان بنگال کو غیر بنگالیوں کے قدموں میں ڈال دیا گیا ہے۔ ان حالات میں صرف کمیونسٹ ہی قدم جما سکتے ہیں۔ ان کے ہر آن بڑھتے ہوئے اثر کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک بنگال کے موجودہ مسائل جلد از جلد حل نہ ہو جائیں۔

اس وقت مشرقی بنگال' مغربی پاکستان اور غیر بنگال صنعت کاروں کے لئے جنت کی طرح ہے۔ یہاں سے وہ بے دریغ دولت کماتے ہیں مگر ستم یہ ہے کہ اسے خرچ کہیں اور کیا جاتا ہے۔ یہ بڑھتی ہوئی اقتصادی خلیج صرف ایک ہی منزل کی جانب لے جاتی ہے اور وہ منزل ہے کمیونزم۔ کمیونسٹ مشرقی بنگال کی اس صورت حال سے پوری طرح باخبر ہیں اور ان حالات سے خوش بھی ہیں۔ انتشار' بے چینی اور فاقہ کشی ہمیشہ ان کے لئے مددگار ثابت ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں آگے بڑھ کر حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کمیونسٹ ایوب کی آمرانہ حکومت اور مغربی پاکستان کے تسلط کے حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماؤ کے تمام ماننے والے ایوب نواز ہیں۔

مشرقی بنگال کی خود مختاری سے عام لوگوں کو' سرکاری افسروں کو' فوج میں ابھرنے والے نوجوانوں کو چھوٹے تاجروں اور ابھرتے ہوئے بنگالی سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچے گا۔ خود مختاری کے بعد ایشیائی اور غیر ایشیائی ممالک کے اقتصادی تعاون سے اس سرزمین پر خوشحالی لائی جائے گی اور اگر خارجہ پالیسی کو اپنا اقتصادی مفاد پیش نظر رکھ مرتب کیا گیا تو غیر ملکی سرمایہ بھی یہاں لگایا جائے گا۔ نئی صنعتیں قائم کی جائیں گی۔ اس اقتصادی ترقی سے یقینی طور پر عام لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہوگی۔ کسانوں کے لئے اچھے دن آئیں گے۔ تاجروں کے تصرف میں زیادہ سرمایہ ہوگا۔ بنگالی ثقافت پھولے گی۔ ہر بنگالی کو بنگال کی حیثیت سے پہچانا جائے گا۔ بہرنوع اس خود مختاری سے اگر کوئی خسارے میں رہے گا تو وہ صرف غیر بنگالی ہو سکتا ہے۔

## سانحہ مشرقی پاکستان کا پس منظر

70ء کا الیکشن مشرقی پاکستان نے دو تہائی اکثریت سے جیتا تو اقتدار کی منتقلی میں لیت و لعل سے کام لیا گیا۔ نتیجتاً جو کچھ ہوا وہ ایک افسوسناک باب ہے جو کہ ہر سچے مسلمان اور وطن سے محبت کرنے والے کو خون کے آنسو رلا دینے والا ہے۔ درحقیقت یہ ایک بہت بڑا سانحہ والمیہ اور زخم تھا' اس زخم کی شدت کو پوری اسلامی دنیا نے محسوس کیا' اس لئے کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والا ملک صرف پاکستانیوں کا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اسلام کا قلعہ تھا۔ برصغیر کے لوگوں کے دل صرف اسلام کے ساتھ دھڑکتے تھے۔

لیکن غیر مسلموں کی سازشوں کی وجہ سے ہمارے خواب بکھر گئے، پاکستان جو اسلامی دنیا کے اتحاد میں بنیادی کردار ادا کر سکتا تھا وہ دولخت ہو گیا۔

ہمارا دشمن ایک ہے، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا ہے، اس کا مقصد، اس کا مشن اور ان سب کی منزل ایک ہے یعنی مسلمان ملکوں کی شکست و ریخت اور مسلمانوں کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دینا۔ وہ اس مقصد کے حصول کی خاطر اپنے بڑے بڑے تنازعات کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں مثلاً ۷۱ء سانحہ کے موقع پر امریکہ پاکستان کا اتحادی ہونے کے باوجود بھارت کے شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ یہی حالت روس اور اسرائیل کی تھی۔ چین نے بھی عملاً ہمارے لئے کچھ نہ کیا۔

بنگلہ دیش کے 99% مسلمان اردو بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف مغربی پاکستان میں بعض مقتدر لوگوں نے بنگلہ کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا۔ حالانکہ جس طرح اردو پر عربی کی چھاپ ہے۔ اسی طرح بنگلہ پر بھی عربی کی چھاپ ہے۔ تاہم یہ تنازعات ایسے نہ تھے کہ جنہیں افہام و تفہیم سے حل کرنا ممکن نہ تھا۔

یہ کوئی کفر و اسلام کا تنازعہ نہ تھا۔ مگر بد قسمتی کی بات ہے کہ انہیں حل کرنے کی بجائے مزید ہوا دی گئی۔ یہ کھیل عام لوگوں کا نہیں بلکہ حکمرانوں، سیاستدانوں کا کھیل تھا، جس میں بھارت نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ اقتدار کے ایوانوں میں شروع ہونے والے کھیل کے اثرات آہستہ آہستہ عام لوگوں کے ذہنوں میں بھی جاگزین ہوتے چلے گئے اور اوپر کی سطح پر سلگائی جانے والی نفرت کی آگ نچلی سطح پر پہنچ کر شعلوں کی طرح بھڑک اٹھی۔

جب حالات قدرے پرسکون ہوئے تو احساس ہوا......ایک جسم کے دو بازو تھے......جو ٹوٹ گئے۔ ایک جسم کی دو آنکھیں تھیں......جو پھوٹ گئیں۔ ایک جان میں دو قالب تھے......جنہوں نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔ یہ اندھیرے کا سفر تھا......جس میں ہم نور ہدایت سے محروم ہو گئے۔ جسے ہم نے تفاخر سمجھا......وہ زیاں تھا۔ جسے ہم نے فائدہ سمجھا......وہ نقصان تھا۔

سقوط ڈھاکہ کا اصل مجرم امریکہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان نے کبھی پاکستان کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ پاکستان

کو دنیا میں بے توقیر کیا جائے اور اسے آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر قائم نہ رہنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہندوستان نے اپنے تمام ذرائع استعمال کئے اور ہر موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ جب یہ سانحہ ہوا تو ہمیں اس وقت کے سیاسی جغرافیائی اور عسکری حالات کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ اس وقت کے سیاسی حالات یہ تھے کہ ساری دنیا دو حصوں یا بلاکوں میں تقسیم تھی۔ ایک اشتراکی اور ایک سرمایہ داری بلاک' بدقسمتی سے اسلامی دنیا اپنا اسلامی تشخص قائم کرنے کی بجائے ان دو نظاموں میں منقسم تھی' کچھ اسلامی ممالک روس کے ساتھ اور کچھ امریکہ کے ساتھ تھے۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دکھایا کہ یہ دونوں نظام دراصل ایک ہی تھے...... دنیا کی اس سیاسی تقسیم کا اثر ہمارے ملک کی سیاسی و مذہبی جماعتوں پر بھی تھا۔ کچھ کا نعرہ...... ایشاء سرخ ہے۔

پاکستان کو نظریاتی طور پر مستحکم رکھنے کے لئے آئی ایس آئی کی طرز کا کوئی ادارہ نہ تھا۔ افواج میں اطلاعاتی یا انٹیلی جنس کے ادارے تھے وہ سارے اسی پیٹرن پر تھے جو برطانیہ نے قائم کئے تھے۔ اگر کوئی جوان یا افسر ڈسپلن کی خلاف ورزی کرے تو اسے غدار تصور کیا جاتا تھا۔

یہ وہ پاکستان تھا جس کے صدر ایوب خان تھے' ایوب خان کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ان کے ماتحت جرنلوں کی نظریاتی وابستگیاں کس ازم یا کس ملک کے ساتھ ہیں۔

کشمیر میں جب گوریلا کاروائیاں شروع ہوئیں تو ہندوستان نے کھلے عام پاکستان پر حملہ کر دیا' یوں آپریشن جبرالٹر...... 65ء کی جنگ کا سبب بن گیا۔ 65ء کے معرکے نے ہندوستان کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ جنگ کے ذریعے پاکستان کو شکست دینا ممکن نہیں۔ ہندوستان کو ادراک ہوا کہ پاکستان اندرونی طور پر مستحکم' مورال ہائی اور افواج مضبوط ہیں۔ ان چیزوں نے ہندوستان کو اپنا پورا منصوبہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا کہ پاکستان کو میدان میں دوبارہ لانے سے قبل اندر سے غیر مستحکم کر دیا جائے اس کے اندر ایجنٹ خریدے جائیں' تحریکیں اٹھائی جائیں' جمہوری پچ تیار کی جائے' اس کے ساتھ لسانی اور قومی عصبیتوں کے بت کھڑے کئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی وحدت کو توڑنے کے لئے اس کے بعد سندھو دیش' آزاد گریٹر بلوچستان اور پختونستان جیسی آوازیں اٹھنے لگیں۔ 65ء کی

جنگ میں جب ہم مضبوط اور طاقتور قوم تھے..... تو ہم لڑے اور اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کو ناکوں چنے چبوائے دانت کھٹے کیے۔ لیکن صرف پانچ سال کے بعد یعنی 1971ء میں سانحہ مشرقی پاکستان کی صورت میں جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا وہ ساری دنیا نے دیکھا۔

سقوط ڈھاکہ کا تجزیہ کرتے وقت اس کا وبال صرف چند جرنیلوں پر ڈال دینا حقائق کے منافی ہے۔ بلکہ سقوط ڈھاکہ کا تجزیہ کرتے وقت ان تمام اندرونی اور بین الاقوامی اسباب کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مشرقی پاکستان کا سانحہ اچانک رونما نہیں ہوا بلکہ ہندوستان نے ہمارے خلاف بھرپور تیاری کی۔ مشرقی پاکستان میں عصبیت اور مغربی بازو کے اندر قومیت کے بیج بوئے۔ اس مقصد کے لئے کراچی اور اسلام آباد میں امریکہ اور برطانیہ کے کونسل خانے استعمال ہوئے، تجوریوں کے منہ کھولے گئے اور ابن الوقت سیاستدانوں کو خریدا گیا۔ اس کے بعد اچانک ہی خودرو جنگلی جھاڑیوں کی طرح، سیاسی جماعتیں اور سیاستدان اگنے لگے۔

دوسری طرف ہندوستان کی سازشوں کا ایک محور یہ بھی تھا کہ بنگالیوں کو باہم لڑایا جائے، پڑوس کی پوری پٹی پر ٹریننگ کیمپ قائم کرنا اور انہیں ایسی تربیت دینا کہ وہ افواج پاکستان کے مقابل کھڑے ہو جائیں، یہ سارے کام اور جرائم ہندوستان کے ہیں جو پوری دنیا کے سامنے ہیں۔ اس معاملے کا المناک پہلو یہ ہے کہ ہماری ایجنسیاں صورتحال کا ادراک کرنے میں بالکل ناکام رہیں اور کسی ایجنسی نے بھی اس کا نوٹس نہ لیا۔ یہ تمام حالات ایک دم خراب نہیں ہو گئے تھے، راج شاہی، کھلنا اور مشرقی پاکستان کے دیگر شہروں میں پاکستان کے ترانے کے بجائے رابندر ناتھ ٹیگور کی نظمیں گائی جاتی تھیں۔ 65ء اور 70ء کے درمیان ہندوستان نے ایسے حالات پیدا کیے۔ امریکہ اور روس نے ہندوستان کی مدد کی اور مکتی باہنی کی صورت میں پاکستانی افواج کے متوازی ایک فورس بنائی۔

## بھارت کا جنگی پاگل پن

جب 70ء کی دہائی کے آخری سالوں میں دنیا کی دونوں سپر پاورز افغانستان میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہونے کے لیے اپنے اپنے مددگار تلاش کر رہی تھیں تو ایران میں

انقلاب کے ذریعے امام خمینی کی حکومت قائم ہوئی جبکہ پاکستان میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ ءدار پر چڑھا دیا گیا۔ اسی سال نومبر 1979 کو تقریباً 250 اسلامی شدت پسندوں نے خانہ کعبہ کا محاصرہ کرلیا۔ ایران میں آئی تبدیلی اور ایران سعودیہ ناہموار تعلقات کے تناظر میں اس پہلی خبر پر ہی یقین کرلیا گیا کہ خانہ کعبہ کا محاصرہ کرنے والے ایرانی تھے اور قبضہ چھڑانے والی پاکستانی فوج تھی۔ یاروسلاف seige of makkah میں لکھتے ہیں کہ خانہ کعبہ پر چڑھائی کرنے والے 250 افراد میں سے کچھ کے سر قلم کر دیے گئے، کچھ کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ پاکستان کے ہمسایہ ممالک میں حالات خراب تھے۔ حتیٰ کہ پاکستان میں بھی سیاسی حالات انتہائی دگرگوں تھے۔ ایک سول اور جمہوری حکومت کا خاتمہ اور مارشل لاء کا نفاذ ملک میں بے چینی اور ابتری کا باعث بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں بھارت نے پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لیے قائم ہوئی اے آر ڈی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جو فوجی حکومت کے خلاف تحریک چلا رہی تھی۔

1980 کے اوائل میں تحریک بحالی جمہوریت کے عہدیداروں نے سندھ میں سیاسی تشدد کو ہوا دی اور لاقانونیت کا رجحان پیدا کیا۔ اغوا برائے تاوان کی وارداتیں عام ہونے لگیں اور اغوا کرنے والے بڑے بڑے وڈیروں کی سیاسی پناہ میں جانے لگے۔ فوج نے مداخلت کر کے ایک حد تک امن وامان بحال کر دیا اور صورت حال پر قابو پا لیا گیا لیکن اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ یہ واقعات ملی یکجہتی اور قومی وحدت کے چہرے پر بدنما داغ چھوڑ گیے۔

بھارت نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ سندھ کے منحرفین سرحد عبور کر کے بھارت چلے گئے اور وہاں خوب خوب کھل کھیلے۔ بھارت نے شروع میں تو ان کو چوری چھپے مدد دی لیکن بعد میں کھلے بندوں ان کی سرپرستی شروع کر دی۔ مسز اندرا گاندھی نے دھمکی دی کہ ''بھارت سندھ میں رہنے والوں کے حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا''۔ بھارتی ایوان صدارت میں نئی دہلی میں ایک سندھ ''سیمینار'' منعقد کرنے کا ڈھونگ رچایا گیا۔ اس سیمینار میں بھارت کے ایک ممبر پارلیمنٹ نے جس کا تعلق حکمران پارٹی سے تھا، یہ مطالبہ کیا کہ سندھ کو بھارت ماتا میں ضم کرلیا جائے۔ پاکستان نے اس پر احتجاج کیا تو اس کا سفارتی

جواب یہ دیا گیا کہ یہ ایک فرد واحد کی ذاتی رائے تھی۔ پاکستان کی نظر میں بھارت کا یہ رویہ پاکستان کی سلامتی کے منافی تھا۔ بھارت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل کے سندرجی کی ملاقات 1986 میں پاک فوج کے میجر جنرل نشاط احمد سے ہوئی۔ دونوں جرنیلوں نے امریکہ میں ایک پیشہ ورانہ کورس میں اکٹھے شرکت کی تھی۔ سندرجی نے نشاط کو بتایا کہ اگر پاکستان بھارتی پنجاب میں سکھوں کی مدد کرسکتا ہے(اس الزام کی پاکستان نے ہمیشہ تردید کی) تو بھارت کے پاس بھی ''سندھ کارڈ'' موجود ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بھارت نے ابھی یہ کارڈ استعمال نہیں کیا۔

1983 کے اواخر میں مسز اندرا گاندھی نے ایک جنگی جنون کی سی کیفیت پیدا کردی۔ ان کو پاک بھارت افق پر جنگ کے بادل منڈلاتے نظر آنے لگے اور انہوں نے بغیر کسی اشتعال کے دھمکی آمیز بیانات دینے شروع کر دیئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ سکھ بھارتی پنجاب کی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بھارت کے حزب اختلاف کے بعض رہنماؤں نے پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے پاکستان کو خبردار کیا کہ اگر مسز اندرا گاندھی پر زیادہ دباؤ پڑا تو ''پاکستان کو سبق سکھانے'' کا بہانہ ان کے ہاتھ آجائے گا۔ انکا تجزیہ یہ تھا کہ وہ اپنی داخلی ناکامیوں کا حل خارجی جارہانہ کارروائیوں میں ڈھونڈنا چاہتی ہیں۔ اس کے جواب میں پاکستان نے اپنے سیاسی کارڈ بہتر انداز میں استعمال کئے۔ صدر ضیاء قطعاً مشتعل نہ ہوئے اور مصالحانہ بیانات دیتے رہے۔ انہوں نے سفارت کاری کا ہنر بہت جلد سیکھ لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان کو بہت سمتوں سے، خطرات لاحق ہو جائیں۔ وہ بھارت کے ساتھ مصالحانہ پالیسی اپناتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ مسئلہ افغانستان پر مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔

جون 1984 میں بھارتی فوج نے امرتسر میں واقع سکھوں کی مقدس مذہبی عبادت گاہ ''گولڈن ٹمپل'' پر دھاوا بول دیا۔ اس کے نتیجے میں اکتوبر 1984 میں ایک سکھ نے اندرا گاندھی کو قتل کر دیا۔ بھارت میں حزب اختلاف کے ایک ممتاز راہنماء نے 1984 کے آخر میں جنرل ضیاء پر یہ منکشف کیا تھا کہ ''گولڈن ٹمپل'' پر بھارت کے اوچھے حملے کی وجہ سے پاک بھارت جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ (یاد رہے کہ سکھوں کے خلاف آپریشن کرنے کا بھارت کو برطانیہ نے مشورہ دیا تھا)

# ضیا مارشل لاء اور پاک بھارت تعلقات

اسلام آباد میں مقیم بھارت کے دفاعی وفوجی اتاشی بریگیڈیر کے کھنہ نے جنرل ہیڈکوارٹرز میں جنرل کے ایم عارف سے معمول کی خیر سگالی ملاقات کی۔انہوں نے اس اتاشی کے ذریعے بھارت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل اے ایس ویدیا(A.SVAIDIA) کو پیغام بھیجا کہ دونوں ممالک کی افواج اگر چاہیں تو سرحدوں پر کسی بھی قسم کی گڑبڑ کو قابو میں رکھنے کیلئے اپنی اپنی حکومتوں کی مدد کرسکتی ہیں۔کے ایم عارف نے نئی دہلی میں مقیم اپنے دفاعی وفوجی اتاشی بریگیڈیر زیڈ آئی عباسی کو بھی ہدایت کی کہ وہ بھارت کے آرمی ہیڈکوارٹر میں اسی موضوع پر بات چیت کریں۔بریگیڈیر عباسی نے بھارتی آرمی چیف سے ملاقات کی۔
8جون1984 کو جنرل ویدیا کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا:''ہمارے دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے اور تعلقات کو معمول پر لانے کیلئے آپ جو قدم بھی اٹھائیں گے ہم آپ سے بڑھ کر اس میں حصہ دار ہوں گے''۔

تقریباً انہی ایام میں بھارت کے سیکرٹری خارجہ مسٹر ایم رسگوترا(M. Rasgotra) پاکستان آئے۔ان کے توسط سے بھارتی آرمی چیف کو دو تجاویز بھیجی گئیں۔جنرل ویدیا نے 3جولائی1984 کو ایک بار پھر خط لکھا کہ''شری ایم رسگوترا نے پاک بھارت سرحد کو کشیدگی سے پاک رکھنے اور سرحدوں کی جانب افواج کی نقل وحرکت کی پیشگی اطلاع دینے کے لئے آپ کی تجاویز مجھ تک پہنچائی ہیں۔جیسا کہ میں نے پہلے بھی پاکستان کو لکھا تھا ہم ہمیشہ اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ سرحدوں پر کشیدگی کی فضا ختم کرنے کیلئے کوشاں رہے ہیں۔میں ایک بار پھر پاکستان آرمی کو یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہم آپ کی طرف سے اٹھائے جانے والے کسی بھی مثبت اقدام کا اسی مثبت انداز میں جواب دیں گے۔میں آپ کی اس تجویز سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ سرحدوں کے نزدیک جب بھی ٹروپس کی کوئی نقل وحرکت ہو تو فریقین ایک دوسرے کو اس کی پیشگی اطلاع دے دیا کریں۔اس موضوع پر مزید تفصیلات اور طریقہ ہائے کار ہمارے ڈائریکٹرز آف ملٹری آپریشنز جو پہلے ہی آپس میں براہ راست ٹیلی فون رابطے سے منسلک ہیں، طے کرسکتے ہیں۔جہاں تک ہمارا تعلق ہے،ہم اس سمت میں پہلے ہی

مثبت اقدام کر چکے ہیں اور اپنی وزارت خارجہ کے توسط سے پنجاب میں ہونے والی حالیہ نقل وحرکت سے آپکو مطلع کر چکے ہیں''۔

جنرل ویدیا کے اس خط کے جواب میں 24 جولائی 1984ء کو کے ایم عارف نے انہیں لکھا: ''مجھے اس بات پر خوشی ہوئی ہے کہ ہم دونوں اصولی طور پر دو مسئلوں پر اتفاق کرتے ہیں۔ایک یہ کہ سرحدوں پر سے کشیدگی ختم کی جائے اور دوسرے یہ کہ فریقین کو افواج کی نقل وحرکت کی پیشگی اطلاع مہیا کرنیکا بندوبست کریں۔شاید وقت آگیا ہے کہ ہم آپس میں بہتر افہام وتفہیم برقرار رکھنے کیلئے باہمی طور پر طے شدہ سطح تک ایک دوسرے کے ساتھ باقاعدگی سے روابط استوار رکھیں۔ماضی قریب میں حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت کو اسی سلسلے میں چند ٹھوس تجاویز بھی ارسال کی تھیں۔آپ ہمیں ہر وہ سیاسی اقدام اٹھانے کیلئے تیار پائیں گے جو شک وشبہ کی تاریکیاں دور کر کے روشنی کا نقیب بن سکے۔

اس آخری تجویز پر کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔پہلے دو مسائل پر بات ضرور کچھ آگے بڑھی۔بعض مواقع پر دونوں ممالک کی اطلاع بھی طرفین نے ایک دوسرے کو دی اور مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے مابین کنٹرول لائن کے پار بعض معمولی قسم کے مقامی جھگڑوں پر بحث کرنے کیلئے سیکٹر کمانڈوں نے آپس میں ملاقاتیں بھی کیں۔لیکن سیاچن گلیشیر کے سلگتے مسئلے پر تالہ جہاں تھا وہیں رہا۔

## بھارت کی جارحیت اور کارگل کا محاذ

پاکستانی فوج ملک کا سب سے بڑا طاقتور ادارہ ہے جس نے وطن عزیز کے تحفظ کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔لیکن بسا اوقات یہ عوامی حکمرانوں کے احکامات اور پالیسیوں کو بھی مسترد کر دیتا ہے۔ایسا ہی کچھ 1999 میں ہوا جب وزیر اعظم کو اعتماد میں لیے بغیر کارگل میں فوج بھیج دی گئی۔یہ درست ہے کہ یہ جنگ بھارت نے شروع کی تھی۔پاکستان اور بھارت کے درمیان 1990 کی دہائی میں تعلقات اس وقت تک بہت اچھے رہے جب تک 1999 میں کارگل کی جنگ نہ لڑی گئی تھی۔دونوں ممالک نے کافی نقصان اٹھایا۔اس محاذ پر پاکستان کی فوج کی تعداد 5000 جبکہ بھارتی فوج 3000 کے لگ بھگ تھی۔پاکستان کے 453 فوجی شہید اور 665 زخمی

ہوئے جبکہ بھارتی فوجی 527 مارے گئے اور 1363 زخمی ہوئے۔ بھارتی فوجی سربراہ نے اس جنگ کو ایک ناکام جنگ کہا جبکہ پاکستانی فوجی سربراہ پرویز مشرف نے اسے ایک بڑی کامیابی قرار دیا۔ ان کا موقف تھا کہ کارگل جنگ کی وجہ سے بھارت کشمیر پر مذاکرات کرنے پر آمادہ ہو اتھا۔ کارگل جنگ کنٹرول لائن پر ہونے والی ایک محدود جنگ تھی جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان 1999ء میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں واضح کامیابی کسی ملک کو نہ مل سکی۔

ایک بار اس وقت کے بھارتی وزیراعظم واجپائی پاکستانی دورے پر آئے اور لاہور میں انہوں نے پاکستانی وزیراعظم نواز شریف سے گلہ کیا کہ "ہم آپکی میزبانی سے مستفید ہو رہے ہیں مگر آپ کی فوج نے کارگل پر قبضہ کرلیا ہے"۔ وزیراعظم کی صدارت میں 27 مئی 1998 کو پاکستان میں ہنگامی دفاعی اجلاس منعقد ہوا جس میں بحری، بری اور فضائی افواج کے سربراہان شامل تھے۔ بری اور فضائی سربراہان نے نواز شریف کو بتایا کہ "ہمیں اس مہم جوئی کی اطلاع پہلے سے تھی"۔ اس وقت کے پاکستانی وزیراعظم میاں نواز شریف نے کہا کہ کارگل جنگ کے ذمہ دار پرویز مشرف تھے، سیاسی خلاء ہمیشہ آمریت کے دور میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ پرویز مشرف کارگل جنگ کے ذمہ دار تھے۔ پاک بھارت مذاکرات کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان امن عمل جاری رہنا چاہیئے، انہوں نے بھارت پر زور دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کو حل کرے اور حل ایسا ہونا چاہیئے جسے خطے کے عوام قبول کریں۔

ادھر بھارتی فوج کے سابق جنرل کشن پال نے ایک اعترافی بیان میں کہا کہ "کارگل جنگ حقیقت میں بھارت نے نہیں جیتی۔ 1999 میں کارگل جنگ میں 527 فوجیوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور بھارت نے علاقہ واپس حاصل کرلیا تھا۔ میرے خیال میں جنگ میں اتنی جانیں ضائع ہونے کو کامیابی نہیں کہا جاسکتا"۔ جنگ میں بھارت نہ صرف میدان جنگ میں بلکہ سفارتی محاذ پر بھی ناکام رہا۔ کارگل کے ذریعے کشمیر کے مسئلے کو عالمی سطح پر دوبارہ اجاگر کرنے کے پرویز مشرف کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کارگل میں پاکستانی فوجیوں کی ہلاکتوں کو پاکستان نے تسلیم نہیں کیا اور ان کی لاشیں وصول کرنے سے انکار کردیا۔

2009 میں بھارت کے ایک فوجی ٹریبونل نے حکم دیا کہ 1999 میں وقوع پذیر ہونے والی کارگل جنگ کی تاریخ دوبارہ لکھی جائے۔فوجی ٹریبونل نے یہ حکم اس انکشاف کے بعد دیا کہ کارگل جنگ میں باٹالیک سیکٹر میں تعینات بریگیڈیر دیوندر سنگھ کی جنگ کی رپورٹس کو لیفٹیننٹ جنرل کشن پال نے تبدیل کر دیا تھا جس کے بعد یہ رپورٹ فوجی تاریخ کا حصہ بن گئی۔کارگل پر ان کی رپورٹ کو ان کے سینئر افسران نے غیر حقیقی قرار دے کر اس میں تبدیلیاں کی تھیں۔تاہم گیارہ سال بعد فوجی ٹریبونل نے ان کی اصل رپورٹ کی حمایت کی۔

## کارگل جنگ میں اسرائیل کا کردار

10 فروری 2008 کو نئی دہلی میں اسرائیل کے سفیر مارک سوفر نے ایک چونکا دینے والا انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے ملک نے 1999ء میں پاکستان کے ساتھ کارگل کی جنگ کا رخ بدلنے میں بھارت کی مدد کی تھی۔ہفت روزہ "آوٹ لک" کو انٹرویو میں اسرائیلی سفیر نے بتایا کہ کس طرح کارگل کے بعد دونوں ملکوں کے دفاعی تعلقات کو فروغ حاصل ہوا۔ جب اسرائیل نے ایک نازک مرحلے پر زمینی صورتحال بدلنے میں بھارت کو بچایا۔:"میرا خیال ہے ہم نے بھارت کو ثابت کیا کہ وہ ہم پر بھروسہ کر سکتا ہے اور ہمارے پاس اسکے لئے وسائل موجود ہیں۔ضرورت کے وقت ایک دوست ہی حقیقی دوست ہوتا ہے۔"اسرائیلی سفیر نے یہ بھی انکشاف کیا کہ بھارت اسرائیلی تعلقات اسلحے کی خرید و فروخت سے آگے بڑھیں گے۔"ہمارے بھارت کے ساتھ دفاعی تعلقات خفیہ نہیں،تاہم جو بات خفیہ ہے وہ یہ ہے کہ دفاعی تعلقات کی نوعیت کیا ہے اور تمام احترام کے ساتھ خفیہ حصہ ایک راز رہے گا۔"

لداخ اور سری نگر کا واحد زمینی راستہ یہاں سے گزرتا ہے۔سیاچن پر موجود بھارتی افواج کی کمک و رسد کے لئے کارگل کا راستہ ہی بہتر راستہ ہے۔کارگل تا سیاچن تک کا راستہ سال کے دس مہینوں تک برف کی قید میں رہتا ہے اور صرف دو ماہ کے لئے یہ شاہراہ سیاچن کے برف پوش پہاڑوں تک پہنچنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔بھارت کو انہی مہینوں میں فوجی چیک پوسٹس اور فوجی یونٹوں میں کام کرنے والے بھارتی لشکر کی خوراک اور دیگر ضروریات کو سیاچن کی چوٹیوں تک لیجانے کا ٹاسک پورا کرنا ہوتا ہے۔کسی زمانے میں پہاڑیاں اور سیاچن پاکستانی ملکیت تھے جہاں بعد ازاں بھارتی فورسز نے قبضہ کیا تھا۔

## بھارت کے پاکستان پر دہشت گردی کے الزامات

بھارت نے آزادی کے بعد ایک طرف اپنے جاسوس پاکستان میں بھیج کر جوہری پروگرام اور دیگر حساس تنصیبات کی جاسوسی شروع کر رکھی ہے اور دوسری طرف اپنے ملک کے اندر اور عالمی سطح پر ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کا الزام پاکستان پر لگا کر اسے بدنام کرنے کی روش اپنائے ہوئے ہے۔ بھارت دراصل پاکستان کو بین الاقوامی برادری میں تنہا کرنے کی پالیسی پر گامزن ہے اور اسے کمزور کرنے اور اس کی سلامتی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ بھارت ایک کثیر النسلی اور کثیر المذاہب لوگوں پر مشتمل ملک ہے جہاں ہندو مذہب کے پیروکار اکثریت میں ہیں وہاں بیک وقت کئی تحریکیں چل رہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں درجنوں عسکریت پسند تنظیمیں اور انڈر گراؤنڈ گروپ وجود میں آ چکے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کو بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی حمایت بھی حاصل ہے جن کو یہ خفیہ ایجنسی اپنے ''مقاصد'' کے لئے استعمال کرتی ہے۔ جب سے دنیا میں دہشت گردی کی لہر اٹھی ہے بھارت دہشت گردی کے واقعات میں پاکستان کو ملوث کر کے اس کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اس نے 18 فروری 2007ء کو سمجھوتہ ایکسپریس میں ہوئے دہشت گردی کے واقعہ کے بعد کیا۔ حالانکہ حقیقت میں اس دہشت گردی میں بھارتی تنظیمیں اور فوجی اہلکار شامل تھے۔ 18 فروری 2007ء کو کچھ پاکستانی بھارت میں اپنے رشتہ داروں سے مل کر ''دوستی ٹرین'' سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے پاکستان آ رہے تھے کہ دیوانہ گاؤں کے قریب ہندو دہشت گردوں کی گھناؤنی حرکت کا شکار ہو گئی۔ ٹرین دھماکے سے لرز اٹھی اور ہندو دہشت گردوں کی نفرت کے شعلوں میں جلنے لگی۔ پاکستانی مسافروں کو باہر نکلنے کے لئے کوئی کھڑکی یا دروازہ کھلا نہیں تھا سب کو انڈین ریلوے نے تالے لگا رکھے تھے۔ ٹرین کے ڈبے موت کا پنجرہ ثابت ہوئے اور 68 زندہ پاکستانی مسلمان لاشوں میں بدل گئے۔ اس خوفناک سانحے کی کہانی کے تانے بانے دو سال (2005ء) پہلے بننے شروع کر دیئے گئے تھے۔ پاکستانی مسلمانوں کے خلاف ہندو ذہنیت بڑی واضح ہو کر آشکار ہوئی جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

## دہشت گردی کی سازش کے کردار

سمجھوتہ ایکسپریس کے 68 معصوم انسانوں کو زندہ جلانے والے ان مجرموں کے خلاف پہلی چارج شیٹ چار سال بعد 20 جون 2011ء کو جمع کروائی گئی۔ اس چارج شیٹ کے مطابق ''اسیم آنند، ہندو مندروں، مثلاً آکشاردھم (گجرات) رگھوناتھ مندر (جموں) اور سنکٹ موچن مندر (ورناس) پر دہشت گردوں (مبینہ جہادیوں) کے حملوں سے ناراض و مشتعل تھا۔ اس نے ملزمان سنیل جوشی، پراگیہ سنگھ اور بھارت بھائی سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد انتقامی کارروائیوں پر اتفاق کرلیا، جو نہ صرف جہادی حملہ آوروں بلکہ تمام مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ 1999ء میں بھارت بھائی کی اسیم آنند سے ملاقات ہوئی اور پھر وہ اس کا قریبی ساتھی بن گیا۔ 2003ء میں اسیم آنند کی پراگیہ اور جوشی سے ملاقات ہوئی۔ اکتوبر 2005ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے رہنما، اندریش کمار اور دیگر انتہا پسندوں نے شری دھم گجرات کا دورہ کیا، یہیں جوشی نے اسیم آنند اور اندریش کمار کے درمیان ملاقات کروائی اور انہوں نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں پر حملوں کے حوالے سے گفتگو کی۔ جون 2006ء میں مرکزی سازشی اجلاس، ولسر گجرات میں، بھارت بھائی کے گھر ہوا، جس میں اسیم آنند، سدھوی پراگیہ، جوشی، سندیپ ڈنگے، رام چندر کلسنگر، لوکیش شرما، امیت اور بھارت بھائی شریک ہوئے۔ اسیم آنند نے اجلاس کی صدارت کی اور ''بم کا بدلہ بم سے'' کا نظریہ پیش کیا، جسے باہمی اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ اسی دوران ڈنگے شدید جذباتی اور مشتعل ہوگیا اور کہا کہ ''مندروں پر حملے ہورہے ہیں اور ہندو خاموش ہیں''۔ جوشی نے بلند آواز میں کہا ''ہندوؤں کا قتل عام ہورہا ہے اور حکومت ''سمجھوتہ ایکسپریس'' چلا رہی ہے''۔ اس پر ڈنگے جوشی سے بولا کہ ''ہم سمجھوتا ٹرین کو بم سے اڑا دیں گے''۔ جوشی نے مداخلت کرکے اجلاس کے ماحول کو ٹھنڈا کیا، اسیم آنند نے اجلاس کے دوران مالی گاؤں، اجمیر، حیدرآباد دکن اور سمجھوتہ ایکسپریس پر بم دھماکوں کی تجویز پیش کی اور جوشی ہی نے تمام بم دھماکوں کی کارروائی کی ذمہ داری لی۔

جوشی نے سمجھوتہ ایکسپریس کو نشانہ بنانے کی بات کی، کیونکہ ٹرین کے بیشتر مسافر،

پاکستانی مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ ابتدائی کام پہلے ہی کر چکا تھا۔ اجلاس میں طے کیا گیا کہ اس (دہشت گرد) کارروائی کے لئے تین گروپ ہوں گے۔ پہلا گروپ سفید پوش افراد پر مشتمل ہوگا، جو نوجوانوں کو اس مقصد کے لئے تیار کرنے میں مدد اور تحفظ فراہم کرے گا۔ دوسرے گروپ کے ارکان بم بنانے کے لئے خام مال حاصل کریں گے اور تیسرا گروپ بم تیار کر کے نصب کرے گا۔ اس کے بعد کیمل چوہان، کلسنگر، شرما، امیت اور چوہدری جنوری 2006ء میں مدھیہ پردیش کے ضلع، دیواس کے بغلی جنگل میں ہونے والی تربیت میں شریک ہوئے، جس کا اہتمام سنیل جوشی نے کیا تھا۔

وہاں پائپ بم بنانے اور پستول سے فائرنگ کرنے کی تربیت دی گئی۔ بعدازاں وہ فائرنگ پریکٹس میں شریک ہوئے، جس کا انتظام جوشی نے اپریل 2006ء میں فرید آباد کی، کرنی سنگھ فائرنگ رینج میں کیا تھا۔

## بم دھماکوں کی منصوبہ بندی

شبری دم کمبھ میلے کے صرف دو ہفتوں بعد بنارس شہر دو بم دھماکوں سے لرز اٹھا۔ ایک دھماکہ مندر جبکہ دوسرا ریلوے اسٹیشن میں ہوا۔ بم حملوں میں 28 افراد مارے گئے، سو سے زائد زخمی ہوئے۔ بھارتی سیکورٹی اداروں نے حسبِ معمول ان حملوں کا ذمے دار مسلم جہادیوں کو قرار دیا۔ ایم آنند نے فوراً پرگیا سنگھ، سنیل جوشی اور دیگر انتہاپسند ہندو کارکنوں کی میٹنگ بلائی جس میں فیصلہ ہوا کہ حملوں کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔

سنیل جوشی جلد ہی اپنے ایک ساتھی، ریتشواڑ کے ساتھ جھاڑکھنڈ جا پہنچا اور وہاں سے پستول اور وہ سم کارڈ خریدے جنھیں بموں میں بہ حیثیت ڈیٹونیٹر استعمال کرنا مقصود تھا۔ اس خریداری کے لیے انھیں ایم آنند نے پچیس ہزار روپے دیئے تھے۔ ریاستی ضلع جمعدا کے آر ایس ایس سربراہ، دیوندر گپتا نے انھیں جعلی ڈرائیونگ لائسنس فراہم کیے تاکہ وہ ان کی بنیاد پہ سمیں خرید سکیں۔

جون 2006ء میں اسلحہ خرید کر دونوں واپس شبری دم پہنچ گئے۔ ان سے پہلے پرگیا سنگھ آر ایس ایس کے چار رضا کاروں...... سندیپ ڈنگی، رام چندر کالسنگرہ، لوکیش شرما اور

امیت کو لیے وہاں پہنچ چکی تھی۔ سندیپ ضلع شجاع آباد (مدھیہ پردیش) کا ضلعی صدر جبکہ بقیہ افراد مختلف اضلاع میں آر ایس ایس کے سینئر کارکن تھے۔

اب بم حملے کرنے کی خاطر تین ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ پہلی ٹیم نے ان نوجوانوں کو بھرتی کرنا تھا جو منتخب جگہ تک بم لے جائیں۔ وہی ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھی کرتی۔ دوسری ٹیم کے ذمے یہ کام لگا کہ وہ بموں کی تیاری میں مستعمل متفرق سامان جمع کرے۔ تیسری ٹیم کے کارکنوں کو بم بنانے کی ذمے داری سونپی گئی۔

سنیل کو ان تینوں ٹیموں کے مابین رابطہ کار بنایا گیا۔ اسی نے سب سے پہلے تجویز دی کہ سمجھوتہ ایکسپریس کو نشانہ بنایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ پاکستانی مارے جاسکیں۔ اسیم آنند چاہتا تھا کہ مالیگاؤں، حیدرآباد، اجمیر شریف اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں پہ بم حملے کیے جائیں۔ تب وہ انتقام کی آگ میں سلگ رہے تھے جس نے ان میں خیر کے جذبوں اور ضمیر کو جلا ڈالا۔ یوں وہ نہتے اور بے گناہ مسلمانوں کی جان کے درپے ہوگئے۔

## ہیمنت کرکرے کی تفتیش

آر ایس ایس کا یہ سفاک ٹولہ موت و خون کا اپنا وحشیانہ کھیل شاید طویل عرصے تک جاری رکھتا تاہم ریاست مہاراشٹر میں اسے ایک فرض شناس اعلیٰ پولیس افسر "ہیمنت کرکرے" ٹکر گیا۔ وہ ریاستی انسداد دہشت گردی فورس کا سربراہ تھا۔ مزید براں پرگیا سنگھ کی معمولی غلطی نے بھی ٹولے کا راز افشا کردیا۔ مالیگاؤں بم حملے میں جو موٹر سائیکل استعمال ہوئی، وہ پرگیا کی ملکیت تھی۔ اسے یقین تھا کہ دھماکہ موٹر سائیکل کے پرخچے اڑا دے گا۔ مگر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس کی نمبر پلیٹ تباہی سے بچ گئی اور اسی نے خفیہ ایجنسیوں کے سراغ رسانوں کو پرگیا تک پہنچا دیا۔ جب ہیمنت کرکرے کو معلوم ہوا کہ دہشت گردی کے واقعہ میں استعمال ہونے والی موٹر سائیکل پرگیا سنگھ کی ہے، تو اس نے ملزم کو گرفتار کرلیا۔ یوں بالآخر آر ایس ایس خونی گروہ طشت از بام ہونے لگا۔ ہیمنت کرکرے نے تفتیش کا دائرہ پھیلایا، تو ٹولے میں شامل دیگر دہشت گرد بھی رفتہ رفتہ سامنے اور قانون کی گرفت میں آنے لگے۔

بھارت میں اس خبر نے ہلچل مچا دی کہ پچھلے چند برس میں کئی بم دھماکے سنگھ پریوار

کے دہشت گردوں نے کیے اور ان کا الزام غلط طور پہ مسلم نوجوانوں پہ تھوپ دیا گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل شری کانت پروہت کی گرفتاری نے معاملے کو نئی جہت دے ڈالی۔ اس نے آشکارا کیا کہ فوج، خفیہ ایجنسیوں اور پولیس میں ہندوتوا نظریے سے ہمدردی رکھنے والے افسر و کارکن بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل پروہت نے دہشت گردوں کو آرمی ڈپو سے آتش گیر مادہ، آر ڈی ایکس فراہم کیا تھا جس سے سمجھوتہ ایکسپریس میں آگ لگائی گئی۔ نیز وہ بم اسمبلی بھی ٹولے کو دیتا رہا۔

## ہندو مذہب کا ''غدار''

گرفتار شدگان میں سے چند کارکنوں نے دوارن تفتیش یہ بھانڈا بھی پھوڑ دیا کہ پورے گروہ کو آر ایس ایس کے قومی رہنما، اندریش کمہار کی حمایت حاصل تھی۔ جب ہیمنت کرکرے نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے یہ سچائی بیان کی تو سنگھ پریوار میں کھلبلی مچ گئی۔ انھوں نے کرکرے کو جھوٹا اور ہندو مذہب کا ''غدار'' قرار دیا۔

آر ایس ایس نے پھر اندریش کمار کی حمایت میں مختلف شہروں میں جلسے منعقد کیے اور جلوس نکالے۔ تنظیم کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا قائد، موہن بھگوت بھی احتجاجی جلسوں میں شریک ہوا۔ (اب آ کر انکشاف ہوا ہے کہ دہشت گرد گروہ کو بھگوت صاحب کی بھی سرپرستی حاصل تھی، اسی لیے موصوف اندریش کمہار کے دفاع میں بہت سرگرم رہے)۔

ممکن تھا کہ کرکرے کی تفتیش آر ایس ایس کے مزید رہنماؤں کے چہروں پہ چڑھا پاکیزگی کا نقاب اتار پھینکتی کہ 26 نومبر 2008ء کا دن آ پہنچا۔ اس روز صرف دس افراد نے پورے ممبئی شہر کو یرغمال بنا لیا۔ اسی حملے کے دوران ہیمنت کرکرے پُراسرار طور پہ ہلاک ہو گئے۔

بھارتی خفیہ اداروں کا دعوئی ہے کہ کرکرے کسی حملہ آور کی گولیوں کا نشانہ بنے، تاہم یہ خیال عام ہے کہ بھارتی سیکورٹی اداروں میں موجود ہندوتوا کے حامیوں نے انھیں مار ڈالا۔ انھیں یہ شدید غصہ تھا کہ کرکرے ہندومت اور دہشت گردی کا تعلق جوڑنے پہ تلے بیٹھے ہیں۔ سو کرکرے قتل کر دیے گئے۔ اس معاملے پہ ممبئی پولیس کے سابق چیف، آئی جی (ر) ایس ایم مشرف کی کتاب ''Who Killed Karkare? The Real Face Of Terroism In India'' بھرپور انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔

## قانون کے شکنجے میں

تاہم ہیمنت کرکرے نے تفتیش کا دائرہ کار اتنا زیادہ پھیلا دیا تھا کہ حکمران طبقے میں بیٹھے نظریہ ہندتوا کے متوالے اس کا راستہ نہ روک سکے۔ جلد ہی وفاقی حکومت کے تحقیقاتی اداروں، سی بی آئی (سنٹرل بیورو آف انوسٹی گیشن) اور این آئی اے (نیشنل انویسٹی گیشن) نے آر ایس ایس دہشت گرد نیٹ ورک کے خلاف چھان بین اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ یوں معاملہ بڑھتا چلا گیا۔

گرفتار شدگان سے مزید پوچھ گچھ ہوئی، تو پتا چلا کہ اس گروہ کا کھیا سوامی اسیم آنند تھا۔ وہی بم حملوں کی منصوبہ بندی کرتا، ٹارگٹ دیکھتا بھالتا، اسلحہ خریدنے کے لیے رقومات دیتا اور دہشت گردوں کو جائے پناہ بھی فراہم کرتا۔ چنانچہ سوامی کو گرفتار کرنے کے لیے چھاپے مارے جانے لگے۔ اسیم آنند نے قانون کو پیچھے آتا پایا تو روپوش ہو گیا۔ وہ پھر مختلف جگہوں میں چھپتا پھرتا رہا۔ آخر نومبر 2010ء میں گرفتار ہو گیا۔

دسمبر 2010ء اور جنوری 2011ء میں اسیم آنند نے نئی دہلی اور ہریانہ کی عدالتوں میں یہ حلفیہ بیان دیئے کہ وہ مسلمانوں پہ بم حملوں کے منصوبوں میں شریک رہا ہے۔ لیکن بعد ازاں سنگھ پریوار کے لیڈروں کو احساس ہوا کہ سوامی اسیم آنند کے اقرار جرم سے بھارت میں سیکولر و کیمونسٹ سیاسی طاقتوں کو قوت مل گئی۔ وہ بہ بانگ دہل کہنے لگیں کہ انتہا پسند ہندو جماعتیں دہشت گردی میں ملوث ہیں، سو ان سے دور رہا جائے۔ چنانچہ سوامی نے الٹا سنگھ پریوار کو نقصان پہنچا دیا۔ اسی لیے سنگھ پریوار سے منسلک وکلاء کے مشورے پہ مارچ 2011ء میں اسیم آنند اپنے بیانات سے پھر گیا۔ سوامی نے پولیس پر الزام لگایا کہ مارپیٹ کے بعد اس سے مطلوبہ بیان لیے گئے۔ تب سے عدالتوں میں سوامی کے مقدمے زیر سماعت ہیں۔

## دھماکے، آر ایس ایس چیف کی منظوری سے کیے گئے

سمجھوتہ ایکسپریس دھماکے کے مرکزی ملزم، سوامی اسیم آنند نے انکشاف کیا کہ

سمجھوتہ ایکسپریس (18 فروری 2007ء) حیدر آباد دکن، مکہ مسجد (مئی 2007ء) درگاہ اجمیر شریف (اکتوبر 2007ء) پر حملے اور دھماکے راشٹریا سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے چیف، موہن بھگوت کی ہدایت اور منظوری سے کیے گئے۔ ایک بھارتی میگزین کو دیے گئے انٹرویو میں اس نے بتایا کہ" آر ایس ایس کے سیکرٹری جنرل موہن بھگوت نے مجھے کہا کہ یہ دھماکے کرنا انتہائی ضروری ہیں۔۔ لیکن تم انہیں سنگھ سے نہیں جوڑو گے"۔ کاروان میگزین نے سوامی اسیم آنند سے کیے گئے انٹرویو کے ٹیپ بھی جاری کر دیئے، کیوں کہ آر ایس ایس کے ترجمان نے اس الزام کو غلط قرار دیا تھا۔ اسیم آنند کے مطابق" ایک اجلاس، جولائی 2005ء میں ہوا، بعد ازاں سورت میں آر ایس ایس کے اجتماع کے بعد، بھگوت اور کمار نے سوامی آنند سے ملاقات کی۔ سوامی کا ساتھی، سنیل جوشی (جو دسمبر 2007ء میں مارا گیا) بھی وہاں موجود تھا، جوشی نے انہیں سمجھوتہ ایکسپریس سمیت مسلمانوں کے خلاف بم دھماکوں کی سازش سے آگاہ کیا۔ آر ایس ایس کے رہنماؤں نے اس کی منظوری دی، بھگوت نے ان حملوں کے لئے اپنی آشیرباد دی اور درخواست کی کہ" سوامی جی! یہ کر دیں، اگر آپ یہ کر دیں گے، تو آئندہ ہمیں سکون ہو جائے گا، اس کے بعد کچھ غلط نہیں ہوگا، یہ ہندوؤں کے لئے بہت ضروری ہے۔

## بھارت، امریکہ اور اقوام متحدہ کی پاکستان دشمنی

پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ ہونے والی یہ وحشیانہ درندگی اور دہشت گردی، ہماری حکومتیں بھی بھلا چکی ہیں۔ 2007ء کے بعد سے یہ تیسری حکومت ہے، مگر دہشت گردی کے مرتکب سفاک قاتلوں کو سزا دلانے، کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے، حکومتی سطح پر نہ تو دل چسپی نظر آتی ہے اور نہ ہی عملی اقدامات۔

"سانحہ سمجھوتہ ایکسپریس" ایک ایسا واقعہ ہے، جس نے پاکستان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ خود پر لگے دہشت گردی کے الزامات غلط، بے بنیاد اور جھوٹے ثابت کر دے، مگر سانحے کے فوراً بعد، بھارتی حکومت اور میڈیا نے اپنی کینہ پرور فطرت اور عادت کے مطابق، اس دہشت گردی کا الزام پاکستان، لشکر طیبہ اور جیش محمد پر عائد کر دیا۔ جس کے بعد پاکستان سے ملزمان کو گرفتار کرنے کے مطالبے بھی شروع ہو گئے۔ اور تو اور امریکا و اقوام متحدہ نے بھی کراچی

کے علاقے، کے ڈی اے سکیم کے رہائشی، عارف قاسمانی کو سمجھوتہ ایکسپریس دھماکوں کا ذمے دار قرار دے کر اس کا نام دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ''داؤد ابراہیم نے عارف کو فنڈز فراہم کیے اور القاعدہ نے اس کی خدمات کے عوض سمجھوتہ ایکسپریس میں دھماکے کے لئے افرادی مدد فراہم کی''۔ 2006ء کے مالی گاؤں دھماکے میں بھی عارف قاسمانی اور لشکر طیبہ کو ملوث قرار دیا گیا۔ امریکا نے تو ڈیوڈ ہیڈلے کی تیسری بیوی فائزہ کا بیان بھی جاری کر دیا کہ ''ہیڈلے نے سمجھوتا ایکسپریس دھماکے کا اعتراف کیا ہے''۔ امریکہ اور اقوام متحدہ کے ''ٹھوس ثبوت اور جامع تحقیقات'' کا بودا پن اس وقت ظاہر ہوا، جب، بھارت نے خود ان الزامات اور ٹھوس شواہد کو غلط قرار دیا اور ہندو انتہا پسند تنظیموں شوسینا، راشٹریہ سیوک سنگھ سے تعلق رکھنے والے ہندو دہشت گردوں کا گروہ گرفتار کر لیا، جس کے سرغنہ، ایم آنند نے بھارتی تحقیقاتی اداروں کے سامنے اعتراف جرم بھی کر لیا۔ (فروری 2014ء) کو، ان کے خلاف باقاعدہ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ ایم آنند، لوکیش شرما، کیمل چوہان اور راجندر پر، جنوری 2014ء کے آخر میں فرد جرم بھی عائد کی جا چکی ہے۔ مالی گاؤں بم دھماکوں میں بھی یہی ہندو دہشت گرد ملوث تھے۔ بھارتی فوج کا ایک کرنل، سری کانت پورھیت بھی گرفتار کیا گیا، جس نے سمجھوتہ ایکسپریس اور مالی گاؤں دھماکوں کے لئے دھماکہ خیز مواد، آر ڈی ایکس فوج کے ڈپو سے فراہم کیا تھا۔

- امریکہ اور اقوام متحدہ نے عارف قاسمانی پر 2006ء میں بم دھماکوں اور القاعدہ کی مدد کا الزام لگایا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی پاکستانی ایجنسیوں کی حراست میں تھا، وہ اسے 29 نومبر 2005ء کو کے ڈی اے سکیم سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اور کئی ماہ کی کوششوں کے بعد انہیں رہائی ملی۔ کچھ عرصے بعد ایجنسیاں پھر انہیں اٹھا کر لے گئیں اور کئی ماہ حراست میں رکھا۔ سوال یہ ہے کہ واقعے کے وقت ایک گرفتار شخص، کیسے ان دھماکوں کا ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ پاکستان تو اپنے شہری پر عائد الزام بھی جھوٹا ثابت نہ کر سکا، مگر بھارت کی راجستھان اینٹی ٹیرر سکواڈ نے اپنی 806 صفحات کی رپورٹ میں انکشاف کیا کہ ''سمجھوتہ ایکسپریس پر دھماکے کا منصوبہ، فروری 2006ء میں ہندوتوا کے اجلاس میں زیر غور آیا''۔

مہاراشٹر پولیس کے اینٹی ٹیرر سکواڈ نے دھماکوں کے مرکزی ملزم، لیفٹیننٹ کرنل،

پر سادھوی کانت پورحیت کو گرفتار کیا۔ جو 2007ء میں ہونے والے سمجھوتہ ایکسپریس دھماکوں میں براہ راست ملوث تھا اور ہندو شدت پسند تنظیموں سے تعلق رکھنے والے ملزمان کو اسی نے تربیت فراہم کی تھی۔ پیشی کے موقع پر ہندو راشٹریہ سینا، شیوسینا، بی جے پی کے کارکنوں نے کرنل پورحیت کی حمایت میں عدالت کے باہر مظاہرے بھی کیے، مگر ہمارے سابق وزیر داخلہ، رحمان ملک نے اپنے ہی ملک کے شہریوں کے خلاف 23 جنوری 2010ء کو بیان دیا کہ ''بھارتی کرنل پورحیت نے سمجھوتہ ایکسپریس دھماکوں کے لئے، پاکستان میں قائم بعض اسلامی تنظیموں کے کارکنان کی خدمات حاصل کی تھیں''۔ سانحے کے ملزمان نے امریکہ، اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے ساتھ ساتھ رحمٰن ملک کے بیان کو بھی، دلیل کے طور پر اپنے دفاع کا حصہ بنایا۔ ''جو خون خاک نشیناں تھا، رزق خاک ہوا''۔ اگر پاکستانی تنظیمیں ملوث ہوتیں، تو کیا وہ ان بوگیوں کو نشانہ نہ بناتے، جن میں ہندو سفر کر رہے تھے۔ بھارتی حکومت، میڈیا اور انتہا پسند ہندو تنظیموں نے یہ عادت ثانیہ بنالی ہے کہ تخریب کاری کا کائی بھی واقعہ ہو، ذمے داردان پاکستانی ہی ہوں گے۔ سمجھوتہ ایکسپریس، مالی گاؤں اور اجمیر کے واقعے سے حقائق واضح ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ مالی گاؤں بم دھماکوں کی سازش بے نقاب کرنے والے، 11 ہندو دہشت گردوں کو گرفتار کرنے والے اور انتہا پسند ہندو تنظیموں کا کردار سب کے سامنے لانے والے، ممبئی اینٹی ٹیرر سکواڈ کے چیف پولیس افسر ہیمنت کرکرے کے خلاف بی جے پی، شیوسینا اور دیگر ہندو تنظیموں نے شدید غصے کا اظہار کیا کہ ''انہوں نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے یہ گرفتاریاں کیں''۔ ہندو تنظیموں نے کرکرے کو ''قوم کا غدار'' قرار دیا۔ بی جے پی، آر ایس ایس اور ویشوا ہندو پریشد کے اس ''غدار'' پولیس افسر کو 2008ء کے ممبئی حملوں کے دوران پراسرار فون کال کے ذریعے، ویران مقام پر بلا کر ہلاک کر دیا گیا۔ ''ہندوؤں کے اس غدار'' اور ''مسلمانوں کے اس ہمدرد'' کے قتل کا الزام بھی پاکستان کی ''مسلمان اسلامی تنظیموں'' پر ہے۔

سمجھوتا ایکسپریس کی بھیانک سازش میں، ہندو انتہا پسندوں کے علاوہ سرکاری اور ریلوے اہل کار بھی یقیناً شامل تھے۔ زندہ بچ جانے والے مسافروں اور آزاد بھارتی میڈیا کے مطابق، پرانے دہلی ریلوے اسٹیشن پر سکیورٹی کے ناقص انتظامات تھے، اسٹیشن پر اس دن 23

سی سی ٹی وی کیمرے نصب تھے، مگر پلیٹ فارم نمبر 18 پر ایک بھی کیمرہ نہیں تھا۔ جہاں سے سمجھوتا ایکسپریس روانہ ہوئی، وہاں سامان کی تلاشی بھی نہیں لی گئی۔ جاسوس کتے بھی نہیں تھے۔ ریزرویشن کے بغیر بھی لوگوں کو اس ٹرین کے ٹکٹ جاری کیے گئے۔ بوگیوں کو تالے لگا کر پنجرہ بنا دیا گیا، ٹرین جائے وقوعہ پر پہنچی، تو اس کی رفتار غیر معمولی طور پر 10 سے 15 کلومیٹر فی گھنٹہ تک کم ہوگئی، جس کے باعث حملہ آور فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گئے، کئی مسافروں کا کہنا تھا کہ دھماکوں کے بعد ٹرین روکنے کے لئے زنجیر کھینچی، مگر گاڑی نہیں رکی، امدادی ٹیمیں تاخیر سے پہنچیں۔ بھارتی ایجنسیز نے ان کمزوریوں کا چارج شیٹ میں تذکرہ نہیں کیا، اس سے بھی سازش کی بو آتی ہے، مگر پاکستان اور بھارت کے قومی مزاج اور رویوں میں بہت فرق ہے۔ بھارتی حکام، ممبئی حملوں کو بھلائے نہیں بھولتے اور ہم اپنے شہریوں کی ہلاکت بھی یاد نہیں رکھتے۔

## بھارت کا 'کاؤبوائے پلان' اور پاکستان کیخلاف سازش

پاکستان کے دونوں صوبوں، بلوچستان اور خیبر پختون خواہ میں 1971 کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ 1971 میں مکتی باہنی تھی اور اب بی ایل اے اور دیگر بے شمار عسکریت پسند جماعتیں ہیں جو پاکستانی فورسز کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ مکتی باہنی کی طرح ان تنظیموں کو بھی بھارت، امریکہ، روس اور دیگر پاکستان مخالف قوتوں کی مدد حاصل ہے۔ بلوچستان اور کے پی کے میں یہ تنظیمیں انڈین اسٹیبلشمنٹ کے بدنام زمانہ منصوبے 'کاؤ پلان' پر عمل پیرا ہیں جس کے مطابق انڈیا پاکستان کو مشرقی پاکستان سے بے دخل کر کے وہاں بنگلہ دیش قائم کر چکا ہے۔ اب انڈیا بلوچستان اور کے پی کے کو پاکستان سے الگ کرنے کی سازش پر عمل کر رہا ہے، جس کی اس نے کئی سال پہلے منصوبہ بندی کی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ خفیہ کارروائیاں اور کھلے عام سازشوں کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کا دہشت گردوں کی مدد کرنے کا دوسرا مقصد پاکستان افواج کو کمزور اور بدنام کرنا ہے۔ کاؤبوائز کا منصوبہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہی۔ اس کے بڑے مقاصد میں پاکستان کو توڑنا شامل ہے۔ اس منصوبے کے پہلے حصے پر آزاد ریاستوں کو پاکستان سے الگ کر کے عمل کیا گیا، دوسرے حصے کے مطابق

مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر پورا کیا گیا۔اب اس منصوبے کے تیسرے حصے پر عمل کیا جارہا ہے۔

1960 کی دہائی کے آخری سالوں میں جب اندرا گاندھی انڈیا کی وزیراعظم بنی تو اس کی بنیادی ترجیحات میں ہندوستان کی تقسیم کو ختم کرنا تھا جس کے سبب ایک نئی ریاست پاکستان وجود میں آئی تھی۔جو بھارتی لیڈروں کے لیے روز اول سے تکلیف کا باعث بنی ہوئی ہے۔مذکورہ بالا منحوس اور بدنام زمانہ منصوبے' کاؤ پلان' کا معمار بھارتی خفیہ ایجنسی را ( قائم 1969 ) کا پہلا چیف ( 1969 تا 1977 ) اور مشہور جاسوس رامیشور ناتھ کاؤ تھا۔رامیش انڈیا کے پرانے انٹیلی جنس افسروں میں سے ایک تھا اور نہرو خاندان کی طرح وہ بھی کشمیر سے انڈیا آیا ہوا تھا۔اس نے ہی 'را' قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا جس کے اندوہناک کارناموں اور منصوبوں کی تفصیلات' daily mail,s research میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ان تفصیلات میں واضح اشارے ملتے ہیں کہ جب اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں وزارت عظمیٰ کا چارج سنبھالا تو اسنے انڈین انٹیلیجنس کو حکم دیا کہ وہ پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی جامع منصوبہ بندی کرے، اسے ایک ناکام ریاست میں تبدیل کردے اور دوقومی نظریہ جو تخلیق پاکستان کا جواز بنا اس کو باطل قرار دینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔240 صفحات پر مشتمل یہ منصوبہ جو ابھی تک ''دی کاؤ پلان'' کے نام سے انڈیا میں مخفی طور پر موجود ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے پاکستان کو کمزور کرنے کے لیے اس کے تین آپریشنل مراحل طے کیے گئے۔اور خدانا خواستہ پاکستان کو ختم کرنے کے لیے انڈین حکام نے اس کا نام 'سہہ جہتی حکمت عملی' رکھا۔اس کے پہلے مرحلے کا نام ' کاؤ بنگلہ پلان' رکھا گیا جو صرف بنگلہ دیش میں مداخلت کر کے اسے پاکستان سے الگ کر کے ایک نئی ریاست بنانے کے لیے مخصوص کیا گیا۔اس منصوبے کا دوسرا نام ' کاؤ کا بلوچستان' رکھا گیا جس کی تشکیل کا مقصد بلوچستان میں بھی بنگلہ دیش جیسے حالات پیدا کرنا تھا۔جبکہ تیسرے مرحلے میں خیبر پختون خواہ میں جس میں تخریب کاری کے لیے ایک تحریک کو پیدا کرنا اور پھر اسے پاکستان سے الگ کرنا شامل تھا۔

تحقیق سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ رامیش ناتھ کاؤ کی را کی تشکیل کے بعد پہلی ترجیح اس ایجنسی میں اعلیٰ سطح کے پیشہ ورانہ افسروں کو بھرتی کرنا تھی۔چناں چہ کاؤ کے یہ ''بااعتماد

نوجوان'' جلد ہی 'gays' کے نام سے مشہور ہوئے۔ جن نوجوان افسروں کو میرٹ پر پورا اترنے کے باوجود اس ایجنسی میں نہ لیا گیا انہوں نے اس کے متعلق خبریں باہر پہنچانا شروع کر دیں۔ اپنی تشکیل کے فوری بعد را نے بنگہ پلان جسے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

بنگال میں کاؤ پلان کے اطلاق کے وقت اس کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل تھے:

-- مشرقی پاکستان میں ایک نفسیاتی جنگ شروع کرنا،

-- عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں سے رابطے میں رہنا،

-- مشرقی پاکستان کے تمام اندرون یا بیرون ملک سول سروس کے اور سفارتخانوں میں کام کرنے والے افسروں سے فوری رابطے پیدا کرنا،

-- مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی کارروائیوں کے خلاف، بنگالیوں کی مصیبتوں اور بنگال سے وسیع پیمانے پر نقل مکانی کو مقامی اور بین الاقوامی میڈیا میں وسیع پیمانے پر نشر کرنا اور کانفرنسز کا انعقاد کرنا شامل تھا۔

-- مشرقی بنگال کے عوام میں احساس محرومی پیدا کرنا،

-- سماجی حلقوں اور عوامی اجتماعات کے ذریعے مغربی پاکستان کے لوگوں کے خلاف مشرقی پاکستان میں نفرت پیدا کرنا۔

اس کے علاوہ انڈین علاقوں بنگال، آسام اور تری پورہ میں مکتی باہنی کے عسکریت پسندوں کو تربیت دینے اور ان کو اسلحہ پہنچانے کا بندوبست بھی کیا گیا تا کہ خانہ جنگی کو ہوا دی جا سکے۔ اس میں انڈین فوج، جس کا سربراہ ان دنوں جنرل مانک شاہ تھا، کی مدد شامل حال تھی۔ انڈین سیکورٹی بارڈر فورس اور آئی بی کو بھی خفیہ آپریشن پر مامور کیا گیا۔ معروف صحافی قطب الدین عزیز جو سابق مشرقی پاکستان کو بنگلہ میں تبدیل کرنے کے لیے کاؤ پلان پر عمدرآمد کے وقت وہاں اپنے ادارے کی طرف سے ڈیوٹی پر موجود تھے نے اپنی کتاب ''خون اور آنسو'' میں لکھا ہے کہ ''انڈیا نے مکتی باہنی کو 10 لاکھ غیر بنگالی قتل کرنے کے لیے تربیت دی''۔ مشرقی پاکستان میں را کی ابتدائی کامیابیوں کے بعد اور پاکستانی قیادت کی صورتحال پر قابو پانے کی نااہلی کے سبب 1971 میں ایک نئی ریاست 'بنگلہ دیش' معرض وجود آ گئی۔ یہ صرف را کی پاکستانی بنگال میں مداخلت کے 30 ماہ کے اندر یہ سب کچھ ہوا۔ رامیش ورناتھ کاؤ نے اس

کے بعد انڈین وزیر اعظم اندرا گاندھی سے 'پلان' کے دوسرے حصے یعنی بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک چلانے کی اجازت بھی مانگی تھی۔ (اس کا اقرار اندرا گاندھی نے 1984 میں پاکستانی دانشور اور صحافی طارق علی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں بھی کیا کہ 71ء کے بعد اس کے جرنیلوں نے مغربی پاکستان پر بھی حملہ کرنے کی اجازت مانگی تھی جسے اس نے مسترد کر دیا تھا۔) تاہم شاہ ایران، چین اور سی آئی اے کی طرف سے سخت ردعمل کی وجہ کے سبب بلوچستان کی علیحدگی کا منصوبہ اندرا نے موخر کر دیا۔ لیکن کاؤبوائز نے پاکستان سے باہر سماجی سرگرمیوں کے ذریعے بلوچ راہنماؤں سے رابطے شروع کر دیے۔

اسی دوران را نے بھی اپنی ہمزاد غیر ملکی ایجنسیوں سے رابطے شروع کیے تو سابق سوویت یونین اور کے جی بی نے بلوچستان میں خفیہ آپریشن کے لیے را کو مثبت جواب دیا۔ بلوچستان کے حوالے سے را کو رابطوں کے لیے بنگلہ دیش کی طرح زمینی راستے میسر نہ تھے دوسرا پاک فوج کا پورے صوبے پر کنٹرول تھا اور اسے بلوچستان میں آمدورفت کے لیے موجود راستوں کی سہولت بھی میسر تھی۔ بلوچستان میں را کو اپنا کھیل شروع کرنے کے لیے صرف ایک ہی حوصلہ افزا بات حاصل تھی کہ اسے عوامی سطح پر تحریک چلانے کے لیے بنگلہ دیش کی طرح فنڈ نہیں دینے پڑے تھے، اسے صرف چند قبائلی سرداروں کو لالچ دیکر اپنے ساتھ ملانا تھا، خصوصاً نوجوانوں کو جو مغربی طرز زندگی کے دلدادہ تھے۔ اور باقی کام ان سرداروں سے لیا جانا تھا۔ را نے اس منصوبے کے بعد کاؤ پلان کے دوسرے حصے پر عملدرآمد کرنے کے لیے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب اندرا مشرقی پنجاب میں آپریشن بلیوسٹار کے ردعمل میں قومی اور بین الاقوامی تنقید کا رخ موڑنے کے لیے بلوچستان میں کاؤ پلان کے جاری کرنے کا حکم دینے والی تھی کہ وہ مذہبی جذبے میں ملغوب اپنے ہی سکھ گارڈز کے ہاتھوں قتل ہو گئی۔

اندرا کے قتل کے بعد اس کا بڑا بیٹا راجیو گاندھی انڈیا کا وزیر اعظم بنا۔ راجیو کو شک تھا کہ را کی گمراہ کن رپورٹس اور اطلاعات اس کی والدہ کے قتل کا باعث بنی تھیں، اس لیے اس کے اندر را اور اس کے اعلیٰ پالیسی میکروں کے لیے شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ راجیو کو بھی را کے حمایت یافتہ تامل دہشت گردوں نے قتل کر دیا۔ آخرکار، سونیا گاندھی نے 2005..2004 میں جب پاکستان ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا تو را کے کاؤ پلان کو پاکستان میں جاری کر دیا

گیا۔ یاد رہے کہ اس دوران پاکستان کے افغانستان حکومت کے ساتھ تعلقات درست نہ تھے۔انڈین مداخلت کے ایک سال بعد بلوچستان میں بہت کچھ خوفناک حد تک تبدیل ہو گیا۔ کاؤ پلان کے ذریعے اکبر بگٹی اور اس جیسی سوچ رکھنے والے دیگر قبائلی سرداروں کو وفاقی حکومت سے بدظن کر دیا گیا، بلوچ سردار صوبے میں علیحدگی کی تحریک چلانے کے لیے بھارتی ایجنسی کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ ایک نئی آزاد ریاست کا نام 'اسلامی امارات آف بلوچستان' رکھ دیا۔ بعض خبروں کے مطابق اس نئی ریاست کا قیام اسرائیل میں عمل میں آیا۔

اس منصوبے اور بنگلہ دیش کے منصوبے میں چند ایک چیزوں کا فرق تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک جیسے منصوبے ہی تھے۔ مثلاً مطلوبہ علاقے کی عوام میں ملک کے دوسرے حصے کے لوگوں کے متعلق نفرت اور محرومی کا زہر پھیلانا، یہاں پر بھی کچھ ایسا ہی کیا گیا۔ قبائلی سرداروں کو فنڈز اور اسلحہ مہیا کیا گیا، میڈیا مہم کے ذریعے من پسند تحریک کو اچھالا گیا، بلوچوں کو مظلوم ظاہر کرنے کے لیے اور ان کی شرمناک نقل مکانی کو دنیا میں پھیلانے کے لیے دنیا بھر میں سیمینارز منعقد کرائے جانے لگے۔ پاکستانی فوج کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کیے گئے، مقامی بلوچوں کو فوج پر حملے کرنے کے لیے ابھارا گیا، سیکورٹی فورسز کو قابض دستے بنا کر مقامی افراد اور عالمی سطح پر پیش کیا گیا، سیکورٹی فورسز اور تنخواہ دار عسکریت پسندوں میں جعلی اور حقیقی تضادات پیدا کیے گئے، تربیت یافتہ اور مسلح علیحدگی پسندوں کی طرف سے دنیا کے بڑے شہروں میں کانفرنسز اور سیمینارز کا انتظام کیا گیا، بلوچ علیحدگی پسندوں کو آزادی کے جنگجو اور ایک پسی ہوئی قوم کے طور پر پیش کیا گیا تاکہ عالمی رائے عامہ کو عسکریت پسند علیحدگی چاہنے والوں کے حق میں ڈھالا جا سکے۔ مقامی اور عالمی مارکیٹ میں سے میڈیا کو خریدا گیا، عالمی سطح پر مختلف پارلیمانی فورمز پر اختلافات پیدا کیے گئے تاکہ نام نہاد جنگجوؤں کی حمایت حاصل کی جا سکے اور بلوچستان کو مقبوضہ کشمیر میں جاری آزادی کی جنگ کے برابر رکھا جا سکے۔

بلوچستان میں را کے کاؤ پلان کا آغاز کر دیا گیا ہے جسے انڈین اور مغربی ادارے ''را کا بلوچستان کے لیے کاؤ پلان'' کا نام دیتے ہیں۔ ایک سٹڈی میں اسے 1971 کا کھیل ہی کہا گیا ہے صرف کھیل کے چند اصول اور کھلاڑی تبدیل ہوئے ہیں۔

# بلوچ اور بلوچستان کا مختصر تعارف

بلوچستان کا مطلب ''بلوچوں کے رہنے کی جگہ'' کے ہیں۔اس کی معلوم تاریخ 7 ہزار قبل مسیح تک سراغ لگائی جا سکی ہے۔ بلوچستان پاکستان کے کل رقبے کے 44 فیصد حصے پر مشتمل ہے۔ اس کی آبادی 2012 کی مردم شماری کے مطابق ایک کروڑ 31 لاکھ، 62 ہزار 222 ہے۔اس کی سرحدیں شمال مشرق کی طرف سے ایران اور مشرق کی طرف افغانستان سے ملتی ہیں۔اس کے جنوب میں بحر عرب واقع ہے جس کی 7 سو کلومیٹر طویل ساحلی سرحد بھی بلوچستان سے ملتی ہے۔ خیبر پختونخواہ اور فاٹا اس کے شمال مشرق میں واقع ہیں جبکہ سندھ اور پنجاب اس کے مشرق میں ہیں۔ بلوچستان میں بلوچ، بروہی اور پشتون تین بڑے نسلی گروپ آباد ہیں جبکہ ایرانیوں، پنجابیوں، ہزاروں، ازبکوں، ترکمانوں اور سندھیوں کی بھی ایک قلیل تعداد یہاں بستی ہے۔ بلوچوں کے بارے میں مختلف مورخین کی مختلف آراء ہیں، لیکن ایک رائے البتہ سب میں مشترک ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس کا کام لڑنا، بھڑنا اور لوٹ مار کرنا ہے۔ فارسی کی مشہور لغات ''برہان قاطع'' میں لفظ ''بلوچ'' کے معنی اس طرح درج ہیں۔ ''بلوچ اس قوم کا نام ہے، جو کرمان کے نواح میں آباد ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ حجاز سے آئے ہیں اور ان کا پیشہ جنگ و جدل کرنا اور خون بہانا ہے''۔ اصطخری لکھتا ہے کہ: ''کوئی (قوتش) طویل القامت اور چھریرے بدن کے ہوتے ہیں۔ وہ خود کو عرب کہتے اور ہر قسم کی بدمعاشیاں، مظالم اور بربریت کو جائز سمجھتے ہیں ان کی گزر اوقات محض لوٹ مار پر ہے۔ پہلے بلوچ لوٹ مار کرنے والے قبیلوں میں نہایت خطرناک سمجھے جاتے تھے، تاہم ان کا خاتمہ عادل الدولہ کے ہاتھوں ہوا''۔

جن علاقوں کو بلوچوں نے اپنا مسکن بنایا۔ خواہ وہ پاکستان میں ہیں، خواہ ایران میں، بلاشبہ یہ علاقے انتہائی دشوار گزار، غیر مزروعہ، سنگلاخ اور ہیبت ناک ہیں۔ انگریزی زبان میں صرف ایک لفظ اس کی تمام تر خصوصیات بیان کر دیتا ہے۔ وہ ہے INHOSPITABLE اس لئے ظاہر ہے کہ ان علاقوں کے رہنے والے بھی اتنے ہی شدت سے تند خو، جنگجو، مہم جو، بہادر اور خوں خوار ہونے چاہئیں، جو کہ وہ ہمیشہ رہے ہیں۔

بلوچوں نے بذات خود نہ کوئی سلطنت قائم کی اور نہ ہی کسی مرکزی قیادت کے تحت

کوئی مضبوط حکومت بنانے میں کامیاب ہوسکے۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ اپنے قرب و جوار کے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنا کر "بادشاہ گر" کی حیثیت ضرور حاصل کر لی۔ مغل بادشاہ ہمایوں جب اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں داخل ہوا تو اس نے بلوچوں کی بھی حمایت حاصل کی۔ میر چاکر بلوچ جب ہمایوں کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہوا تو اس کے ہمراہ 40 ہزار رند بلوچ تھے۔ اگرچہ بعض روایات کے مطابق وہ اپنے لئے بہترین میدانی علاقوں کے حصول کے لئے نکلا، لیکن اغلب یہی ہے کہ وہ ہمایوں کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہوا۔ یوں میر چاکر بلوچ بلوچوں کی تاریخ میں سب سے نمایاں، مشہور اور بہادر ہستی کے طور پر ابھرا اور روایت کے مطابق اس نے علاقہ مری (جو کہ اس زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا) کے بلوچوں کو ایک خوش آئند مستقبل کی جانب چلنے کی دعوت دی۔ مگر انہوں نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنے علاقے سے نکل کر کہیں اور جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر چاکر نے کہا: "تم ہے ہی مری"!

یعنی بلوچ زبان میں ضدی، ہٹ دھرمی ایسی خصوصیات ہیں جن سے وہ آج بھی مبرا نہیں۔ بلوچستان کی تاریخ کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے ہیرو میر چاکر رند کی آخری آرام گاہ بلوچستان میں نہیں، بلکہ وفات کے بعد اسے ساہیوال کے نزدیک ست گڑھ میں دفن کیا گیا۔ وہیں اس کی جاگیریں اور زمینیں بھی تھیں جہاں اس کے بہت سے ساتھی بھی آباد ہوئے۔ وہاں ابھی تک ان بلوچوں کی اولاد موجود ہے جو مقامی لوگوں میں رچ بس گئی ہے۔

بلوچوں میں دو نمایاں قومیں نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ جو خود کو عرب نژاد کہتے ہیں۔ ان کا قد و قامت، حلیہ اور جثہ دوسروں سے مختلف ہے۔ ان میں سے بعض خوش رنگ اور نیلی آنکھوں والے بھی ہیں۔ اسی بنا پر کچھ محقق انہیں عربوں کی بجائے ایرانیوں سے زیادہ قریب گردانتے ہیں۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ ہم انہیں بطور عرب تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری قوم جو نظر آتی ہے وہ بروہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر مقابلتاً پستہ قد اور گہری رنگت والے ہوتے ہیں۔ اگر ان کے نسلی ارتقاء کے بارے میں غور کیا جائے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ دراصل سرزمین ہندوستان کے اصلی باشندوں کی نسل سے ہیں۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب آریا

وسط ایشیا سے ہجرت کر کے برصغیر کی طرف آئے تو انہوں نے اس سرزمین کے اصل باشندوں کو، جو کول دراوڑ کہلاتے تھے، بزور شمشیر شمالی ہندوستان کے زرخیز علاقوں سے کم آباد اور کم زرخیز علاقوں کی طرف دھکیل دیا۔ ان میں سے کچھ تو جنوبی ہندوستان اور کچھ مغربی علاقوں (موجودہ بلوچستان) کی جانب پسپا ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ بروہی انہی اصلی ہندوستانیوں کی اولاد سے بڑی حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔ خانوادہ قلات خود کو بروہی بلوچ کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو دنیا بھر کے بلوچوں کے سربراہ بھی گردانتے ہیں۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ ایک زمانے میں خوانین قلات ہی اس تمام علاقے کے سپید وسیاہ کے مالک تھے اور دوسرے تمام چھوٹے سرداران کے باجگذار تھے۔ ان سرداروں کی حیثیت کا بھی اس امر سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ دربار قلات میں دائیں ہاتھ جگہ ملتی ہے یا بائیں ہاتھ۔ اور وہاں بھی حیثیت واہمیت کے مطابق ان کو صف میں کیا مقام عطا ہوتا ہے۔ خانوادہ قلات میں سے بھی صرف ایک حاکم ایسا گزرا ہے، جس نے صحیح معنوں میں اس خاندان کا نام روشن کیا۔ اس کے زمانے میں سلطنت قلات نے بڑی ترقی کی۔ اس نے عوام کی بہبود اور ترقی کے لئے بہت کچھ کیا۔ سلطنت کی بیشتر آمدنی لوگوں کی بہتری اور عوام کی بھلائی کے لئے خرچ کی۔ تاریخ میں بعض اسے "عقاب بلوچستان" اور بعض اسے "نصیر خان عظیم" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا دور 1750ء سے 1793ء تک تھا۔

اگرچہ بلوچ نسلی غرور میں مبتلاء ہیں اور اس کے قائل بھی ہیں۔ مگر بلوچستان میں ہر شخص بلوچ نہیں۔ مندرجہ ذیل حقائق کے پیش نظر ہمیں ان کا نسلی امتیاز اور علاقائی تفاخر ایک ایسا احساس نظر آتا ہے جو انتہائی محدود اور تنگ دامانی کا حامل ہے۔

بلوچی دراصل سرزمین بلوچستان کے نہیں، بلکہ (جیسا کہ ان کا اپنا دعویٰ ہے) یہ ملک شام کے رہنے والے ہیں۔ بنیادی طور پر عربی النسل ہیں اور حضرت امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں۔ اس لئے اس حسان سے ان کی نسل بہر کیف علاقہ بلوچستان میں زیادہ سے زیادہ پچھلے 1400 سال سے ہے۔ ان کے مقابلے میں بروہی بلوچ ان سے بھی قدیم نسل یعنی کول دراوڑ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ پنجاب کی وادیٔ سندھ اور گنگا جمنا کے دوابے کے زرخیز میدانوں کے مالک اور پرانے باشندے ہیں۔

چونکہ بلوچستان کا علاقہ ایک دشوار گزار اور نا قابل تسخیر علاقہ ہے، اس لئے انگریزوں سے پہلے کسی ایک حکمران کی عملداری میں نہیں رہا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کی چیرہ دستیوں سے تنگ آئی ہوئی کچھ حکومتوں نے اس کے لئے بڑے غیر معمولی اقدام کیے۔ بعض روایات کے مطابق انگریزوں نے اپنی عملداری کے تعین کے لئے اس علاقے کو بلوچستان کا نام دیا جو کہ آجکل صوبہ بلوچستان کہلاتا ہے۔ ویسے دیکھا جائے، تو بلوچی صرف بلوچستان میں ہی نہیں، بلکہ ایک بڑی تعداد میں پنجاب، سندھ اور دہلی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ 1891ء کی مردم شماری کے مطابق پنجاب اور سندھ میں 9,35,000 بلوچ آباد تھے۔ اسی طرح یو پی کے علاقے میں بھی بہت سے بلوچ پہنچ چکے تھے۔ اب 1971ء کی مردم شماری کے مطابق صوبہ بلوچستان میں بلوچوں کی کل آبادی 24 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اسی طرح ایرانی بلوچستان کی آبادی اس کے علاوہ ہے، جو کہ بعض اندازوں کے مطابق دو کروڑ سے بھی اوپر جا پہنچی ہے۔ ان اعداد و شمار پر غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ بلوچوں کی تعداد صوبہ بلوچستان سے باہر اپنے صوبے سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس لئے بلوچوں کا اپنے آپ کو ایک خاص علاقے تک محدود کرنا ہی ایک درست بات نہیں۔ بلوچی پاکستان، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے تقریباً ساڑھے تین لاکھ مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں جبکہ موجود صوبہ بلوچستان کا کل علاقہ ایک لاکھ 32 ہزار مربع میل ہے۔

## سرداروں کا بلوچستان اور اس کی رعایا

ویسے تو پاکستان میں اس کی تخلیق سے ہی ریاست اور اس پر قابض قوتوں نے ایک مصنوعی معیشت کو چند خاندانوں کی معاشی سلطنتوں اور اثاثوں کو تحفظ دینے کے لیے قابو میں رکھا ہوا ہے اسی لیے طبقاتی کشمکش میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چند لوگ ملکی دولت پر قابض ہیں اور غریب عوام کو دو وقت کی روٹی بھی بمشکل مل رہی ہے۔ اس کی مثال ڈاکٹر محبوب الحق کی اس رپورٹ سے واضح ہوتی ہے جو اس نے 1960 کی دہائی میں مرتب کی جس میں پاکستانی دولت پر قابض 22 خاندانوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان خاندانوں کو ملکی بنکوں کے سرمائے سے نوازا گیا جبکہ عوام کا معیار زندگی پست سے پست تر ہوتا گیا۔ پاکستان میں خط افلاس سے نیچے

زندگی گزارنے والوں کی تعداد میں 60ء کی دہائی کے بعد اضافہ دیکھنے میں آیا۔ ایوب خان کے دور میں پاکستان کے صنعتی شہروں میں ایک طرف مزدور طبقہ تھا جو کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا تو دوسری طرف مٹھی بھر صنعتکار امیر سے امیر تر ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ جنوبی پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں صدیوں سے ایک ایسا معاشی اور سماجی نظام رائج ہے جو ان علاقوں میں بسنے والوں کو حاکم اور رعایا میں تقسیم کیے ہوئے ہے۔ جاگیرداری نظام، جس کی بنیاد دو سو سال پہلے انگریز کو برصغیر پر مکمل قبضہ کرنے میں مدد دینے کے عوض زمینوں اور ریاستوں کی شکل میں ملنے والے "انعامات" پر رکھی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے ایک طبقہ نسل در نسل حاکم اور دوسرا نسل در نسل محکوم چلا آ رہا ہے۔ آج بلوچستان بلوچ سرداروں کی نجی ملکیت اور سندھ جاگیرداروں کی ذاتی جاگیر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں جن کے وسائل پر عوام کا حق دائمی طور پر بند ہے۔ ہاری، مزارعے اور رعایا کی اولاد بھی اپنے باپ دادا کی سی زندگی اپنانے پر مجبور ہیں۔ یہ اس وقت کے سندھی اور بلوچی سماج کی کراہت زدہ شکل ہے جسے یہ وڈیرے اپنی پوری قوت کے ساتھ جوں کا توں رکھے ہوئے ہے۔ پنجاب ہو یا سندھ، خیبر پختون خواہ ہو یا بلوچستان ان کے عوام کو ان کے اپنوں نے ہی لوٹا۔ بلوچوں کو آج سے نہیں بلکہ پاکستان بننے سے بھی پہلے سے اس کے اپنے سردار ہی لوٹتے آ رہے ہیں۔ اس بات میں پائی جانے والی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بلوچستان میں پائی جانے والی معدنیات اور دیگر وسائل سے غیر بلوچ بھی مستفید ہوئے ہیں۔ لیکن عام آدمی کو بلوچستان کے وسائل سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ ماضی پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسے آج کے سرداروں اور انکے آباؤ اجداد نے ہی کئی بار فروخت کیا۔

بلوچستان کے ایک سردار نے 1885 میں اپنے علاقے میں تیل اور معدنیات کے ذخائر صرف 200 روپے ماہانہ پر برطانوی حکومت کو فروخت کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ 1861 میں جام صاحب آف لسبیلہ نے 900 روپے ماہانہ کے عوض برطانوی حکومت سے معاہدہ کرتے ہوئے اپنے علاقے سے انگریز کی تار اور ٹیلی فون لائنوں کی تنصیب اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ 1881 میں خان آف قلات نے دشت میں بیٹھ کر 25000 روپے کے عوض انگریز کو کوئٹہ اور اس سے ملحقہ علاقے ان کی عملداری میں دے دیے۔ 1883 میں انگریز نے بگٹی سردار مہراب خان کو خدمات انجام دینے کا انعام 5500 روپے دیا جو انگریز

ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بلوچ سردار خود ہی بلوچ عوام کے وسائل غیر ملکیوں کو بیچتے رہے جن میں بلوچ عوام کا کوئی حصہ نہ تھا۔ قیام پاکستان سے لیکر آج تک بلوچستان کو ملنے والے فنڈز کو شمار کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کو عوام پر خرچ کیا جاتا تو آج اس صوبے میں غربت اور جہالت کا نام تک باقی نہ رہتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک غریب عوام نے ان جاگیرداروں کے لیے بنایا تھا سو وہ اس کے وسائل کو اپنے لیے خرچ کر رہے ہیں وفاقی حکومتیں بھی اس صوبے کا سالانہ بجٹ ان سرداروں کے حوالے کرتی آئی ہیں۔ اس طرح اسلام آباد بھی بلوچستان کے عوام کو غربت کی دلدل میں دھکیلنے میں اتنا ہی ملوث رہا ہے جتنا یہ سردار۔ بلوچستان میں ایک طرف غریب عوام کے لاکھوں کی تعداد میں بچے سکول جانے کے بجائے چرواہے بن رہے ہیں جبکہ بلوچ سرداروں اور سیاست دانوں کی اولادیں امریکہ، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں زیر تعلیم ہیں اور عیش وعشرت کی زندگی گزار رہی ہیں۔ یہ شاہانہ اخراجات کون ادا کررہا ہے؟ آج صوبے کا بجٹ اپنی ذات پر خرچ کرنے والے یہ سردار اور خوانین ان غریبوں کو حکومت کے خلاف صف آراء کررہے ہیں۔ بلوچستان کے ایک سینیٹر نے جون 2006 میں اپنے ایک انٹرویو میں یہ دھمکی دی کہ "وہ وقت دور نہیں جب ہمارے بلوچ جوان پچیس پچیس کروڑ روپے مالیت کے ہیلی کاپٹروں کو اڑاتے ہوئے پاکستان کے شہروں پر بمباری کریں گے"۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا کہ ہیلی کاپٹر زاڑانے کی یہ جوان تربیت کہاں سے حاصل کریں گے؟۔ شواہد سامنے آچکے ہیں کہ لاپتہ نوجوانوں کی اکثریت ایسے افراد پر ہی مشتمل ہے۔ جو بیرون ملک بیٹھے ہوئے ہیں۔

## بلوچستان میں معدنیات کا مختصر جائزہ

ہندوستان کی تقسیم کے بعد 48-1947ء میں جیولوجیکل سروے آف پاکستان (GSP) کا دفتر کوئٹہ میں قائم کردیا گیا اور اس محکمے کو سارے پاکستان کے ارضیاتی سروے اور معدنی وسائل کو ڈھونڈنے کا کام سونپا گیا۔ اس کے پہلے سربراہ جیولوجیکل سروے آف انڈیا کے ایک انتہائی ماہر ارضیات ڈاکٹر ہنری کروک شینک تھے جنھوں نے تقسیم کے بعد پاکستان آکر جی ایس پی کی بنیاد رکھنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ ڈاکٹر کروک شینک کی تجربہ کار آنکھوں

نے پاکستان میں جی ایس پی کے قیام کے لئے کوئٹہ کا انتخاب اسی بنا پر کیا تھا کہ بلوچستان میں معدنی دولت ملنے کے آثار نمایاں تھے اور کچھ دھاتوں کے بارے میں معلوم بھی تھا۔ جیسے مسلم باغ کا کرومائیٹ (Chromite)۔ مسلم باغ کو اس زمانے میں ہندو باغ کہا جاتا تھا۔ جی ایس پی نے چاغی کا سروے بھی 1950ء کی دہائی میں شروع کیا اور سیندک کے مقام پر تانبے کے ذخائر کا پتہ چلا لیا۔ اس طرح ڈاکٹر کروک شینک نے مسلم باغ کے کرومائیٹ سے لے کر چاغی کے سیندک والے تانبے اور لسبیلہ کے میگنیز (Maganese) کے آثار پر خود کام کیا اور اپنے ماتحت ماہرین سے بھی کروایا۔

یہ بات یاد رکھی جائے کہ جی ایس پی نے بلوچستان اور سارے پاکستان کے معدنی وسائل کی تلاش میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلوچستان کے تقریباً تمام دھاتی اور غیر دھاتی منرلز (Minerals) کی تلاش، نقشہ بندی اور تحقیقات کا کریڈٹ جی ایس پی کو جاتا ہے۔ کم سے کم ابتدائی طور پر صوبائی محکموں جیسے بلوچستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی (بی ڈی اے) کا بھی کردار ہے مگر ثانوی طور پر۔

بلوچستان کے منرلز (Minerals) اور سجاوٹی پتھر (Decorative Stones) کی تعداد کہنے کو تو بہت ہے مگر مقدار اور تجارتی اہمیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو صرف مندرجہ ذیل معدنیات ہی قابل ذکر ہیں جو کان کنی کے لائق ہیں۔

1۔ ایلومینیم: اس کے بڑے ذخائر زیارت اور قلات کے علاقوں میں ہیں۔ قسم کے لحاظ سے یہ باکسائیٹ اور لیٹرائٹ کہلاتے ہیں۔

2۔ کرومائٹ: مسلم باغ، خضدار اور لسبیلہ کے مقام پر ملتا ہے مگر ذخائر محدود ہیں۔ مسلم باغ میں اس کی چھوٹے پیمانے پر وقتاً فوقتاً کان کنی بھی ہوتی رہی ہے۔

3۔ تانبا: چاغی میں سیندک اور ریکوڈک جیسے مقامات پر اس کے بڑے ذخائر ہیں جن کے تخمینے پانچ بلین ٹن سے بڑھ کر بتائے جاتے ہیں۔ یہ غیر ملکی کمپنیوں کے بڑے پراجیکٹ ہیں جن پر ہم آگے چل کر مزید بات کریں گے۔

4۔ سیسہ اور جست: خضدار اور لسبیلہ کے علاقوں میں ان کے کم و بیش 60 ملین ٹن سے زیادہ ذخائر موجود ہیں۔ جنوبی کیر تھر بیلٹ کے علاقے دودر میں بھی دس ملین کا ذخیرہ ملا

ہے۔

5۔لوہا: چاغی میں آتش فشانی چٹانوں میں ملا جلا لوہا بھی کوئی ایک سو ملین ٹن کے لگ بھگ ہے اور زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

6۔سونا: چاغی میں سینڈک اور ریکوڈک کے مقام پر مناسب مقدار میں ہے۔ چاغی میں چاندی، مولی بڈنم، یورینیم اور ٹنگسٹن بھی کچھ مقدار میں ہے۔

7۔پلاٹینم: مسلم باغ، ژوب، خضدار اور لسبیلہ کے علاقوں میں موجود ہے۔ تفصیل سے اس پر کام نہیں ہوا ہے۔

8۔ٹائی ٹینیم اور ذرکن: یہ مکران کی ریت میں پائے گئے ہیں۔ مکران اور سیاہان کے علاقے میں اینٹی منی اور سونا چاندی بھی ملا تھا۔

9۔ایلم: یہ مغربی چاغی میں کوہ سلطان آتش فشاں پہاڑ سے نکلتا ہے اور رنگ سازی اور چمڑے کی صنعت میں کام آتا ہے۔

10۔ایس بس ٹاس: ژوب سے نکلتا ہے۔

11۔بیرائٹ: کوہ سلطان، چاغی، لسبیلہ اور خضدار کے علاقوں سے نکلتا ہے۔ رنگوں اور ڈرلنگ کمپاؤنڈز بنانے کے کام آتا ہے۔

12۔فلورائٹ: قلات میں دالبندین اور آس پاس کے علاقوں میں اچھے ذخائر ہیں۔

13۔جپسم: یہ اسپن تنگی، ہرنائی اور چم لانگ کی طرف ملتا ہے۔

14۔چونے کا پتھر: بلوچستان میں بھرا پڑا ہے۔ ذخائر پانچ بلین ٹن کے اندازوں سے کہیں زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ سیمنٹ بنانے کے کام آتا ہے۔ وکی، بارکھان، کوئٹہ، ہرنائی، شاہرگ، خضدار، قلات اور لسبیلہ کے علاقوں میں بھرپور ملتا ہے۔

15۔ڈولومائٹ: قلات اور خضدار میں لائم سٹون کے ساتھ ملتا ہے۔

16۔سجاوٹی پتھر: جیسے ماربل، آنکس، سرپنٹائن، گرینائٹ، ڈائیورائٹ، گیبرو، بسالٹ، رائیو لائٹ، اور کوارٹزائٹ بلوچستان میں چاغی، خضدار اور لسبیلہ کی طرف بڑی مقدار میں پائی جاتے ہیں۔ لسبیلہ کے سجاوٹی پتھروں میں سرپنٹائن، پکچر مارل سٹون، ریفل، لائم سٹون، ماربل اور کئی قسموں کا فریکچر ڈ لائم سٹون مقبول ہیں اور کراچی کی

کا میج انڈسٹری کو سپلائی ہوتے ہیں۔ جہاں ان سے فرش اور دیواروں کے لئے ٹائلز اور آرائشی برتن وغیرہ بنا کر ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔

17۔ابریسوز: یہ وہ سخت قسم کے منرلز ہوتے ہیں جن کی مدد سے دوسرے منرلز کو، جو نسبتاً نرم ہوتے ہیں، کاٹا جاتا ہے اور پالش کیا جاتا ہے۔ مثلاً گارنٹ، پاسں، پارلائٹ اور بسالٹ وغیرہ۔ یہ سب چاغی کے علاقے میں دستیاب ہیں اور کچھ ژوب کی طرف۔

18۔نمکیات: اس مد میں ہم بوریکس، بوریٹس، سلفائیڈ اور کاربونیٹس کا نام لے سکتے ہیں۔ جو چاغی، لسبیلہ، پنجگور اور مکران کی طرف ملتے ہیں جہاں نمک بھی ہوتا ہے۔

19۔گندھک: چاغی اور اورکچھی ڈسٹرکٹ میں ملتی ہے۔

20۔فرٹیلائزر: پوٹاشیم چاغی اور کچھی ڈسٹرکٹ میں، نائٹریٹ چاغی میں اور فاسفیٹ بولان کے آس پاس کے علاقوں میں ملتا ہے۔ میگنیشیم خضدار، قلات، مسلم باغ اور ژوب کے علاقوں میں ہوتا ہے۔

21۔رنگ سازی کی مد میں زرد آکر زیارت ڈسٹرکٹ میں ملتا ہے اور ٹالک زیارت مسلم باغ کی طرف پایا جاتا ہے۔

22۔میگنی سائٹ: ژوب، مسلم باغ اور لسبیلہ کے علاقوں کی آتشی چٹانوں کے ساتھ ملتا ہے، جن کے لاوے کے ساتھ میگنیز بھی ملتا ہے۔

23۔سیلسائٹ: یہ کوہلو، ڈیرہ بگٹی، بارکھان اور لورالائی کی طرف پایا جاتا ہے۔

24۔جم سٹونز: بلوچستان میں اتنے اچھے جم سٹونز نہیں جیسے شمالی پاکستان میں ہیں۔ قابل ذکر پتھر یہ ہیں: گارنٹ وغیرہ، سفید اور ہرا کوارٹز، جسے بلور یا سنگ مردار بھی کہا گیا ہے۔ کئی اقسام کے عقیق، فیروزہ، کری سوکولا، مالاکائٹ، ذرکن، جیڈ، جاسپر، لاپس لزولی یعنی لاجورد وغیرہ۔ سٹرین، آئیڈوکریز، کرسوپریز اور ایمی تھسٹ وغیرہ بھی ملتے ہیں مگر کوالٹی اور مقدار کا اندازہ کم ہے۔

بلوچستان میں سلی کا سینڈ بھی ملتی ہے اور سرمہ بھی چمن فالٹ کے ساتھ ملا ہے۔

بلوچستان میں معدنی وسائل کی تحقیقات اور تلاش میں بہت سی مشکلات کا سامنا رہا

ہے۔ ایک تو علاقہ ہی بنجر، بیابان، پہاڑی، صحرائی اور وسیع و عریض ہے جہاں ایک طرف سڑکوں کی قلت تھی اور دوسری طرف قبائلی سرداروں کی رضامندی و دوستی کہیں حاصل تھی اور کہیں نہیں۔ پاکستان میں جی ایس پی کے قیام سے لے کر آج تک باہمی جھگڑوں نے ملک و قوم کا نقصان کیا ہے۔ معصوم جانوں کا زیاں ہوا ہے اور جیولوجسٹ بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔

## ریکوڈک منصوبہ اور غیر ملکی مداخلت

آج کل دنیا بھر میں قدرتی وسائل کے حصول اور ان پر بھرپور کنٹرول کے لئے لڑی جانے والی جنگ سے متاثر ہونے والوں میں بلوچستان بھی شامل ہے۔ یہ جنگ 20ویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے فریقین مشرق و مغرب کی بڑی طاقتیں ہیں۔ ہر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک کو تیل، گیس اور کوئلے کے علاوہ صنعتی دھاتوں اور غیر دھاتوں کی ضرورت ہے۔ روس اور برازیل قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں مگر چین اور بھارت اپنی بڑی آبادیوں کی وجہ سے وسائل رکھنے کے باوجود ضرورت مند ہیں اور ایشیاء کے دوسرے ممالک میں، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں وسائل ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف مغربی طاقتیں اپنے روایتی ہتھکنڈوں سے اپنا اثر ورسوخ اور سیاسی و معاشی کنٹرول بڑھانے کی تگ ودو میں لگی رہتی ہیں۔ اس سرد جنگ میں پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک دونوں طرف کی کھینچا تانی کا شکار ہوتے ہیں۔ افریقہ، افغانستان اور دنیائے عرب پر مغرب کی بندرگاہ کی تعمیر اور اندرون ایشیاء کو جاتی پھیلتی پھولتی تجارتی سڑکوں کے خواب، بھی اس جیو پالیٹکس کا شکار نظر آتے ہیں۔

ترکی کی سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد اہل مغرب نے عرب دنیا میں جو بندر بانٹ مچائی اور نئی ریاستیں تشکیل دی تھیں، ان کا خمیازہ اس علاقے کے مسلمان گزشتہ نوے برس سے بھگت رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمان اور دوسری ایشیائی طاقتیں کیا بلوچستان میں ہونے والے کھیل کو روک سکتی ہیں یا نہیں، پاکستان کے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے اور ہم خود ہی اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں۔ یہ مسئلہ سارے ایشیاء کا ہے مگر پہلے ہمارا ہے۔

ریکوڈک کی کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ جولائی 1993ء میں بلوچستان حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت ایک دیوزاد آسٹریلوی ایکسپلوریشن اور مائننگ کمپنی

"بی ایچ پی" نے چاغی کے علاقے میں کام شروع کیا تھا۔ 2000ء کے لگ بھگ دونوں پارٹیوں کے درمیان ایک جائنٹ وینچر کے معاہدے کے تحت بی ایچ پی کا حصہ 57 فیصد اور 43 فیصد تھا۔ بعد ازاں، بوجوہ بی ایچ پی اپنا حصہ "ٹیتھین کاپر کمپنی" کو دے کر نکل گئی، جو ایک کینیڈین دیوازد کمپنی اور ایک چلی کی کمپنی انٹافگاسٹا کا جائنٹ وینچر ہے۔ جس کو ہم ٹی سی سی کہیں گے۔ ٹی سی سی نے اپنی جیب سے 604 ملین ڈالر لگا کر پندرہ بیس سال کی محنت کے بعد اپنی فزیبلٹی رپورٹ بنائی جس کے مطابق ریکوڈک کے مقام پر جو مغربی چاغی میں واقع ہے، تانبے اور سونے کے ذخائر موجود ہیں جن کا تخمینہ یوں ہے کہ تانبہ 21.3 ملین ٹن اور سونا 12 ملین اونس ہے۔ یہ بھی سنا گیا کہ ریکوڈک کے ایک دوسرے مقام پر H14-15 نام کے ڈیپازٹ میں 81 ملین ٹن تانبا اور 23 ملین اونس سونا اس کے علاوہ ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک کمپنی اپنے اندازوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کرتی ہے، اس لئے کہ اسے مزید معلومات ملتی رہتی ہیں۔ ٹی سی سی کے مطابق ریکوڈک کے ذخائر یہ ہیں 5.9 بلین ٹن اور میں تانبا 0.4 فیصد اور سونا 0.22 گرام فی ٹن ہے۔ جس سے سالانہ دو لاکھ ٹن تانبا اور ڈھائی لاکھ اونس سونا نکلے گا۔ یہ پراجیکٹ 65 سال چلے گا اور 3.3 بلین ڈالرز کا خرچہ ہوگا۔

دوسری طرف بلوچستان حکومت بزعم خود کام شروع کر کے ایک ریفائنری بھی بنانے کا قصد کرتی نظر آتی ہے۔ ایک اخبار کے مطابق حکومت نے اس کام کیلئے 120 بلین روپوں کی رقم بھی رکھی ہے۔ رہی بات علمی اور تکنیکی مہارت اور ٹیکنالوجی کی جو اتنے بڑے کاموں کے لئے چاہئیں، تو وہ کہاں۔ مثلاً پاکستان کے مایہ ناز ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر ثمر مبارک مند نے 2010ء میں پاکستان سپریم کورٹ میں کچھ ایسی بات کی کہ اگر پاکستان ریکوڈک کو خود مائن کرے تو وہ دو بلین ڈالر سالانہ کما سکتا ہے اور خود نہ کرے تو فقط 160 ملین ڈالر کی رائلٹی ملے ہی گی۔

پاکستان میں آج بھی تقریباً ساٹھ ہزار بیرل تیل روزانہ نکلتا ہے جبکہ ضرورت اس سے پندرہ بیس گنا زیادہ کی ہے۔ اسی طرح گیس بھی ضرورت سے بہت کم نکلتی ہے۔ جبکہ مزید نکالی جا سکتی ہے۔ مگر بوجوہ ایسا نہیں ہو رہا۔ اس اثناء میں ہماری صنعتوں کا دیوالیہ نکل رہا ہے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ بڑی انٹرنیشنل کمپنیوں کو پاکستان کے علاوہ اور

بہت سے آپشنز ہیں جو انہیں بہتر نظر آتے ہیں۔ سیندک کے پراجیکٹ کو کئی کمپنیوں نے دیکھا، جانچا اور بات نہیں بنی۔ کبھی یہ سنا کہ پانی نہیں ہے وہاں اور ذخائر بھی اتنے بڑے نہیں، وغیرہ۔ پھر ایک چینی کمپنی نے آخر کار 2003ء میں اس پر کام شروع کیا اور کر رہی ہے، ان کی اکنامک انالسز مغربی کمپنیوں جیسی نہیں ہوتی جو سرمائے پر ایک خاص ''ریٹ آف ریٹرن'' مانگتی ہیں اور زیادہ رسک کی حامل ہوتی ہیں۔ حالات کو دیکھتے ہوئے وہ رسک نہیں لینا چاہتی تھیں۔

مگر افغانستان میں مغربی یلغار نے حالات کو بدل دیا آج کے دور میں سیٹلائٹس کی مدد سے ریموٹ سنسنگ کے آلات اور تکنیک استعمال کر کے انسان زمین پر فیلڈ ورک کئے بغیر قدرتی وسائل کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ امریکن ارضیاتی ماہرین (جن کا تعلق USGS یعنی یونائٹڈ سٹیٹس جیولوجیکل سروے سے تھا) نے افغانستان سمیت بہت سے ممالک کا معدنی سروے ریموٹ سنسنگ سے ہی کر رکھا ہے۔ اور افغانستان میں فوج کے ساتھ ساتھ جیولوجسٹ بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے جانا ہے کہ یہ سرزمین بہت سی دھاتوں، غیر دھاتوں اور نایاب منرلز جیسے لیتھیم کے بہت بڑے ذخائر رکھتی ہے۔ افغانستان کا قبائلی کلچر ایسے وسائل کو اپنے طور آج تک استعمال میں نہ لا سکا اور نہ بڑی دیر تک اس قابل ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ وہاں جم سٹونز جیسے روبی، لاپس، تورملین اور بہت کچھ ہے، اب مغربی کمپنیاں ان کا حصول چاہتی ہیں۔

## بلوچستان میں محرومی، اعتماد کا فقدان اور علیحدگی کی تحریک

گذشتہ ڈیڑھ عشرے سے جاری خانہ جنگی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان، ایران اور افغانستان میں منقسم، اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار بلوچستان کے عوام سیاسی و عسکری قیادت کی طرف سے جس توجہ اور ہمدردی کے مستحق ہیں ان کو کبھی نہیں ملی۔ یہ بات درست ہے کہ پاکستان کا یہ علاقہ جغرافیائی طور پر ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں سے افغانستان، ایران اور دیگر کئی ممالک کی نگرانی کی جا سکتی ہے۔ قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کی بدولت اور تزویراتی گہرائی کے پیش نظر عالمی طاقتوں کی توجہ کے مرکز بننے والے صوبہ بلوچستان کے ہمسائے ملک افغانستان میں جاری دس سالہ جنگ نے بھی اس خانہ جنگی

میں اہم کردار ادا کیا ہے جہاں سے اسلحہ اور غیر ملکی امداد آسانی سے یہاں منتقل ہوتی رہی ہے۔
یہ بھی درست ہے کہ وفاقی حکومت کی طرف سے دیے گئے ترقیاتی فنڈز، صوبے کی دولت اور وسائل چند قبائلی سردار اور جاگیردار اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی تسلیم شدہ بات ہے کہ یہ سردار بلوچستان کی ترقی اور تعلیم میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں تاکہ کوئی ان کی مطلق عملداری کو چیلنج نہ کر سکے اور عام بلوچوں کو خانہ بدوشوں و چرواہوں کی زندگی تک ہی محدود رکھا جا سکے۔
سردار زادوں کے غیر ملکی رابطے اور بلوچستان میں بھارت، امریکہ اور اسرائیلی ایجنسیوں کی مداخلت واقعی ایک گھناؤنا عمل ہے جو پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔
لیکن مرکز سے دور واقع اس صوبے کے حالات پر توجہ دینے کی وفاقی حکومت نے کبھی زحمت گوارہ نہیں کی۔ علیحدگی پسندوں کا ساتھ کون لوگ دے رہے ہیں، ان کے مطالبات کیا ہیں؟ ان کی آواز کیا ہے؟ ذیل میں صوبے میں پرورش پانے والی نفرت، احساس محرومی اور غصے کی وجوہات کا جائزہ لیا گیا ہے جو موجودہ خانہ جنگی کا باعث ہیں اور طویل عرصے سے بلوچ عوام کا مقدر بنی ہوئی ہیں۔

غربت، ناخواندگی، بے روزگاری، ناانصافی، کرپشن، معاشی امتیازی سلوک اور ملکی قیادت پر اعتماد کا فقدان بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک اور دہشت گردی کو تقویت پہنچانے والے عوامل تصور کیے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان کے لیبر فورس سروے 2003,4 کے مطابق پاکستان کے دیہی علاقوں میں بے روزگاری کی شرح 9.7 فیصد بتائی گئی جبکہ بلوچستان میں یہ 12.5 فیصد کے حساب سے پائی جاتی ہے۔ کراچی کے ایک ادارے 'سماجی پالیسی وڈویلپمنٹ سنٹر' کے مطابق بلوچستان میں پنجاب کی نسبت دوگنا زیادہ غربت پائی جاتی ہے جہاں ہر دوسرا شخص خط افلاس سے نیچے زندگی گزار رہا ہے، صوبے کی نصف آبادی (پچاس لاکھ) کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے، صوبے کے آدھے بچے سکول میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کے کل رقبے کے 44 فیصد حصے پر مشتمل بلوچستان میں اس وقت 5 یونیورسٹیاں، 400 ہائی سکول، 800 مڈل سکول، 11000 پرائمری اور 73 کالج ہیں۔ ایک کروڑ کی آبادی والے صوبے میں اس قدر کم تعلیمی ادارے سیاسی حکومتوں کے قبائلی سرداروں اور وڈیروں سے 'خاص تعلقات' کے سبب ہے ورنہ پاکستان میں شامل ہونے کے بعد بلوچستان میں سے نکلنے والی

صرف گیس کی مالیت کا اگر نصف حصہ بھی خرچ کیا جاتا تو بلوچستان میں رہنے والے ہر شہری کو تعلیم کی سہولت بہم پہنچائی جا سکتی تھی۔

پاکستانی حکومتی اداروں کے سروے کے مطابق، بلوچستان میں مردوں میں شرح خواندگی 36.5 فیصد جبکہ عورتوں میں 15.0 فیصد ہے۔ اس طرح مجموعی شرح خواندگی 26.6 فیصد بنتی ہے۔ بولان، جھل مگسی، جعفر آباد، چاغی، خاران اور ڈیرہ بگٹی میں سب سے کم شرح تعلیم ہے۔ 19 اضلاع میں کوئی ٹیچر ٹریننگ سینٹر نہیں، پورے صوبے میں صرف ایک ادارے میں پی ایچ ڈی کرائی جاتی ہے۔ اسی طرح صرف ایک ادارہ ایسا ہے جہاں ایم فل کرنے کی سہولت ہے جبکہ پورے بلوچستان میں دو اداروں میں ایم ایڈ اور 16 میں بی ایڈ کرایا جاتا ہے۔ صوبے میں خواتین کے 5 اور مردوں کے 6 ٹیچر ٹریننگ سنٹرز ہیں۔ 1997 تا 2002 تک بلوچستان میں شرح نمو 2.6 رہی جبکہ سماجی ترقی کی شرح 4.5 فیصد تھی۔ صوبے کے دو اضلاع تربت اور گوادر کو ہر سال سیلاب ڈبو دیتا ہے اور بھاری بارشوں کے سبب ساحلی بند ٹوٹ چکے ہیں، سارا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس طرح اہم شہروں کے علاوہ صحت کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بڑی بڑی ہائی ویز اور پختہ سڑکوں کے استعمال کے متعلق بلوچوں کو ادراک ہو چکا ہے کہ یہ ان کے لیے نہیں بلکہ غیر ملکی سامان کی رسد کے لیے بنائی گئی ہیں۔ بڑی سڑکوں سے ہٹ کر سو ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر تو بجلی ہے نہ پانی، تعلیمی ادارے ہیں نہ ہسپتال۔ وڈیروں نے جہاں وفاقی حکومت کو کہا وہاں بجٹ خرچ کیا جاتا رہا ہے۔

اس کے برعکس پنجاب میں شرح خواندگی 62 فیصد ہے اور تعلیم بالغاں کے لیے بھی ایک کثیر بجٹ مختص کیا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب کے مشیر برائے لٹریسی و نان فارمل ایجوکیشن کے مطابق صوبے میں نوجوانوں میں شرح خواندگی 74 فیصد ہے۔ پنجاب کے شہری علاقوں میں 10 سال سے زائد افراد میں شرح خواندگی کا تناسب 76 فیصد ہے جبکہ دیہات میں یہ 53 فیصد ہے۔ اس عمر کی خواتین میں خواندگی کی شرح شہری اور دیہی علاقوں میں بالترتیب 71 اور 42 فیصد ہے۔ مجموعی طور پر پنجاب میں 7 کروڑ 32 لاکھ افراد خواندہ اور 2 کروڑ 28 لاکھ ناخواندہ (ان پڑھ) ہیں۔ لیکن پنجاب میں بھی علاقائی محل وقوع بدلنے سے یہ تناسب اگرچہ [illegible]یل ہو جاتا ہے لیکن بلوچستان سے یہ پھر بھی ڈیڑھ سو گنا زیادہ ہے۔ راولپنڈی میں 15 سال

سے زائد عمر کے افراد میں شرح خواندگی 71 فیصد ہے جبکہ راجن پور میں یہی شرح کم ہو کر 34 فیصد رہ جاتی ہے۔ پنجاب میں ناخواندہ افراد کو خواندہ بنانے اور 2015 تک شرح خواندگی 75 فیصد کرنے کے لیے اس وقت ملکی اور بیرونی اداروں کی مالی معاونت سے ضلع کی سطح پر 1270 مراکز اور لٹریسی ایجوکیشن کے لیے 46 ہزار مراکز کے منصوبے کا قیام زیر عمل ہے۔ جس پر 12 ارب روپے خرچ ہوں گے۔ صوبہ پنجاب میں سرکاری ذرائع کے مطابق تعلیم بالغاں کے لیے 1 لاکھ 32 ہزار مراکز کی تعداد مقرر کی گئی ہے جہاں 65 لاکھ افراد کو تعلیم دی جائے گی۔ اس طرح ایک سال میں 3 لاکھ 20 ہزار افراد کو بنیادی رسمی تعلیم سے بھی بہرہ مند کیا جائے گا۔

پاکستان کے دیگر صوبوں کی سیاسی جماعتوں کے مسلسل پروپیگنڈے اور مرکزی حکومت کے امتیازی سلوک کے سبب ان کے عوام میں پنجاب کے خلاف یہ تاثر راسخ ہو چکا ہے کہ پنجاب ان کا استحصال کر رہا ہے اور ان کے وسائل سے مضبوط ہو رہا ہے۔ بلوچستان میں پنجابیوں کو جس ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا اور جن حالات میں ان کی اکثریت کو صوبہ بدر کیا گیا یہ بلوچوں میں پائی جانے والی نفرت کا نتیجہ ہے۔ پاکستانی فوج میں بھی چونکہ پنجابیوں کی اکثریت ہے لہٰذا وہ فوج کو پنجاب کی فوج تصور کرتے ہوئے موقع ملنے پر اسے نشانہ بناتے ہیں۔ حالانکہ فوج ہی وفاق کو قائم کیے ہوئے ہے اور ملکی سلامتی کی ضامن ہے۔ گوادر پورٹ بھی مرکز اور صوبے کے درمیان تنازعہ بنی ہوئی ہے۔

بلوچستان کے لوگ اس مرتبہ پانچویں فوجی کاروائی کا شکار ہیں لیکن ناعاقبت اندیش حکمران مسئلے کے حل کے بجائے اس پر سیاست چمکانے لگے اور ابتداء میں اس کاروائی کو فراری کیمپوں کے خلاف ایف سی کا آپریشن قرار دیا گیا اور بلوچوں کی نسل کشی کی گئی۔ جب بلوچستان میں گن شپ ہیلی کاپٹروں اور جیٹ طیاروں کا استعمال شروع ہوا تو بلوچوں کو یقین ہو گیا کہ اب ان کو بے دریغ قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ قبائلی سردار اور ان کی اولادیں بھاگ کر افغانستان، ایران، لندن اور امریکہ چلے گئے جنہوں نے وہاں پاکستان کے خلاف خوب زہر اگلا۔ دوسرا سیٹلائٹ کے دور میں اس آپریشن کو دنیا سے اوجھل رکھنا ناممکن تھا۔ مبصرین کہتے ہیں کہ اس وقت کی حکومت (جنرل پرویز مشرف) زمینی حقائق کا ادراک نہ کر سکی کیوں کہ جو کچھ اس بار بلوچستان میں کیا جا رہا ہے یہ اس سے قبل بھی کئی بار کیا جا چکا تھا جس کے ردعمل میں بلوچستان

لبریشن آرمی بنی تھی۔ جنرل پرویز مشرف نے جب قوم پرست بلوچوں سے مذاکرات کرنا چاہے تو مندرجہ ذیل شرائط عائد کیں۔ اول یہ کہ قبائلی سرداروں کے لشکر غیر مسلح ہو جائیں، دوم تیل اور گیس کی تلاش کرنے والوں اور ترقیاتی کاموں میں حصہ لینے والے ورکروں کو نقصان پہنچانا چھوڑ دیں، سوم یہ کہ بلوچستان کو مستقبل میں گیس کی تنصیبات کے حوالے سے کوئی مراعات اور فنڈز نہیں ملیں گیا اور ریاست کے اندر ریاست برداشت نہیں کی جائے گی۔ اس کے برعکس علیحدگی پسندوں کا مطالبہ تھا کہ حکومت بلوچوں کے خلاف فوجی کارروائی بند کرنے میں پہل کرے تو وہ مسلح جدوجہد بند کر دیں گے دوم یہ کہ بلوچستان کے وسائل پر بلوچ عوام کے حق کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن بلوچوں نے غیر مسلح ہونا قبول نہ کیا کیونکہ ان کے سامنے ماضی میں کیے جانے والے تمام حکومتی معاہدے، وعدے اور پیشکشوں کا حال تھا جن میں مختلف پاکستانی حکومتوں نے ان کو دھوکے میں لاکر نقصان پہنچایا تھا۔ بلوچوں کا یہ بھی موقف ہے کہ پاکستان نے خان آف قلات پر دباؤ ڈال کر انکی ریاست کو پاکستان میں شامل کیا تھا اسی لیے خان آف قلات کے چھوٹے بھائی آغا عبدالکریم نے اس جبری انضمام کے خلاف بغاوت شروع کر دی تھی۔ اس بغاوت کو روکنے کے لیے آغا عبدالکریم اور اس کے ساتھیوں سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ پہاڑوں سے نیچے اتر آئیں تو ان کو تحفظ دیا جائے گا۔ علیحدگی پسندوں کا کہنا ہے کہ یہ حلف قرآن پر دیا گیا۔ لیکن جب عبدالکریم اور ان کے ساتھی نیچے اترے تو ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو طویل عرصے تک جیلوں میں بند رکھ کر تشدد کیا گیا۔

علیحدگی پسند یہ کہتے ہوئے بھی سنے گئے کہ 1958 کے مارشل لاء سے ایک دن پہلے پاکستان کی مسلح افواج نے ایک بار پھر قلات پر چڑھائی کی اور قلات کی جامع مسجد کے مینار پر لہرانے والے ریاست کے سبز وسرخ پرچم، جس پر کلمہ طیبہ اور اللہ اکبر درج تھا کو شدید گولہ باری کا نشانہ بنایا گیا۔ خان آف قلات قرآن پاک ہاتھ میں لے کر باہر آیا اور اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اس دوران اندھا دھند فائرنگ سے کئی لوگ مارے گئے۔ خان آف قلات کو لاہور جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس پر خان آف قلات نے کہا تھا کہ یہ ایک ایسی غارت گری تھی جس نے صدیوں پرانے تاتاری کارناموں کو مات دیدی۔ ان واقعات کے نتیجے میں ایک دوسرے 90 سالہ سردار نوروز خان نے بغاوت کی تو اسے بھی قرآن پر حلف دیکر وعدہ کیا گیا

کہ اسے پورا تحفظ دیا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ بھی وعدہ خلافی کی گئی اور اسے بھتیجوں اور ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے حیدرآباد جیل میں بند کر دیا گیا۔ 1960 میں اس کے بیٹے، بھتیجوں کو پھانسی دیدی گئی اور سردار نوروز خان پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ چار سال بعد وہ کوہلو جیل میں مر گیا۔ اس ماضی کو دیکھتے ہوئے نواب اکبر خان بگٹی نے غیر مسلح ہو کر جنرل پرویز مشرف سے مذاکرات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بعد میں اسے بھی فوج نے مار دیا۔

20 سالہ غیر ملکی مداخلت اور اکبر بگٹی کے قتل کے بعد کی ہنگامہ خیز صورتحال اپنی جگہ، لیکن 2008ء کے انتخابات میں بننے والے اتحاد اے پی ڈی ایم کو قائم رکھا جاتا تو صورتحال کو سنبھالنا بہت آسان تھا کیونکہ اے پی ڈی ایم میں ملک میں پہلی بار تمام قوم پرست جماعتیں جو پہلے پونم میں اکٹھی تھیں طویل صلاح مشورے کے بعد نواز شریف پر متفق ہوئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان پر سے غداری کا الزام بھی ہٹ جائے گا اور انہیں مرکز کی سیاست میں نمایاں جگہ بھی مل جائے گی۔ مگر اس اتحاد کے اعتماد کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ ایک بزرگ بلوچ راہنماء سردار اختر مینگل نے فروری 2014 میں بالآخر کہہ ہی دیا کہ نواز شریف بلوچستان کے متعلق کیے گئے وعدے بھول چکے ہیں۔ 2008 میں جب قوم پرست الیکشن لڑنے کی بات کر رہے تھے تو میاں نواز شریف نے بضد ہو کر سب کو الیکشن کے بائیکاٹ پر آمادہ کیا اور جب سبھی لوگ مان گئے تو انہوں نے اچانک الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے اعتماد ختم ہو گیا جس کا فائدہ علیحدگی پسندوں نے اٹھایا۔

## بلوچستان کے علیحدگی پسند گروپ اور ان کے علاقے

مدتوں سے اس صوبہ میں رہنے والے غیر بلوچوں کو آج بھی ''ڈومیسائل'' کہا جاتا ہے۔ بلوچستان کہلانے والے اس صوبہ میں بلوچوں کی تعداد تقریباً 40 فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ بلوچ قبائل میں بگٹی، مری، مگسی، جمالی، رند، ڈومکی، بنگلزئی، قیصرانی، رخشانی، نوشیروانی، گچکی، جاموت اور لاسی شامل ہیں اور یہ زیادہ تر ڈیرہ بگٹی، بی، کوہلو، جھل مگسی، بولان، جعفر آباد، نصیر آباد، خاران، کیچ، ہزمائی، مستونگ، آواران، لسبیلہ اور کوئٹہ میں پائے جاتے ہیں۔

اب کچھ معلومات ''آزاد بلوچستان'' کے حامی قوم پرست گروپس کے بارے میں

جو تھوڑی سی حیران کن بھی ہو سکتی ہیں۔

بلوچ لبریشن آرمی (BLA) کے سربراہ ہربیار مری ہیں۔ قوت 800 تا 900 افراد پر مشتمل اور زیر اثر علاقے ہیں کوئٹہ، کوہلو، سبی، قلات، مستونگ، نوشکی۔ بلوچ لبریشن فرنٹ (BLF) کے سربراہ ہیں ڈاکٹر اللہ نذر، قوت 800 تا 900 افراد اور زیر اثر علاقے ہیں خضدار، آواران، قلات اور مکران۔ بلوچ ری پبلکن آرمی (BRA) کے سربراہ ہیں براہمداغ بگٹی، قوت 700 تا 800 افراد اور زیر اثر علاقے کوئٹہ، ڈیرہ بگٹی، سبی، جعفر آباد، نصیر آباد۔ لشکر بلوچستان (LB) کے سربراہ کا نام ہے جاوید مینگل، قوت 150 تا 200 افراد جبکہ زیر اثر علاقے خضدار، اور قلات۔ یونائیٹڈ بلوچ آرمی (UBA) کے قائد کا نام ہے زمران مری، قوت 150 تا 200 افراد جبکہ زیر اثر علاقے کوئٹہ، سبی، دشت، مستونگ، بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے سربراہ ہیں بشیر زیب یہ تمام بلوچ اکثریتی اضلاع میں پائے جاتے ہیں۔

ان گروپس کی فنڈنگ کے ذرائع کیا ہیں زبان زد عام ذرائع میں انڈیا، افغانستان، برطانیہ، امریکہ اور بعض خلیجی ملک ان میں شامل ہیں۔ واضح رہے کہ ان تمام گروپوں کا اپنا اپنا ایجنڈا ہے۔

## جب کوئٹہ میں قومی پرچم نذر آتش کیا گیا

جب بلوچستان کے پہاڑوں اور صحراؤں میں لڑی جانے والی پاکستان کی بقا کی جنگ میں امریکہ، اسرائیل اور بھارتی کنسورشیم کے اسپانسرڈ دہشت گردوں کو شکست کا سامنا ہونے لگا تو اس جنگ کو میڈیا کے محاذ پر منتقل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ قومی سلامتی کے اداروں کو ٹیلی فون کی ریکارڈنگز اور بعض گرفتار دہشت گردوں سے تفتیش کے دوران یہ معلومات ملیں کہ دہشت گردوں کو ان کے ماسٹر مائنڈز نے کہا کہ میڈیا اور انسانی حقوق کی تنظیموں کا سہارا لیں۔

سرکاری اداروں کو دستیاب اطلاعات کے مطابق کوئٹہ سمیت دیگر شہروں میں 2011ء میں 14 اگست اور 23 مارچ کو منائے گئے جشن نے دہلی سے واشنگٹن تک دہشت گردوں کے سرپرستوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ 28 مئی 2008ء کو بی ایل اے اور بی ایس او نے کوئٹہ میں ریلی نکالی اور میزان چوک پر آزاد بلوچستان کا پرچم لہرایا اور اعلان کر دیا کہ آج کے بعد کوئٹہ اور کسی دوسرے

شہر میں پاکستان کا پرچم نہیں لہرایا جائے گا اور نہ ہی قومی ترانہ بجایا جائے گا اور اسی چوک میں پاکستان کا پرچم جلایا گیا۔ بلوچستان کے میڈیا کے نمائندوں اور سیاسی ذمہ داران نے اس امر کی تصدیق کی کہ 27 مئی 2008ء کے بعد بلوچستان میں قومی پرچم لہرانا سب سے بڑا جرم تھا اور اسی جرم پر لوگوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بی ایس او کے چیئرمین ذاکر مجید سرکاری سکولوں اور کالجوں میں بھی جا کر آزادی کے لیکچر دیتے تھے اور مذاکرات کرنے والوں کو غدار قرار دیتے تھے۔ کوئٹہ سمیت مختلف شہروں کو دہشت گردوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ کوئٹہ میں مجید لانگو نام کے ایک دہشت گرد کا تسلط قائم تھا جس کی غیر بلوچوں سے نفرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے دسمبر 2009ء میں ایک ایسے صوبائی وزیر شفیق خان کو خود اپنے ہاتھوں سے بر سر بازار قتل کیا، جس نے اکبر بگٹی کے قتل پر سب سے پہلے جلوس نکالا تھا۔ چونکہ شفیق خان پنجابی تھا اس لئے اس کا جرم نا قابل معافی قرار پایا۔ اسی طرح مارچ 2010ء میں ایک مسجد سے عصر پڑھ کر نکلتے ہوئے دو سگے بھائیوں کو اس نے خود قتل کیا۔ اس کے علاوہ خضدار، مکران، پنجگور، بولان اور کوہلو سمیت ہر شہر میں مختلف گروپس کا تسلط تھا اور حالات کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خضدار میں لشکر بلوچستان کے حکم پر نان بائیوں نے فوج کو روٹی اور نان تک فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ قومی سلامتی کے ذمہ دار ادارے کے ایک افسر کی ایک دہشت گردی کی انوسٹی گیشن رپورٹ 2012ء میں سامنے آئی جس میں اس نے کہا کہ 2009ء میں اس کی شادی کی تاریخ طے کی جا رہی تھی تو اس کے غیر ملکی ہینڈلر نے اسے کہا کہ چند ماہ ٹھہر جاؤ آزادی کے بعد شادی کرنا۔ بلوچ دہشت گرد تنظیموں نے بلوچستان کو جس طرح سے تقسیم کر رکھا تھا، اس کی تفصیل اس طرح سے ہے کہ مکران کا پورا علاقہ ڈاکٹر اللہ نذر کی بی ایل ایف، کوئٹہ، بولان اور کوہلو میں حیر بیار کی بی ایل اے، ڈیرہ بگٹی اور نصیر آباد پر براہمداغ کی بلوچ ری پبلکن آرمی اور خضدار سے حب تک اختر مینگل کے بھائی جاوید مینگل کی لشکر بلوچستان نے کنٹرول کر رکھا تھا اور شہروں میں ان تنظیموں کے مسلح دہشت گرد باقاعدہ پریڈ کرتے اور اپنے مرنے والوں کو سلامی دے کر دفن کیا کرتے تھے۔ اس ساری صورت حال کے نتیجے میں قومی سلامتی کے ایک ادارے اور بعض قبائل کے محب وطن بلوچ لیڈروں نے مل کر جواب دینے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے قدم کے طور پر مجید لانگو کی کوئٹہ سے دہشت ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

لانگو کی دہشت کے حوالے سے پولیس کے ایک ریٹائرڈ آفیسر کا کہنا تھا کہ وہ ان دنوں سروس میں تھے اور ان کی نظروں کے سامنے پاکستانی پرچم جلانے، آزاد بلوچستان کا پرچم لہرانے کے واقعات ہوتے رہے۔ مگر پولیس ان دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے فرار کو ترجیح دیتی تھی اور اگر کسی افسر نے معمولی سی مزاحمت بھی کی تو اسے قتل کر دیا گیا۔ کوئٹہ میں سیاسی ذمہ داران بھی لانگو کے ہاں حاضری دینے کو اپنی جان کی ضمانت خیال کرتے تھے۔ مارچ 2010ء میں 2 بھائیوں کے قتل کے بعد ایک روز ایف سی کی دو بڑی گاڑیاں ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے وحدت کالونی کی جانب جا رہی تھیں کہ کلی ابراہیم زئی میں ایک گاڑی رش میں پھنس گئی اور دوسری آگے نکل گئی۔ اوپر فلیٹس میں موجود دہشت گردوں نے ایف سی کی اکیلی گاڑی دیکھ کر اس پر فائر کھول دیا۔ دوسری گاڑی سے بے خبر یہ دہشت گرد گاڑی کو گھیرنے کی خاطر بازار میں اتر آئے۔ جس پر آگے نکل جانے والی گاڑی میں موجود نفری کو انہیں گھیرے میں لینے کا موقع مل گیا۔ طویل مقابلے کے بعد مجید لانگو خود دن دیہاڑے بھرے بازار میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کی لاش اس حال میں اٹھائی گئی کہ انگلیاں گن کے ٹریگر پر پھنسی ہوئی تھیں۔ اس مقابلے کے بعد فورس نے آپریشن کا آغاز کیا اور چند ماہ میں کوئٹہ دہشت گردوں سے آزاد کروا لیا گیا۔ مگر افسوسناک صورت حال اس وقت پیش آئی جب بلوچستان کی صوبائی اسمبلی نے مجید لانگو کے مارے جانے کی شدید مذمت کی اور اس کے لئے فاتحہ خوانی کی۔ اسی طرح خضدار، تربت اور دیگر شہروں میں بھی پاکستان سے محبت رکھنے والے قبائلی نوجوانوں کے تعاون سے کارروائی کی گئی۔ مارچ 2010ء سے مارچ 2012ء تک دو برسوں میں تبدیلی کا یہ عمل اس حد تک پہنچ گیا۔ کہ 14 اگست 2011ء اور 23 مارچ 2012ء کو کوئٹہ، خضدار، تربت، مکران، ڈیرہ بگٹی اور دیگر تمام بڑے شہروں میں بہت بڑے پیمانے پر زور و شور کے ساتھ پاکستان کے پرچم لہراتے ہوئے جشن منائے گئے جسے دہشت گرد اور ان کے سرپرست اپنی ناکامی خیال کرنے لگے۔

سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ بلوچستان ابھی اس ناسور سے پاک نہیں ہوا۔ پوری طرح اس کو آزاد کروانے کی خاطر انتہائی ذمہ داری اور شعور کے ساتھ بھرپور کارروائی کرنا ہوگی کیونکہ فی الحال صرف شہروں سے ان کا زور ختم ہوا ہے جبکہ پہاڑوں پر آج بھی یہ لوگ موجود ہیں۔

اگرچہ شہروں میں بھی ان کے اثرات پوری طرح ختم نہیں ہوئے مگر ان کا تسلط پہلے جتنا قائم نہیں رہا۔ اس کے بعد مستونگ کے علاقے گدرے بابا میں ایک بڑا مرکز موجود باقی رہ گیا جبکہ تربت، پنجگور، کوہلو، کاہان اور خضدار کے پہاڑوں میں دہشت گردوں کے ٹھکانے موجود ہیں، جن کے خلاف کارروائی کے لئے فورس کی ضرورت ہے لیکن حکومتی پالیسی کے مطابق کوئی آپریشن نہیں کیا جا سکتا۔ فوج اپنی بیرکس اور ترقیاتی کاموں تک محدود ہے جبکہ ایف سی پر بھی کسی بھی آپریشن میں حصہ لینے پر پابندی عائد کی جا چکی ہے۔

علیحدگی پسندوں سے لڑنا یا کوئی آپریشن کرنا ایف سی کا مینڈیٹ نہیں۔ ایف سی صرف صوبائی حکومت کی پابند ہے۔ وہ جو ڈیوٹی ایف سی کو سونپتی ہے، کرتی ہے۔ اس کے بعد ایف سی کو گشت کی ذمہ داری دی گئی ایف سی تمام بڑی شاہراہوں کوئٹہ کی سڑکوں اور تمام بڑے قومی پراجیکٹ کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

لانگو کی موت کے بعد کوئٹہ دہشت گردوں کے قبضے سے تو نکل آیا مگر علیحدگی پسندوں کے اثرات موجود رہے۔ سریاب روڈ پر بلوچ اکثریتی علاقے میں بھی اب گو کہ پاکستان کا پرچم لہرایا جاتا ہے مگر اس کے باوجود غروب آفتاب کے بعد کوئی بھی ان علاقوں میں جانے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح شہر کے اندر موجود کلی اسماعیل میں بھی بلوچ آبادی میں علیحدگی پسندوں کے اثرات باقی ہیں اور ان دونوں جگہوں پر مجموعی طور پر 300 سے 400 تک شرپسند عناصر فروری 2014ء تک موجود تھے مگر لیڈر شپ کے مارے جانے کے بعد وہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے قاصر تھے۔ اب تک کی ساری کارروائی قومی سلامتی کے ادارے اور محب وطن بلوچ قبائلیوں کے سبب کامیاب ہوئی ہے، اس کے پیچھے صوبائی یا وفاقی حکومت کی کوئی سپورٹ نہیں۔

## بلوچستان میں غیر ملکی مداخلت کی وجوہات

عالمی دفاعی ماہرین کے مطابق بلوچستان وہ علاقہ ہے جہاں سے امریکہ اپنی توسیع پسندی کے عزائم کی تکمیل کے ساتھ ساتھ افغانستان، ایران اور پاکستان کے مغربی حصوں کے گرد گھیرا ڈال سکتا ہے۔ یہ مشرق وسطی، وسطی اور جنوبی ایشیاء میں امریکی بالادستی قائم رکھنے کا

ایک اسٹراٹیجک مقام ہے۔ چین اس علاقے کو اپنی معاشی ترقی اور تجارتی سامان کی رسد کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ اس علاقے کو اپنے زیر استعمال رکھ کر چین سپر طاقت کو پاکستان سمیت کئی ممالک سے دور رکھ سکتا ہے۔ جو حالات اس صوبے میں پیدا ہو چکے ہیں اس سے لگتا ہے کہ رواں صدی میں بلوچستان جیو پولیٹیکل پاور کے لیے مرکزی کردار ادا کرے گا۔ ایشیاء میں امریکی پالیسی کی اہمیت کے حامل تینوں ممالک (ایران، افغانستان اور پاکستان) دراصل امریکی ملٹری طاقت میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ یاد رہے کہ انرجی ذرائع کی ترسیل، ایرانی سمندر تک رسائی، brick ممالک اور شنگھائی تعاون تنظیم کے ممالک کے لیے یہ ایک اہم مقام ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ خطہ تیل اور قدرتی گیس سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک اہم تجارتی گزرگاہ بھی ہے۔ یہ خطہ پاک ایران، ترکمانستان، افغانستان اور انڈیا گیس پائپ لائن کا بھی راستہ ہے۔ اس کے علاوہ نئی شاہراہ ریشم کا راستہ بھی اس سرزمین سے ہی ہو کر گزرے گا جس کے ذریعے تیل اور گیس کو ریل اور ٹرکوں کے ذریعے تھائی لینڈ تک لے جایا جا سکتا ہے تاکہ آبنائے ہرمز سے صرف نظر کیا جا سکے۔ لیکن یہ اس وقت ہی ممکن ہو گا جب بلوچستان میں امن اور استحکام قائم ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چین، روس، امریکہ اور ایران کے لیے ایک اہم جگہ ہے۔ آبنائے ہرمز کی یہ اہمیت ہے کہ تمام دنیا کی تجارت کا پانچواں حصہ اس راستے سے ہو کر گزرتا ہے۔ اسی لیے ایران نے امریکی حملے کے جواب میں اس آبنائے کو مائنز کے ذریعے بند کرنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ ایران کے پاس اس وقت 2000 مائنز ہیں اور اس کی آبدوزوں میں ان کو فوری لگانے کی صلاحیت بھی ہے۔ اگرچہ ایران اور امریکہ کی کشیدگی کسی حد تک ختم ہو چکی ہے لیکن پھر بھی اس کے جواب میں امریکہ نے آبنائے ہرمز پر روبٹس کی ایک آبدوز لگا دی رکھی ہے تاکہ ایران اسے بند نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ امریکہ نے یہاں seafox نامی ڈرون بھی تعینات کر رکھے ہیں جو خلیج فارس اور بحرہ عرب میں کھڑے adr چھٹے بحری بیڑے کا حصہ ہیں۔ سمندر میں رکھے ہوئے چار فٹ لمبے ڈرون کو کیمرے اور SONAR سے آراستہ کیا گیا ہے تاکہ صوتی لہروں کی باز گشت اور زیر آب اشیاء کی موجودگی کا پتہ لگایا جا سکے۔ امریکہ نے اس سمندری حدود میں آٹھ مائن سویپر جہاز بھی کھڑے کر رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ بحرین کی سمندری حدود میں جدید بحتے

ہوئے اڈے (floating base) بھی تعینات کر رکھے ہیں جہاں ایک بحری فلیٹ کھڑا ہے۔

گوادر پورٹ چونکہ چین نے بنائی ہے اس لیے مغرب پورے بلوچستان کو عدم استحکام، لڑائی اور خانہ جنگی کا محور بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی پالیسی میں پاکستان، ایران اور شام کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا بھی شامل ہے جس کے سبب اس صوبے میں جرائم، مار دھاڑ اور قتل در قتل کا ایک نہ ختم ہونے والہ سلسلہ جاری ہے۔ اسے پراکسی وار بھی کہا جا سکتا ہے۔ عالمی طاقتوں کے مفادات متصادم ہونے کی وجہ سے اغواء، ٹارگٹ کلنگ اور دہشت گردی کی فضا برقرار رکھی جا رہی ہے۔ مغرب، امریکہ، اسرائیل اور بھارت اسی لیے اس خطے کو عدم استحکام سے دوچار رکھنا چاہتے ہیں تا کہ پاکستان کو مزید تقسیم کیا جا سکے۔ ہماری خفیہ ایجنسیوں کے پاس اس بات کے ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں کہ بلوچستان میں حالات کی خرابی میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہیں۔

ایف سی کے انٹیلی جنس ذرائع کے مطابق 2013 سے پہلے بلوچستان میں 26 ممالک کی خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی تھیں۔ پاکستاں میں ان دنوں رحمان ملک جیسے وزیر داخلہ ان معاملات کی نگرانی کر رہے تھے جو روزانہ کی بنیاد پر میڈیا کو غیر ملکی ہاتھوں کے ملوث ہونے کی خبریں پہنچانے کو ہی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بلوچستان میں ایران اور پاکستان کے خلاف جنگ لڑی جا رہی ہے۔ لیکن اس وقت دونوں ممالک کے درمیان تعلقات مثالی نہیں رہے اس لیے اس جنگ پر قابو پانا دشوار ہے۔ بلوچستان میں غیر ملکی ایجنٹوں کی آمد کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ پرویز مشرف کے دور کا ایسا تحفہ ہے جو ملکی سلامتی کے لیے ایک سنگین خطرہ بن چکا ہے۔ ایک عرب ملک کے اخبار کا دعویٰ ہے کہ امریکی سی آئی اے بلوچستان میں اپنے ایجنٹ بھرتی کر رہی ہے۔ جند اللہ سے کام لینے میں موساد اور سی آئی اے میں مسابقت جاری ہے جو ایران کے خلاف سخت کارروائی کرانے کی سر توڑ کوشش میں ہیں۔ بلوچستان میں برطانیہ کی خفیہ ایجنسی Mi6 برہمداغ بگٹی اور ہر بیار مری کی مکمل سرپرستی کر رہی ہے۔ آج اس خطے میں علیحدگی پسندوں کی جتنی بھی فوج ہے اس کی تشکیل میں سی آئی اے، موساد، را اور دیگر اہم ممالک کی خفیہ ایجنسیاں ملوث ہیں۔ ان کی تفصیل آگے دی گئی ہے۔

بلوچستان میں امریکہ، یورپی ممالک، انڈیا اور اسرائیل کی طرف سے بد امنی

پھیلانے کے دو مقاصد ہیں۔ اول پاکستان کے اندر عدم استحکام پیدا کرنا اور دوم چین کو آگے بڑھنے سے روکنا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے امریکہ نے اپنا سب سے بڑا بحری بیڑا uss enterprise گوادر پورٹ کے قریب لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ پاکستان میں سیاسی مداخلت کے ساتھ ساتھ امریکہ فرقہ واریت کو ہوا دیکر عدم استحکام پیدا کر رہا ہے۔ جاسوسی کے ایک حیران کن حد تک مضبوط اور پیچیدہ نیٹ ورک کے ذریعے امریکیوں نے ہزارہ برادری کے قتل کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس کی نگرانی اعلیٰ امریکی حکام کر رہے ہیں۔ بلوچستان میں چین، روس اور ایران امریکہ مخالف دھڑے میں شامل ہیں جبکہ ترکی اور سعودی عرب بڑھ چڑھ کر اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یاد رہے کہ شام میں خانہ جنگی اور بلوچستان میں حالات خراب کرنے پر اٹھنے والے خراجات قطر برداشت کر رہا ہے۔ امریکہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر گامزن ہے جبکہ مسلم ممالک ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں۔

## بلوچستان میں غیر ملکی اسلحہ کی تقسیم

بلوچستان میں پاکستانی فورسز کے خلاف بلوچ مزاحمت کو حاصل غیر ملکی حمایت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ آج علیحدگی پسندوں کے حوصلے اسی بیرونی سپورٹ کی بدولت بلند ہیں اور ان کے پاس جدید ترین اسلحہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ صوبہ عالمی سازشوں کا شکار ہو چکا ہے۔ ایک طرف پاکستانی فورسز ہیں جو حالات پر قابو پانے کی کوشش میں ہیں جبکہ دوسری طرف اسلحے سے لیس مسلح گروہ ہیں جو بلوچستان کی نام نہاد آزادی کی تحریک کی آڑ میں لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا کیے ہوئے ہیں۔ امریکہ سے علیحدگی پسندوں کے رابطوں اور صوبائی حکومت کی ان کے سامنے بے بسی کا اندازہ ذیل میں دیے گئے ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اپریل 2012ء میں اکبر بگٹی کے پوتے شاہ زین بگٹی کی سپریم کورٹ سے ضمانت منسوخ ہوئی تو انتظامیہ اسے گرفتار کرنے میں ہچکچانے لگی کیونکہ شاہ زین بگٹی نے پولیس اور ایف سی کے اہلکاروں پر گرفتاری کے ردعمل میں فائرنگ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ پولیس اور ایف سی جو کوئٹہ میں بگٹی ہاؤس کا محاصرہ کیے ہوئے تھی اعلیٰ حکام کے حکم کی منتظر تھی۔ شہر کو خونریزی سے بچانے کے لئے بلوچستان کے وزیر داخلہ بگٹی ہاؤس پہنچے اور شاہ زین بگٹی کو صوبائی حکومت کی

طرف سے مکمل تعاون کا یقین دلا کر گرفتاری پر آمادہ کیا۔ صوبائی وزیر داخلہ نے مقدمہ میں خصوصی تعاون اور حراست کے دوران ''خیال'' رکھنے کی بھی یقین دہانی کرائی جس سے علیحدگی پسندوں کی طاقت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس پر بھی شاہ زین کو تحفظات تھے جن کو دور کیا گیا اور یقین دلایا گیا کہ صوبائی حکومت ان کا ساتھ دے گی۔ جس پر شاہ زین نے اپنے گھر سے باہر آ کر میڈیا سے گفتگو کی اور گرفتاری پیش کر دی۔ شاہ زین کو جس مقدمے میں گرفتار کیا گیا۔ وہ 22 دسمبر 2010ء کو بلیلی چیک پوسٹ پر ان سے اسلحہ برآمد ہونے پر قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت شاہ زین اپنے 17 گارڈز کے ہمراہ چمن سے کوئٹہ آ رہے تھے کہ ایف سی نے چیک پوسٹ پر انہیں روکا اور میڈیا کی موجودگی میں ان کی گاڑیوں سے اسلحہ برآمد کیا جس کی مالیت کروڑوں میں تھی۔ اس اسلحے میں 50 کلاشنکوفیں، 50 ایس ایم جی، 3 مشین گنز، راکٹ لانچرز، اینٹی ایئر کرافٹ گنز اور مارٹر شیلز بھی شامل تھے اور یہ اسلحہ وہ افغانستان سے لے کر آئے تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ انہوں نے گرفتاری کے فوراً بعد سب سے پہلے امریکی سفارت خانے کو فون کیا تھا۔

یاد رہے کہ شاہ زین امریکہ میں ایک فٹ بال کلب کے ممبر رہے ہیں اور پاکستان آمد کے وقت سے ہی وہ سی آئی اے کے ساتھ رابطے میں تھے۔ ان کا ماضی میں زیادہ تر رابطہ کراچی کے قونصل خانے سے رہا ہے۔ مگر اس کے بعد ایک دفعہ جب میڈیا نے انہیں میریٹ ہوٹل اسلام آباد میں امریکی سفیر سے ملاقات میں دیکھا تو شاہ زین نے میڈیا پر حملہ کر دیا۔ جس پر شاہ زین کے خلاف اسلام آباد میں پرچہ بھی درج ہے۔ امریکی براہمداغ کے ساتھ ساتھ شاہ زین کو بھی استعمال کر رہے ہیں اور شاہ زین کو وہ اسلحے کی ترسیل اور دیگر سپورٹنگ ایشوز کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایف سی اور کوئٹہ پولیس کے پاس شاہ زین بگٹی کی بلیلی چیک پوسٹ سے گرفتاری کے فوراً بعد کی ویڈیو موجود ہے۔ جس میں شاہ زین نے بغیر کسی سوال و جواب کے کہا تھا کہ وہ سب کچھ بتانے کو تیار ہیں اور پھر انہوں نے ایک ایک اسلحے اور ایمونیشن کے بارے میں بتایا کہ یہ کہاں سے دستیاب ہوا۔ البتہ انہوں نے تفتیشی ٹیم کو اور رہائی کے بعد میڈیا کو یہی بتایا کہ یہ اسلحہ وہ ڈیرہ بگٹی کی جانب لانگ مارچ کی حفاظت کے لئے لے کر آ رہے تھے۔ مگر سرکاری ذرائع نے اس بات کی تصدیق نہ کی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اسلحہ چمن سے کوئٹہ شہر پہنچا کر کسی دوسری پارٹی کے حوالے کرنا مقصود تھا جس تک امریکی یہ اسلحہ پہنچانا چاہتے تھے۔ مگر

گرفتاری اور رہائی کے بعد شاہ زین کو اسلحے کی ٹرانسپورٹیشن سے الگ کر کے یہ کام بعض صوبائی وزراء کے ذمہ لگا دیا گیا جو آج بھی امریکیوں کی یہ خدمت کر رہے ہیں۔ تاہم ویڈیو ثبوتوں اور گواہان کی طویل فہرست کی موجودگی میں شاہ زین اسلحہ کی کھیپ سے اپنے تعلق سے انکار نہیں کر سکتے۔ میڈیا کے سامنے یہ سردار زادہ پولیس اسٹیشن میں پولیس والوں کی جانب سے بار بار پرسکون رہنے کا کہنے کے باوجود بار بار ہاتھ جوڑ کر اور اپنے مخاطب کو سر سر کہہ کر اسلحے کی تفصیل بتا رہا تھا۔

اس دوران شاہ زین کے لئے اسلحے سے بھی زیادہ خطرناک کیس نجی جیل بنا کر لوگوں کو قید رکھنے کا تھا جو ایک شخص نور محمد بگٹی نے درج کرایا تھا۔ نور محمد بگٹی جو محکمہ تعلیم میں کلرک ہے، نے میڈیا میں اپنی کہانی سنائی جس پر چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ جسٹس فائز عیسیٰ نے سوموٹو نوٹس لیتے ہوئے نور محمد کو طلب کیا اور ہائی کورٹ کے حکم پر پولیس نے پرچہ درج کر لیا جس میں نور محمد نے الزام لگایا تھا کہ شاہ زین نے بگٹی ہاؤس بلوا کر مطالبہ کیا کہ سریاب روڈ والی اپنی رہائش گاہ اسے دیدے۔ انکار پر اسے کال کوٹھری میں بند کر دیا جسے شاہ زین نجی جیل کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لینے کے باوجود شاہ زین کی اس میں گرفتاری کی جرأت نہ کی۔ مزید یہ کہ سپریم کورٹ سے ضمانت منسوخ ہونے کے فوراً بعد بھی گرفتاری سے گریز کیا گیا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ گرفتاری کے بعد شاہ زین سے نور محمد بگٹی کے مقدمے کی بھی تفتیش ہونی چاہیے تھی۔

کوئٹہ میں تعینات ایک اعلیٰ ترین آفیسر جب یہ کہتے ہیں کہ بلوچستان عالمی طاقتوں کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، تو وہ غلط نہیں کہتے۔ اسلام آباد میں وزارت داخلہ، قومی سلامتی کے مختلف اداروں اور جی ایچ کیو کو مسلسل بھجوائے جانے والے ثبوت اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ بلوچستان میں آگ لگانے والے تین ملکی اتحاد کی قیادت امریکہ کر رہا ہے۔ جس میں امریکی سی آئی اے کے ساتھ بھارتی را اور اسرائیلی موساد بھی شامل ہے اور اس اتحاد کو افغانستان کی حکومت اور ایران میں بھارتی قونصل خانوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔ ایرانی حکومت اس پر خاموش کیوں ہے؟۔ حالانکہ یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ اگر اس آگ کو اسی جگہ نہ بجھایا گیا تو یہ ایران کا دامن بھی جلائے گی اور افغانستان کا بھی۔ دراصل اس کی وجہ ایرانی بلوچستان جسے

سیستان کہا جاتا ہے، وہاں یونائیٹڈ بلوچ فرنٹ کے نام سے ایک تنظیم عرصہ دراز سے اس ایجنڈے پر عمل پیرا ہے جس پر بی ایل اے، بی ایل ایف، لشکر بلوچستان اور بی آر اے چل رہے ہیں۔

ملک کے اعلیٰ ترین اداروں کے پاس صرف ڈاکٹر اللہ نذر کی ٹیلی فون پر بیرون ملک ہونے والی گفتگو کا اتنا ریکارڈ موجود ہے کہ اس کی موجودگی میں اس تحریک نما دہشت گردی کو حاصل حمایت کا انکار کسی صورت ممکن نہیں رہتا، جن میں قتل و غارت اور اسلحے کی ترسیل کے حوالے سے تفصیلی گفتگو شامل ہے بلکہ دلچسپ طور پر غیر ملکی ہینڈلران دہشت گردوں کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے اور لڑانے کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک فون کال میں جہاں اللہ نذر خود کو ''ڈاکٹر این'' کے کوڈ نیم سے متعارف کرواتا ہے، بھارتی ہینڈلر اس سے سخت باز پرس کرتا ہے کہ ''وہ نہیں اس کا نائب ملا تھا''۔ ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ہینڈلر سوال کرتا ہے کہ ''تم کے بی ایم سے رابطے میں رہو؟'' اس پر ڈاکٹر سمجھ نہیں پاتا، تو ہینڈلر غصے سے کہتا ہے، ''خدا بخش مری کی بات کر رہا ہوں'' اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ ''ہم نے بڑی مشکل سے تمہیں الگ سے سنبھال رکھا ہے''۔ یہ سردار لوگ نہیں چاہتے کہ ہم تمہیں براہ راست ڈیل کریں''۔ اسی طرح ایک اور کال میں اللہ نذر حالات کی تنگی کا گلہ کرتا ہے اور اسے اس کا بھارتی ہینڈلر تسلی دیتا ہے کہ پریشان نہیں ہونا، ہم تمہارے ساتھ ہیں اور برے دن تھوڑے ہیں، اچھے دن آنے والے ہیں۔ 10 منٹ سے زیادہ کی یہ گفتگو جس میں اللہ نذر کو ''ڈاکٹر نور'' کے کوڈ نام سے مخاطب کیا جاتا ہے، انگریزی میں ہے اور ہینڈلر ایک جملہ اردو میں کہتا ہے کہ ہم ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔ اندھیرے میں بھی اور اجالے میں بھی۔

اسی طرح میر شفیق مینگل کے گھر پر حملے کے بعد ان کے لڑکوں نے جب حیر بیار کے گھر پر کوئٹہ میں حملہ کیا تو وہاں سے بہت سی تصاویر اور دستاویزی ثبوت بھی دستیاب ہوئے جو بعد میں متعلقہ حکام کے حوالے کر دیئے گئے۔ ان میں امریکی اسلحے کی فراہمی کے ثبوت اور رپورٹس کی تفصیل بھی درج تھی۔ دستیاب تصاویر میں سی آئی اے کے ہینڈلرز کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ ان میں امریکی اور اسرائیلی ہینڈلرز جن میں خواتین بھی شامل ہیں، کے ہمراہ ایسی تصاویر بھی ہیں جنہیں کسی بھی صورت شائع نہیں کیا جا سکتا اور اخلاقیات کے تقاضے کے

تحت ان کی تفصیل بھی بیان نہیں کی جا سکتی۔

بلوچستان کے دہشت گردوں کو بھاری مقدار میں امریکی فوج کے زیر استعمال گن ایم 16 دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سوویت گن ڈریگانوف بھی وافر مقدار میں ان کے پاس موجود ہے جو انہیں بھارت کی جانب سے فراہم کی جاتی ہیں۔ عسکری ماہرین آگاہ ہیں کہ ایم 16 گن امریکہ کی ان بندوقوں میں سے ایک ہے جو خالصتاً امریکی افواج کے لئے مخصوص ہیں اور 90ء کی دہائی میں یہ گن امریکی فوج میں فرنٹ لائن کمبیٹ گن کی حیثیت رکھتی تھی جبکہ دہشت گردوں کے پاس اس کی بھاری مقدار میں موجودگی اور اس کے دستاویزی ریکارڈ کی موجودگی میں امریکہ کے کردار سے انکار ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح کراچی کا امریکی قونصلیٹ اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ بلوچستان میں مصروف بعض سول و عسکری اداروں نے اسلام آباد میں وزارت داخلہ کو یہ اطلاعات بھجوائی ہیں کہ امریکی قیادت میں نیٹو سپلائی بھی بلوچستان میں دہشت گردوں کو اسلحے کی فراہمی کا بڑا ذریعہ تھی۔ کراچی کا امریکی قونصل خانہ ایک طرف بلوچ دہشت گردوں کی بیرون ملک آمدورفت میں ان کی مدد کرتا ہے تو دوسری جانب نیٹو سپلائی کے ذریعے انہیں اسلحے کی سپلائی میں بھی تعاون فراہم کرتا رہا ہے۔ دہشت گردوں کی آمدورفت کے حوالے سے بی ایل اے کے دہشت گرد کیپٹن سکندر حیات بادینی کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا گولی لگنے پر کراچی کے ایک مشہور ہسپتال میں علاج کرایا گیا اور بعد میں اس کو دوبار دبئی اور مسقط جانے میں مدد بھی کی گئی۔

بعض گرفتار دہشت گردوں سے دستیاب اطلاعات اور مختلف چھاپوں کے دوران پکڑی گئی دستاویزات اور ٹیلی فون ریکارڈ سے بہت سی اہم تفصیلات حاصل ہوئیں اور یہی سبب ہے کہ ان راستوں کو بند کرنے سے دہشت گردی کی لہر دم توڑنے لگی ہے۔ سلامتی کے اداروں کے پاس اس امر کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ امریکی کنٹینرز کے سلسلے میں اس امر کے ثبوت ملے ہیں کہ بعض کنٹینرز پر مخصوص نشان اور نمبروں کے ذریعے متعلقہ لوگوں کو آگاہ کر دیا جاتا تھا اور بلوچستان کی حدود میں داخل ہوتے ہی ان مخصوص کنٹینرز کو قافلوں سے الگ کر کے خضدار کے قریب لے جا کر کھولا جاتا اور وہیں سے مختلف کیمپوں کو اسلحے کی سپلائی کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں دو وزراء کا نام بھی سامنے آیا۔ ایک وزیر کا عملہ کنٹینرز کھولنے میں مصروف ہوتا جبکہ

دوسرے وزیر موصوف کی سرکاری گاڑیاں اس اسلحے کی ترسیل کا کام سرانجام دیتی رہی ہیں۔ جب سے سپلائی بند ہوئی ہے دہشت گردوں کے نہ صرف مسائل میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اب افغانستان سے آنے والے اسلحے کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ افغانستان کے صوبہ ہلمند سے جنوب کی جانب چاغی کے نواحی سرحدی علاقے سے امریکی اسلحہ بلوچستان میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے اسے پنجگور اور خضدار لے جا کر تقسیم کیا جاتا ہے۔ کنٹینروں اور ہلمند سے آنے والے اسلحے سے ایک بڑی مقدار ہمیشہ کراچی منتقل کی جاتی رہی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ وہاں سے یہ اسلحہ علیحدگی پسندوں اور ایران میں تخریب کاری کے لئے مختلف گروپوں کو دیا جاتا ہے۔ باقی ماندہ اسلحہ بلوچستان کے ایک تیسرے وزیر محترم کراچی کے بلوچستان ہاؤس تک لے جانے کے ذمہ دار ہیں۔ کچھ عرصہ قبل بلوچستان ہاؤس میں قتل ہونے والے کیئر ٹیکر کا تعلق بھی اسی دھندے سے تھا جو حصہ دار بننے سے انکاری تھا۔

## بلوچستان میں بی ایل اے کے سرپرست اور کھیل کا آغاز

بلوچستان میں بی ایل اے کے قیام اور غیر ملکی ہاتھوں کے کھیل کی نشاندہی 7 جنوری 2005ء کی رات کو سوئی گیس کی تنصیبات پر ہوئے راکٹوں کے حملوں کے بعد ہوئی۔ جس کی وجہ سے پاکستان کے بیشتر حصہ کو ایک ہفتے تک اپنے کاروبار بند رکھنے پڑے۔ یا اس کہانی کا نقطہ آغاز 2 جنوری 2002ء کی رات کو ہوا جب ایک بدنصیب خاتون ڈاکٹر کی مبینہ طور پر اجتماعی آبروریزی کی گئی اور جسے بعد ازاں جبری ملک بدری کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم جنوری 2002ء کو اس کہانی کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر اس کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کون کون سے واقعات بلوچستان کے حالات خراب کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔

دراصل بلوچستان میں مداخلت کے لئے تیار عناصر پہلے سے ہی منتخب کر لئے گئے تھے لیکن اس کے منصوبہ ساز کسی مناسب مددگار کے منتظر تھے تاکہ "کام" شروع کیا جا سکے۔ 2 جنوری کو وقوع پذیر ہوا واقعہ جس کے اردگرد یہ ناقابل برداشت صورتحال تیار کی گئی۔ محض ایک اوچھل عناصر تھا جس کی منصوبہ سازوں کو شدید ضرورت تھی۔ اس رپورٹ میں تعاون کرنیوالے کے جی بی کے دو سابق افسروں نے وضاحت کی کہ تمام منظران ماہرین کے پیدا

کردہ حالات کی کارستانی سے مطابقت رکھتا ہے جس کا حوالہ اس رپورٹ میں جا بجا دیا گیا ہے۔

جب پاکستان اور بھارت نے سرحدوں پر باڑ لگانا، یا جب پاکستان، ایران اور بھارت نے مشترکہ طور پر گیس پائپ لائن بچھانے کی کوششوں کا آغاز کیا اور پاکستان افغانستان اور ترکمانستان نے جب مشترکہ طور پر انتہائی معاشی اہمیت کی گیس پائپ لائن بچھانے کی بات کی تو اس دوران امریکہ دنیا کو دہشت گردی کے خلاف پاکستان کے فرنٹ لائن اتحادی کے کردار کے متعلق بتارہا تھا۔ جب چین گوادر پورٹ اور ہائی ویز کی تعمیر میں معروف تھا، جب پاکستان بلوچستان کو قانون کے تحت لانے اور جب دہشت گردوں کے محفوظ ٹھکانے ختم کرنے اور منشیات فروش نوابوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب پورے خطے میں دہشت گردی کے خاتمے اور دور دراز علاقوں میں خوشحالی لانے کے لئے اقدامات کئے جا رہے تھے تو اس وقت بلوچستان کے بنجر اور جنگی اڈوں پر مشتمل پہاڑوں میں ایک مہلک کھیل جاری تھا۔ استحقاق کے دعویدار بیرونی میل ملاپ سے اپنے آپ کو آلودہ کر چکے تھے تو ایسے میں دشمنوں میں سے دوستوں کی تمیز کرنے کے لئے کوئی ٹھوس پیمانہ پاکستان کے پاس نہیں تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ بھارت، روس، افغانستان، امریکہ اور ایران یا اسرائیل اور چین کے کچھ "کھلاڑی" اپنی حکومتوں کی مرضی کے بغیر کسی دوسرے ملک یا تنظیم کے تنخواہ دار ملازم کا کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ ایسے افراد صرف پیسے کے لئے کام کرتے ہیں۔ ان میں بلوچستان، فاٹا اور خیبر پختونخوا کے ایسے ایجنٹوں نے اضافہ کر دیا ہے۔ ہم بیان کر رہے تھے کہ بلوچستان میں سب سے پہلے حالات کو پاکستان کے خلاف کرنے والے اور مداخلت کرنے والے کون تھے۔ جیسا کہ ہم نے ابتدا میں ذکر کیا کہ روس بھی غیر ملکی مداخلت کاروں میں شامل تھا۔ 1980 کے عشرے میں سوویت یونین اور افغانستان کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کے دوران روس پاکستان کے افغانستان میں ایک فوری اور موثر مزاحمت کی تشکیل پر اس کے ذرائع اور قابلیت پر حیران تھا۔ پاکستان کو اس کی سزا دینے اور اسی زبان میں جواب دینے کے لئے کریملن نے پاکستان میں کچھ تنظیموں کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ اس کے روس مخالف اقدامات کو روکا جا سکے۔ ان ہی

تنظیموں میں سے ایک بی ایل اے تھی جو کے جی بی کا فکری لے پالک بچہ بنی۔ اس کی تشکیل بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں سے کی گئی۔ بی ایس او طلبہ کا ایک ایسا گروپ تھا جس میں کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر شہروں سے تعلق رکھنے والے بائیں بازو کی سوچ کے حامل طلبہ شامل تھے۔ مشا اور ساشہ کو حقیقی بی ایل اے کے معمار تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تخلیق کردہ بی ایل اے روس افغان جنگ میں متحرک رہی اور جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی منظر سے غائب ہو گئی کیوں کہ اس کو فنڈز مہیا کرنے والا روس ہی مٹ چکا تھا۔

نائن الیون کے دوران جب امریکہ افغانستان میں داخل ہوا تو اسے معلومات اور آزاد خبروں کے ایک نیٹ ورک کے فوری قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا انحصار پاکستان پر نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس مقصد کے لئے امریکی صدر بش نے پیوٹن کے اندر جھانکا تو وہ اسے ایک اچھا بچہ محسوس ہوا۔ اسی طرح رمز فیلڈ نے بھی اپنی روسی ہم منصب کی روح تک جھانک کر اس کا جائزہ لیا تو اسے یہ بہت پسند آئی۔ روسی اہلکاروں سے ایک فیاضانہ مشاورت اور ایک وسیع نتیجہ اخذ کرنے کے لئے امریکہ نے کام شروع کر دیا کیونکہ روسی امریکہ کی نسبت افغانستان اور بلوچستان کے متعلق زیادہ بھرپور معلومات رکھتے تھے۔ چنانچہ کریملن اور پنٹاگون نے بی ایل اے کو دوبارہ متحرک کرنے کے لئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا لئے۔ دونوں نے باہمی مفادات پر زد پڑنے تک بلوچستان میں مل کر کام کرنے پر اتفاق کیا اور یوں پاکستان کے خلاف کل کے دشمن خفیہ دوست بن کر کام کرنے لگے۔ یہ کھیل جنوری 2002ء میں شروع ہوا کیونکہ اس کھیل کے حقیقی کردار بلوچستان میں موجود تھے۔ اگرچہ یہ کردار خوابیدہ تھے لیکن کھیل کے تمام مہروں کو وسائل استعمال کر کے متحرک کرنا کسی کے لئے بھی مشکل کام نہ تھا۔ لہٰذا جنوری 2002ء میں ''انسٹرکٹرز'' کا پہلا بیج افغان سرحد عبور کر کے بلوچستان پہنچا تاکہ ٹریننگ کیمپ قائم کر کے تربیت کا آغاز کیا جا سکے۔ یہی وہ بیج تھے جن میں بلوچستان میں مداخلت کی کونپلیں پھوٹیں۔ 17 جنوری 2002ء کو دو بھارتی، دو امریکی اور ان کا ایک افغان ڈرائیور گائیڈ ایک بھورے رنگ کی ڈبل کیبن ٹویوٹا ہائی لکس ایس یو وی میں سوار ہو کر افغانستان سے رشید قلعہ کے قریب سے سرحد عبور کر کے بلوچستان کے ضلع میں پاکستانی حدود میں داخل ہوئے۔ سفر کے اس حصے میں انہوں نے ایسے راستوں کا انتخاب کیا جو غیر معروف تھے۔ مسلم

باغ سے کوہلو تک انہوں نے ٹریفک کے لئے رواں دواں سڑکوں کا انتخاب کیا اور آہستہ آہستہ سفر کرتے رہے۔

## بھارت کے رابطہ کار بلوچستان میں

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس رپورٹ کی تیاری میں 5 کہنہ مشق صحافیوں نے مشترکہ طور پر کوشش کی۔ ان میں اٹک آباد کے طارق سعیدی، سرجی پنکو واماسکو کے، زاہدان کے علی نسیم زیدی، قندھار کے قاسم جان اور کوئٹہ کے ایس ایم کاسی شامل تھے۔ ان کے مطابق بی ایل اے کی کوہلو سے کارروائیوں شروع کرنے کے لئے بالاچ مری کے ساتھ رابطہ کیا گیا۔ کوہلو میں وہ کچھ دیگر نوجوانوں سے بھی ملے۔ ان میں سے ایک امریکی شہری وہاں ہی ٹھہر گیا جبکہ دو بھارتی اور ایک امریکی ڈیرہ بگٹی چلے گئے جہاں سے وہ چند دن قیام کرنے کے بعد واپس آ گئے۔ انہوں نے وہاں کئی بلوچ کارکنوں اور ان کے تجربہ کار ناصحین کے ساتھ ''خصوصی مشاورت'' کی اور کئی ہفتے قیام کیا۔ اس کے بعد ایک کیمپ قائم کرنے پر کام شروع کر دیا گیا۔ اس مشاورت کے دوران بالاچ مری سب سے پر اعتماد ثابت ہوا اور کوہلو سے کارروائیوں کا آغاز اسی کے توسط سے شروع ہوا۔ کوہلو میں غیر ملکی مداخلت کاروں کے لئے ایک بیس کیمپ کا قیام بھی بالاچ مری کا اپنے سرپرستوں کے لئے تحفہ تھا۔ بالاچ مری نواب خیر بخش مری کے بیٹے ہیں اور انہوں نے ماسکو سے الیکٹرانک انجینئر کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ماسکو میں جن دنوں بالاچ مری زیر تعلیم تھے۔ تو کے جی بی نے حسب رواج طلبہ کو لالچ دے کر ان کی برین واشنگ کرنے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ جن طلبہ نے کے جی بی کے دیئے ہوئے سبق کو ازبر یاد کیا بالاچ مری ان میں سے ایک تھے۔

بھارت اور روس کے ساتھ گہرے مراسم کی وجہ سے بالاچ مری کا تجدید شدہ بی ایل اے کے سربراہ کے طور پر منتخب ہونا حیرانی کی بات نہیں تھی۔ کوہلو اور کاہان کے درمیان پائے جانے والے پہاڑ مری قبیلے کی ملکیت ہیں۔

## بلوچ یوتھ کی ذہنی صفائی کا آغاز

مذکورہ بالا کیمپ کی پہلی تربیتی کلاس میں 30 بلوچ نوجوانوں نے داخلہ لیا جن کو ذہنی صفائی اور خود اعتمادی پر مبنی لیکچرز دیئے جانے لگے۔ ان لیکچرز کے اہم موضوعات درج ذیل تھے۔

1۔ بلوچوں کی آزادی کا حق
2۔ گریٹر بلوچستان کا تصوراتی خاکہ
3۔ سیاسی جدوجہد میں تخریب کاری بطور ہتھیار
4۔ پنجاب کا بلوچوں پر ظلم وستم اور استبدادی اقوام کی رحم دلی
5۔ وسیع پیمانے پر احتجاج کے لئے ذرائع ابلاغ سے دوستانہ تعلقات

''دستی ہینڈ آؤٹس، رہنمائی کے خطوط'' اور حتیٰ کہ لیکرز کے منصوبے کے جی بی کے آرکائیوز میں دستیاب ہیں۔ ساشہ کے بقول ''میڈیا کے ساتھ رابطہ کے سواوہ پرانے منصوبے ہی بروئے کار لاتے تھے۔'' جیسا کہ اس طرح کے نیٹ ورکس کی مرحلہ وار تشکیل میں عموماً ہوتا ہے۔ یہاں بھی منطقی طور پر اگلے مرحلے میں چھوٹے ہتھیار اور تخریبی سرگرمیوں کی تربیت نصاب کا حصہ بن گئے۔ ہتھیاروں اور اسلحہ کی کھیپ افغانستان سے وصول کی گئی لیکن جب کیمپس کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اسلحہ کی سپلائی کے نئے بھارتی راستے کھولے گئے۔ پنجاب اور صوبہ سندھ کے سنگم کے قریب بھارتی سرحد سے بمشکل 5 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بھارتی قصبہ کشن گڑھ ہے۔ کشن گڑھ میں اسلحے کا سپلائی ڈپو اور ٹریننگ سنٹر ہے جہاں بشمول بلوچستان کے پاکستانی ٹریننگ کیمپوں کے ساتھ روابط جاری ہیں۔ کشن گڑھ سے 90 کلومیٹر کے فاصلے پر شاہ گڑھ کا قصبہ ہے، جہاں بھارت کا لاجسٹک سپورٹ ڈپو بھی ہے جو بھارتی ماہرین اور سپلائی کا لانچنگ پیڈ بھی ہے۔ یہ پاکستان میں بھارتی دخل اندازوں کا مرکز بھی ہے۔ اگرچہ ماضی میں یہ مراکز غیر اہم تھے۔ لیکن جنوری 2002ء سے جب سے بلوچستان میں غیر ملکی سرگرمیاں شروع ہوئی ہیں، ان کی اہمیت میں اضافہ ہو چکا ہے۔

بھارت سے پاکستان میں ہتھیاروں اور ضرورت کی دیگر اشیاء کی منتقلی انتہائی سادہ

اور آسان طریقے سے کی جاتی ہے۔ اسلحہ اور آلات جیسا کہ کلاشنکوف، ہیوی مشین گن، اے اے چھوٹی گن، آر پی جیز، مارٹرز، زمینی سرنگیں، اسلحہ اور مواصلاتی آلات شاہ گڑھ اور کشن گڑھ سے اونٹوں پر لاد کر پاکستان منتقل کیئے جاتے ہیں۔ جہاں سے یہ کار گو ٹرکوں کے سامان میں ملا کر ٹرکوں پر ترپال ڈال دی جاتی ہے۔ یہ اسلحہ اور آلات CKD یا SKD کی شکل میں لائے جاتے ہیں۔

یہ ٹرک 140 یا 180 کلومیٹر کا سفر طے کر کے سوئی اور وہاں سے چند گھنٹوں میں کوہلو پہنچ جاتے ہیں۔ یہ راستہ سب سے آسان اور قریب ترین ہے۔ کیونکہ افغانستان سے ان علاقوں میں کسی چیز کی منتقلی کے لئے قوی ہیکل گاڑیاں درکار ہوتی ہیں جو اس طویل اور مشکل گزار رستوں کو عبور کر سکیں۔ چھوٹے ہتھیار اور آلات عموماً روسی ساخت کے ہوتے ہیں جو آسانی سے سستے داموں دستیاب ہیں اور ان کو آسانی سے چیک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ راستہ پاکستانی تنصیبات کو تخریب کاری سے اڑانے کے لئے بھی انتہائی موزوں ہے کیونکہ پاکستانی دونوں بڑی اور اہم گیس پائپ لائنز (سوئی کشمور، اچ، ملتان اور سوئی سکھر) کچھ ایسے مقامات سے گزرتی ہیں جو بھارتی سرحد سے 45 کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر واقع ہیں۔

## انڈین ایجنسی را کی مداخلت

اس بھارتی ایجنسی کے بلوچستان میں سینکڑوں علیحدگی پسندوں سے زمینی رابطے ہیں جن کا ذکر کتاب کے کسی دوسرے باب میں کیا جائیگا۔ ساشہ کا کہنا ہے کہ اگر کسی نے بلوچستان میں دکان بھی کھولنی ہو تو وہ را کی طرف دیکھتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں کیمپوں کی تعداد بڑھتی گئی اور آج صوبے میں 55 تربیتی مراکز موجود ہیں جہاں ہر ایک کیمپ میں 300 سے 550 عسکریت پسند پائے جاتے ہیں۔ ان کیمپوں میں کثیر مقدار میں دولت زیر گردش رہتی ہے۔ امریکی دفاعی کنٹریکٹرز، پنٹاگون کے اہلکار، سی آئی اے کے پیادہ سپاہی، دوہرے بھیس میں لوگوں کو اکسانے والے، دولت کے متلاشی، کرائے کے خادم سابق سپاہی اور فری لانسرز مبینہ طور پر افغانستان سے بھاری رقوم بلوچستان منتقل کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ امریکی اپنے افغانی گائیڈز اور رہبروں کے ساتھ بلوچستان میں گھوم رہے ہیں۔

اب تو علیحدگی پسند عسکریت پسندوں کی تنخواہیں بھی مقرر کر دی گئی ہیں۔ عام ریکروٹس اور تخریب کار کی تنخواہ 200 امریکی ڈالر ماہانہ ہے۔ یہ چھوٹی سی رقم ان عسکریت پسندوں کو جنہیں اپنے علاقے میں کوئی معقول سرکاری نوکری نہ ملنے کی امید ہوتی ہے دی جاتی ہے۔ جبکہ گروپ لیڈر کو 300 ڈالر ملتے ہیں۔ کوئی خاص ٹارگٹ اگر کامیابی سے حاصل کیا جائے تو اس کا بونس الگ ملتا ہے۔

خصوصی ٹارگٹ کے حصول کے لئے اگرچہ رقم کا تعین نہیں کیا جاتا لیکن ٹارگٹ پر روانہ ہونے والا اسے اپنے طور پر ایک بڑی اہم چیز تصور کر لیتا ہے۔ ایسے افراد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جس کا اندازہ بی ایل اے کے دالبندین، نوشکی، کوہلو، سبی، خضدار اور ڈیرہ بگٹی میں نئی تعمیرات سے لگایا جا سکتا ہے جہاں آئے دن نوجوان بلوچ کارکنوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے ''کارناموں'' کے قصے آئے دن پاکستانی عوام اور حکام کو حیرت زدہ کر رہے ہیں۔

کچھ بلوچ کارکنوں کے پاس آئی نئی دولت کو جانچنے کے غیر معمولی اشارے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً شادیوں کی تقریبات میں ناچنے والے ہیجڑوں کے طائفے اور نسوانی لباس پہنے ہوئے کم عمر مرد ڈانسر لڑکے بلوچوں کی خفیہ معاوضوں کی دولت کو جوانوں پر کرنسی نوٹوں کی شکل میں نچھاور کی جاتی ہے۔ بلوچستان میں غیر ملکی مداخلت سے پہلے ایسی تقریبات میں دولت کی اس قدر بھرمار کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ چرواہوں اور گلہ بانوں مزارعوں کے یہ لینڈ لارڈ مالکان اور ان کی اولادیں اپنے باپ دادا کی فیاضی، مہمان نوازی، پرہیزگاری اور روایت پسندی کی امین کہلاتی تھی۔ دولت کی چمک اور عیاش پرستی نے صحراؤں اور چٹیل میدانوں کے باسیوں کو قانون شکنی اور غداری پر آمادہ کر لیا تو یہ باغی اور علیحدگی پسند بن گئے۔

## بلوچستان عدم استحکام کی ایک مثلث

پہلے سہ فریقی اتحاد کی جگہ ایک دوسرا بڑا اتحاد قائم ہوا جس کی تشکیل نوشکی، وانا (جنوبی وزیرستان ایجنسی کا مرکزی مقام) اور کشمور میں ہوئی۔ دراصل بلوچستان کا علاقہ ایسی زمین کا حامل ہے جہاں غیر ملکی عناصر کے لئے ناقابل رسائی اور محفوظ پناہ گاہیں ہیں۔ مثلاً ساحلی پٹی سے شروع ہوتے ہوئے مکران ساحل کا سلسلہ، راس کوہ، سلطان کوہ اور چاغی ہلز ہیں

جو زمین کو مشرق و مغرب کی طرف کاٹتی ہیں۔ شمال مغرب کی طرف سلیمان، کیتھرا، پاما اور سینٹرل راوی کا سلسلہ گہرے اور نا قابل عبور چوٹیوں کی تکمیل کرتا ہے۔

ساحلی پٹی اور بالائی بلوچستان کے درمیان چند ایک راستے ایسے بھی ہیں جو ان کو براہ راست ملاتے ہیں۔ جبکہ باقی ماندہ پاکستان کے ساتھ بلوچستان کا صرف 2 سڑکوں سے رابطہ ممکن ہے۔ بلوچستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنے والی مذکورہ بالا مثلث کے علاوہ ایک ایسی قوس ہے جو وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جھکی ہوئی گزرگاہ بھی ہے۔ یہاں پر وسیع پیمانے پر ''سرگرمیاں'' انجام دی جاتی ہیں۔ البتہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس غلام گردش میں کون کیا کر رہا ہے؟

## دالبندین اور نوشکی میں غیر ملکی ایجنٹوں کی موجودگی

بلوچستان کے نقشے پر اس قوس نما غلام گردش کو پھیلائیں اور افغانستان کے قصبات شاہ اسماعیل اور زیارت سلطان اویس قرنی پر نشان لگائیں اور پھر ایران کے قصبات جلک اور کوہاک پر نشان لگائیں اور اب آہستہ آہستہ اس خمیدہ قوس سے شاہ اسماعیل کو کوہاک سے ملائیں اور دوسری قوس سے زیارت سلطان اویس قرنی کو جلک سے ملائیں۔ ان دو خمیدہ خطوط سے بننے والی گزرگاہ بے شمار متضاد سرگرمیوں کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ اور ہمیں اس کے متعلق زمینی رابطوں کا علم ہو جائے گا۔ دالبندین اور نوشکی جہاں غیر ملکی ایجنٹوں کی موجودگی معمول بن چکی ہے اس گزرگاہ کے اندر دیکھی جا سکتی ہے۔ مختلف گروپ اور طاقتیں اس گزرگاہ کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ مقامی مددگاروں کی سپورٹ کے علاوہ یہ گزرگاہ کئی قسم کی سرگرمیوں کی حامل ہے۔

ایران کے شہر زاہدان میں بھارتی قونصل خانے نے امین ہوٹل کے قریب خیابان دانش گاہ کے ساتھ ایک مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ یہ مکان افغانستان سے پاکستان اور پاکستان سے ایران کی سرحد عبور کرنے والوں کو ٹھہرانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سرحد عبور کرنے والے مذکورہ بالا گزرگاہ کے ذریعے ہی ایران جاتے ہیں۔ کون لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہیں اور کن کارروائیوں میں ایسے لوگ ملوث ہوتے ہیں اس کا بلوچستان میں جاری کھیل سے

اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایرانی پاسداران جو ایران کی قابل بھروسہ ترین فورس ہے اور ماضی میں خمینی کے براہ راست کنٹرول میں تھی زاہدان تفتان روڈ کی نگرانی پر مامور ہے لیکن پاسداران کی خاش اور جلک کے درمیان کوئی باقاعدہ چیک پوسٹ نہیں۔

جو سرحد کے دونوں طرف ہر قسم کے عناصر کی آمد ورفت کا ایک آسان علاقہ کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایران، افغان سرحد بھی پاسداران کے زیر کنٹرول ہے جو کسی بھی غیر قانونی حرکت پر سختی سے پیش آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا قوس نما گزرگاہ ہی پاکستان سے جانے والوں کا پسندیدہ راستہ ہے۔ اور امریکی دفاعی کنٹریکٹرز اپنے افغان، معاونین اور شراکت داروں کی رہنمائی میں یہی راستہ استعمال کرتے ہیں تاکہ ایرانی سرحد کے قریب پہنچا جا سکے۔

یہ بات بھی دلچسپی کی حامل ہے کہ ایرانی بھی جب پاکستان میں تفریح طبع کے لئے کچھ سرانجام دینا چاہیں تو یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔ ایرانی اپنی کاروباری ضروریات اور دستاویزات کے تبادلے کے لئے یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچستان میں عسکریت پسندوں سے دبئی اور عمان سے رابطہ کار ایک ساحلی راستے کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بلوچستان میں تین اہم مقاماتی راستے بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

1۔ گوادر کا مشرقی کنارہ جو ایرانی علاقے میں شامل ہے لیکن یہ بغیر حفاظت سرحدی ٹرک پاکستان سے سرحد عبور کرنے والوں کے سلئے ایک قدرے آسان راستہ ہے۔

2۔ خور کلمات اور بومرہ کے درمیان کھلی جگہ

3۔ مشرقی گوادر کا دور مشرقی حصہ

کچھ کاروباری اور کرائم مافیا کے ملے جلے بھارتی باشندے دبئی یا عمان سے ماہی گیر کشتیوں میں سوار ہو کر 7 جنوری 2013ء کو بھڑکنے والی آگ سے پہلے گوادر کے ایرانی علاقے میں اترے۔ گوادر سے انہوں نے خضدار کی طرف سفر کیا اور وہاں سے کوئٹہ پہنچے۔ کوئٹہ میں وہ کچھ بلوچ عسکریت پسندوں سے ملے۔ ان علاقوں میں ان دنوں یہ بھی افواہ بھی زیر گردش تھی کہ بھارتی کثیر رقوم بھی لے کر آئے تھے۔ یہ اطلاعات بھی منظر عام آئیں کہ ان بھارتیوں نے سروانی بلوچوں سے بھی ملاقات کی جن کے اپنے بحری جہاز اور کشتیاں ہیں۔ ایک دوسری

رپورٹ میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ امریکہ اور اسرائیل پاکستانی علاقوں سے ایران کے خلاف مشترکہ آپریشن کررہے تھے۔ اسے نیویارک اخبار نے بھی شائع کیا تھا۔ مذکورہ بالا قوس نما گزر گاہ کو اسرائیلی، امریکی استعمال کرتے آرہے ہیں۔ ان حالات و واقعات کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ بھارت بیک وقت پاکستان میں حکومتی سطح پر مذاکرات اور بلوچستان میں عسکریت پسندوں سے رابطوں میں مصروف ہے۔ اس سے بھارت کی دوغلی پالیسی اور پاکستان دشمنی عیاں ہوتی ہے۔ البتہ یہ بات حیران کن ہے کہ ایران بھی بلوچستان میں گڑبڑ کرنے میں ملوث ہے۔ حالانکہ وہ پاکستان کے ساتھ مل کر گیس پائپ لائن بچھانے میں بھی مصروف ہے۔

مشا اور ساشہ نے بلوچستان میں مداخلت کے حوالے سے ایک انٹرویو میں بتایا کہ ''ذہن نشین رہے کہ روس کو افغانستان سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کا ارادہ تھا کہ پہلے کابل پر گرفت مضبوط کی جائے اور پھر وہاں سے بحر ہند کے گرم پانیوں تک پہنچنے کے لئے مذکورہ بالا گزرگاہ کو استعمال کیا جائے۔ اس کے بعد پاکستان کو اس کے اپنے ملک میں مصروف رکھنے کے لئے پختونستان اور گریٹر بلوچستان کا مسئلہ کھڑا کیا جائے۔ روس کا یہ منصوبہ تھا (یاد رہے کہ یہ منصوبہ اکبر بگٹی کے ساتھ لندن میں بھی زیر بحث لایا گیا تھا) کہ بلوچستان کے کچھ حصوں کو پاکستان سے الگ کر کے افغانستان کا صوبہ بنایا جائے جسے ماسکو کے زیر کنٹرول رکھا جائے گا۔ کریملن نے جو نکات اٹھائے تھے ان کو اس طرح حل کر لیا جائے گا''۔ 1980ء میں بی ایل اے کے قیام کے مقاصد کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ بی ایل اے کو صرف پاکستان میں مسائل پیدا کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس طرح کی ایک تنظیم کو دوبارہ بحال کرنا ایک مشکل کام تھا جسے کئی ایک کھلاڑیوں کی مدد درکار تھی۔ پنٹاگون اور کریملن اس منصوبے کو پروان نہیں چڑھا سکتے تھے۔ اس کے لئے بھارتی ایجنسی را کا تعاون حاصل کیا گیا جس کے تمام بلوچستان میں سینکڑوں متحرک کارکنوں سے رابطے تھے۔ روس اس منصوبے میں بالاچ مری سے مذاکرات کے اس منصوبے کو شامل کرا سکتا تھا جو اس نے کر دیا۔ اس موقع پر بھارتی را کی شمولیت بھی ضروری خیال کی گئی جس کے قندھار، جلال آباد اور زاہدان کے سفارتخانوں کے صوابدیدی بجٹ میں 700 فیصد اضافہ کر دیا گیا تھا چونکہ ان صوابدیدی گرانٹس کا آڈٹ نہیں کیا جاتا۔ اس لئے اسٹیشن چیف اسے اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا ہے۔ جس طرح روسیوں نے بالاچ مری

کو تجدید شدہ بی ایل اے کا سربراہ بنایا اس طرح سردار عطاء اللہ مینگل کا معاملہ نہیں تھا۔ عطاء اللہ مینگل لندن سے خود ساختہ جلاوطنی سے پاکستان واپس آیا اور اس نے کوہلو میں اپنی سرگرمیوں کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔

کیا یہ محض اتفاق تھا کہ عین اسی وقت بالاچ مری اور عطاء اللہ مینگل دونوں پاکستان میں تھے جب غیر ملکی پاکستان میں تخریب کاری کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ لیکن عطاء اللہ تو امریکہ کے آدمی ہیں جن کو بالاچ مری کی نگرانی پر مامور کیا گیا۔ کیونکہ امریکی روسی ایجنٹوں کو قابل بھروسہ نہیں سمجھتے۔ (یاد رہے کہ سردار عطاء اللہ مینگل پاکستان آنے کے بعد فوری طور پر کراچی میں امریکی قونصلیٹ میں امریکی سفیر نینسی پاول کو ملے ایک خلیجی اخبار کے مطابق بلوچستان میں سکیورٹی وجوہات کی بنا پر امریکی قونصل خانہ بند کر دیا گیا تھا اور 2004ء میں کراچی میں امریکی قونصل خانے کو بھی اسی وجوہات کی بنا پر بند کرنا پڑا تو امریکہ کے لئے بلوچ عسکریت پسندوں سے رابطے میں مشکل پیش آنے لگی۔ اس نے کراچی کا قونصل خانہ غیر اعلانیہ طور پر 2004ء میں ہی کھول دیا تا کہ بلوچستان میں امریکی مفادات کی نگرانی کی جا سکے۔ کراچی کے قونصل جنرل کی رہائش پر ملاقات کے لئے دوبئی سے سیدھے کراچی آئے۔ اس کے فوری بعد نینسی پاول امریکہ چلی گئیں۔ ان دنوں بلوچ قوم پرست تحریک اور فوجی آپریشن دونوں بلوچستان میں جاری تھے) یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دہشت گردی کی جنگ میں فرنٹ لائن اتحادی ہونے کے باوجود امریکہ نے بلوچستان میں تخریب کاری کے لئے بی ایل اے کو دوبارہ متحرک کیا۔ اس سوال کا جواب کے جی بی ایک ایجنٹ نے یوں دیا کہ "بلوچستان کے علاوہ تمام پاکستان امریکہ کے لئے بیکار ہے۔ جہاں تک پاکستان کے اتحادی ہونے کا تعلق ہے تو یہ تو امریکہ پاکستان کو محض استعمال کر رہا ہے، جلد یا بدیر پاکستان کو علم ہو جائے گا کہ اس نے اتحادی بن کر کیا کھویا کیا پایا؟" علاوہ ازیں امریکہ کو اس قسم کے اتحادی کی ضرورت نہیں۔ امریکہ نے ایک واضح پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔ اگر کوئی اسے پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ اس کے مقاصد بڑے واضح ہیں۔ ایران کے ساتھ امریکی معاہدے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا خواہشمند اتحادی ایران ہے۔ امریکہ کے نزدیک تمام پاکستان سے ایرانی اور پاکستانی بلوچستان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

دراصل امریکہ بلوچستان کے متعلق زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا جس کی وجہ سے اسے کریملن کے ساتھ ہاتھ ملانا پڑا۔ بلوچستان میں اس کے مقاصد بڑے واضح ہیں۔ اول وہ یہاں سے سنٹرل ریاستوں کے تمام وسائل براعظم امریکہ لے جانا چاہتا ہے جس کے لئے اسے یہ راستہ سودمند دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا چین کو بلوچستان سے دور رکھنا بھی امریکی مقاصد کا حصہ ہے۔ بلوچستان ہی وہ واحد جگہ ہے جو بحر ہند اور وسطی ریاستوں کا قریبی مقام ہے اور خلیج سے باہر اسے سب سے کم فاصلے والا راستہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ امریکی وسطی ریاستوں کے وسائل گوادر اور پسنی تک لانے کے بعد ادھر سے امریکہ منتقل کرنے کی منصوبہ بندی کر چکے ہیں۔ بلوچستان میں تخریب کاری کا مقصد بھی یہی ہے کہ وسطی ایشیائی ریاستوں کے وسائل گیس، بجلی اور تیل جنوبی ایشیا نہ لے جائے جاسکیں۔ پائپ لائن منصوبے کو اسی لئے دباؤ ڈال کر بند کیا گیا تاکہ ایران، پاکستان کسی مشترکہ منصوبے کی بدولت ایک دوسرے کی قریب نہ پہنچ جائیں۔ امریکہ جنوبی ایشیائی معیشتوں کو مضبوط کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اسے صرف مضبوط امریکہ عزیز ہے وہ نہیں چاہتا کہ وسطی ایشیائی تیل اور گیس سستے داموں جنوبی ایشیا میں منتقل ہو۔ دوسری چیز جو امریکہ کو کھٹکتی ہے وہ ہے بلوچستان میں ترقیاتی منصوبوں میں چینی معاونت۔ چین جو اس وقت کاروباری وتجارتی رابطوں کے لئے بلوچستان میں سڑکوں اور بندرگاہوں کے منصوبوں کی تعمیر میں مصروف ہے کا مقصد بھی چین کا وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا سے سمندری اور زیرزمین رابطوں کو مکمل کرنا ہے جو امریکہ کو ہرگز پسند نہیں۔ لہٰذا جہاں امریکہ کا مفاد ہے وہاں چین کا نقصان اور جہاں چین کا مفاد ہے وہاں امریکہ کا نقصان تصور کیا جاتا ہے۔ اس بیرونی کھیل میں پاکستان مسلسل عدم استحکام کا شکار ہو رہا ہے۔

## بگٹی، غیرملکی رابطے اور پاکستان کیخلاف ہرزہ سرائی

اکبر بگٹی کی تاریخ پیدائش 10 جولائی 1927ء ہے۔ کوئٹہ، کراچی اور ایچی سن کالج میں تعلیم حاصل کی۔ 1943ء میں بقول ان کے'' کانگریس کی تحریک سے متاثر ہو کر ہیٹ اور ٹائیاں جلا دیں اور گاندھی ٹوپی پہن لی کیونکہ اس وقت پوری طرح سمجھ نہ سکتا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟۔ 1947ء میں سرحد میں ریفرنڈم ہوا اور پاکستان بن گیا۔ میں نے تحریک پاکستان میں

حصہ نہیں لیا۔ کیوں کہ میری عمر کم تھی اور سیاسی شعور پوری طرح نہ تھا۔ البتہ 1956ء میں ون یونٹ کا اعلان ہوا تو میں نے اس کے خلاف بھرپور تحریک چلائی''۔

اکبر بگٹی کا یہ انٹرویو 24 مارچ 1972ء کو ہفت روزہ ''کہانی'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اور اس بلوچ سیاستدان کی سوچ کو ظاہر کرتا ہے جو 1943ء میں کانگریس سے متاثر ہو کر گاندھی ٹوپی پہنتا ہے اور 1947ء میں تحریک پاکستان میں اس لئے حصہ نہیں لیتا کہ ''اس کی عمر کم ہے''۔ ون یونٹ کی مخالفت میں تحریک چلانے پر اکبر بگٹی کئی بار گرفتار ہوئے اور ایک بار تو ان پر قتل کا الزام بھی تھا۔ استغاثہ کے مطابق انہوں نے اپنے چچا ہیبت بگٹی کو قتل کرایا تھا۔ اس الزام میں انہیں فوجی عدالت نے سزائے موت دی۔ جسے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ بعد میں حکومت کی تبدیلی کے ساتھ وہ رہا ہو گئے۔ ری پبلکن پارٹی کے دور میں بگٹی دفاع کے وزیر مملکت بھی رہے۔

1970ء کے انتخابات میں اکبر بگٹی نے حصہ نہ لیا۔ البتہ 12 فروری 1971ء کے اخباروں میں جو خبر شائع ہوئی اس کے مطابق اکبر بگٹی شیخ مجیب الرحمٰن سے ملنے ڈھاکہ پہنچے اور دونوں ''لیڈروں'' نے آئین سازی کے اہم معاملات پر گفت و شنید کی جو ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ جب شیخ مجیب باہر آئے تو انہوں نے منتظر اخبار نویسوں کو بتایا کہ ''ہم آئین کے ڈھانچے کے بارے میں متفق ہو چکے ہیں اور چھ نکاتی پروگرام صرف بنگلہ دیش کے لئے نہیں بلکہ بلوچستان اور دیگر صوبوں کے لئے بھی ہے اور اکبر بگٹی نے سو فیصد مجھ سے اتفاق کیا ہے''۔ دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا اور مسٹر بھٹو نے مغربی پاکستان میں صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔

اس موقع پر مغربی پاکستان میں اصغر خان واحد سیاستدان تھے جنہوں نے فوراً بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اس طرح ہم روٹھے ہوئے بھائیوں کو منا سکتے ہیں۔ چنانچہ اکبر بگٹی اس موقع پر اچانک تحریک استقلال کے اسٹیج پر نظر آئے اور 16 جنوری 1972ء کو نشتر پارک کراچی میں لوگوں نے دیکھا کہ تحریک استقلال کے زیر اہتمام جلسہ عام ہوا جس کی صدارت اکبر بگٹی کر رہے تھے۔ اصغر خان اور شاہ احمد نورانی مقرر تھے۔ اس جلسے میں پیپلز پارٹی کی طرف سے مبینہ طور پر اسٹیج کی طرف پتھر پھینکے گئے تھے۔

اس جلسے کے بارے میں خود اکبر بگٹی نے ''کہانی'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔
''اصغر خان نے مجھ سے صدارت کے لئے کہا تھا اس لئے میں نے حامی بھر لی۔ لیکن مجھ پر پابندی تھی اس لئے کرسی صدارت پر خاموش بیٹھا رہا''۔ وقت گزرتا رہا اور اکبر بگٹی جو کسی جماعت میں شامل نہ ہوئے تھے، اپنے اصل ارادوں کی تکمیل کے لئے ادھر ادھر گھومتے رہے۔

15 مارچ 1972ء کو صدر بھٹو روس کے دورے پر روانہ ہوئے تو وہی اکبر بگٹی جو ایک ماہ پہلے تک مسٹر بھٹو کے شدید ترین مخالف اصغر خان کے جلسوں کی صدارت کر رہے تھے، بھٹو کے سرکاری وفد میں نظر آئے۔

17 مارچ کو پاک روس مشترکہ اعلامیہ سامنے آیا جس کی خبر پاکستانی اخبارات میں یوں شائع ہوئی کہ نوائے وقت نے بطور خاص لکھا کہ روس پاکستان کے بارے میں اپنا موقف بدلنے کو تیار نہیں اور دوبارہ جنگ ہوئی تو روس پھر بھارت کا ساتھ دے گا۔ اور یہ کہ برصغیر ہندوستان کے ممالک کو جنگ کی پالیسی ترک کر دینی چاہیئے۔ بنگلہ دیش کو معرض وجود میں آئے چند ماہ ہوئے تھے اور پاکستان میں جذبات بھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا صدر بھٹو نے واپس وطن آ کر 19 مارچ کو فورٹریس سٹیڈیم لاہور میں پانچ لاکھ کے ایک عظیم جلسہ سے خطاب کیا۔ سٹیڈیم کا نام قذافی سٹیڈیم رکھا اور اعلان کیا کہ بھارت کے ساتھ ذلت آمیز سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ کہ ہم دولت مشترکہ میں شامل نہیں ہوں گے۔ یہ جلسہ افتخار تاری کی پستول بازی کی وجہ سے بہت مشہور ہوا تھا۔

تالیوں، نعروں اور گولیوں کی گونج میں پاکستانی عوام نے اس چھوٹی سی خبر کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جو اخبارات میں چھپی ضرور تھی اور جس کے مطابق پاکستانی وفد کے ایک رکن اکبر بگٹی مسٹر بھٹو کے ساتھ واپس آنے کی بجائے روس میں ہی رہ گئے اور پھر وطن لوٹنے کی بجائے وہیں سے انگلستان چلے گئے۔

پاکستان میں مارچ اور اپریل 1972ء کے مہینے بھٹو اور ولی خان کے مابین کشمکش کے مہینے تھے، سہ جماعتی سمجھوتہ کے تحت 24 مارچ کو یہ فیصلہ ہوا کہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر بنائے جائیں گے اور 29 مارچ کو ولی خان نے یہ بیان دیا کہ پختونستان کے مسئلے سے نیپ کا کوئی تعلق نہیں اور ہم نے گزشتہ برس میں کبھی پختونستان کا لفظ اپنی زبان سے نہیں نکالا۔

ولی خان نے یہ بھی کہا کہ ہم پر پختونستان کا الزام لگانے والے جمہوریت کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔

اگلے روز یعنی 30 مارچ کو ولی خان بھٹو کے خلاف ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے کہا کہ "ہم نے مسٹر بھٹو سے کہا تھا کہ اگر آپ بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو صدر مملکت کا عہدہ خالی کر دیں اور مجیب کو صدر بنائیں۔ میں ابھی جا کر انہیں منا لیتا ہوں، مسٹر بھٹو نے اس بات پر خوفزدہ ہو کر فوراً ہی مجیب کو لندن کے راستے بنگلہ دیش بھجوا دیا"۔ یکم اپریل 1972ء کو ولی خان نے اعلان کیا کہ سہ فریقی معاہدہ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مارشل لاء کی حمایت کریں اور وہ حزب اختلاف کے بنچوں پر بیٹھنے کے لئے تیار ہیں۔ 5 اپریل کو پنجاب سے شائع ہونے والے تین اخبارات زندگی، اردو ڈائجسٹ اور پنجاب پنچ پر پابندی عائد کر دی گئی تو ولی خان نے انہیں یہ دعوت دی کہ وہ سرحد سے آ کر یہ اخبارات شائع کر سکتے ہیں۔

14 اپریل کو قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا جس میں عبوری آئین پیش کیا گیا۔ صدارتی وفاقی نظام پاکستان کا مقدر ٹھہرا اور مسٹر بھٹو کو بنیادی حقوق معطل کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ 21 اپریل کو مارشل لاء ختم ہو گیا اور صدر بھٹو نے عبوری آئین کے تحت حلف اٹھایا اور 23 اپریل کو صدر بھٹو نے ہنگامی حالات کے نفاذ کی بنیاد پر تمام بنیادی حقوق معطل کر دیئے۔ عبوری آئین کے تحت یہ پہلا صدارتی حکم تھا۔

ولی خان پختونستان کے مطالبے کی تردید، مارشل لاء کی مخالفت، آزادی صحافت کے مطالبے اور اس طرح کے جمہوری طریقوں سے پنجاب اور سندھ میں اپنے لئے جگہ بنا رہے تھے اور ایک ذہین اور شاطرانہ سیاست دان کی طرح اپنے گرد برس ہا برس کے بنے ہوئے جالے کاٹ رہے تھے۔ عین اسی وقت اکبر بگٹی نے لندن سے نوائے وقت کو خصوصی انٹرویو دیا۔

لندن میں قیام کے دوران اکبر بگٹی کی سیاسی مصروفیات کافی اہم تھیں، پاکستان کے دوسرے سیاسی رہنماؤں جناب محمود ہارون اور میر علی احمد تالپور سے ان کی اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ برطانیہ کے راہنماؤں اور بھارت اور بنگلہ دیش کی ممتاز شخصیات سے بھی ملے۔ وہ بنگلہ دیش تحریک کے بدنام اور پاکستان دشمن لیبر رکن پارلیمنٹ جان سٹون ہاؤس سے ان کی خواہش پر ملے۔ نوائے وقت کے ذرائع کے مطابق سٹون ہاؤس نے اکبر بگٹی کو

پاک بھارت کنفیڈریشن کے لئے عملی تعاون کا یقین دلاتے ہوئے ہر طرح کی مدد کی فراخدلانہ پیش کش بھی کی تھی۔ تاکہ بلوچستان اور سندھ میں نئی تحریک چلا کر پاکستان کے وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

لندن میں روزنامہ نوائے وقت کو 30 اپریل 1972ء کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اکبر بگٹی نے اس ملاقات کے حوالے سے بتایا کہ ''سٹون ہاؤس نے بنگلہ دیش کے قیام کے لئے بہت کام کیا، خود میں بھی بنگلہ دیش کے قیام کا حامی تھا اس لئے وہ مجھ سے ملے، ملاقات کے دوران، ہم دونوں اس پر متفق تھے کہ پاکستان کا خاتمہ، نعوذ باللہ، جلد ہونیوالا ہے اور یہ ایک ایسی کڑوی حقیقت ہے جسے اہل پنجاب کو نگلنا پڑے گا''۔ سٹون ہاؤس اور اکبر بگٹی ملاقات ایک مشترکہ دوست کے ذریعے ہوئی جس کے بارے میں انہوں نے کچھ بھی بتانے سے معذوری ظاہر کی۔

اکبر بگٹی کے مطابق جس طرح بنگلہ دیش ایکشن کمیٹی نے بنگلہ دیش کے قیام کے لئے تحریک چلائی تھی اور ابو سعید چوہدری کو لندن میں اس کا سربراہ بنایا تھا، اسی طرح اس کمیٹی نے پاک بھارت کنفیڈریشن کے لئے اکبر بگٹی کو مالی کے علاوہ اشتہار بازی کے لئے پوری پوری مدد مہیا کی۔ بلوچستان میں علیحدگی پسند تحریک کے خلاف پاکستان کی کارروائی کی صورت میں بنگلہ دیش کی طرز پر برطانوی اور مغربی میڈیا میں شور مچایا جاتا۔ پاک بھارت کنفیڈریشن کے لئے بھارتی کمیشن اور اس کے ہمنوا پہلے ہی بہت تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ان دنوں اندرونی و بیرونی قوتیں جیٹ طیارے کی رفتار سے پاکستان کو ختم کرنے کے لئے کوشاں تھیں۔ اور اکبر بگٹی کے مطابق اگر پاکستان کو بچانا ہے تو بھارت سے کنفیڈریشن بنائی جائے ورنہ بقیہ پاکستان مٹ جائے گا۔ ان کے مطابق پاکستان کے پاس دو ہی راستے تھے، پاک بھارت کنفیڈریشن یا بھارت پنجاب اور سندھ کو فتح کر کے بھارت مملکت کا حصہ بنا لیتا۔ کنفیڈریشن کی صورت میں دفاع اور خارجی معاملات بھارت کے سپرد باقی معاملات مغربی پاکستان کے چاروں صوبے اپنی مرضی سے چلاتے۔ دوسری صورت میں بھارت پنجاب اور سندھ کو طاقت کی بنا پر اپنا حصہ بنا لے گا اور سرحد اور بلوچستان علیحدہ مملکت بن جائینگے۔

اکبر بگٹی کے مطابق دریائے سندھ روس اور بھارت کے درمیان نئی سرحد تھی۔

انہوں نے 25 مارچ کو یہ پیشنگوئی کردی تھی کہ بنگلہ دیش دو سال میں بن کر رہے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ اب پاکستان کا بقیہ وجود ختم ہونے جا رہا تھا اور پختونستان کے قیام کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ ولی خان سیاسی زبان استعمال کرتے رہے ہیں، پختونستان قومیت کے نعرے کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ صوبائی خودمختاری سے پاکستان کی شکل تبدیل ہونے میں تاخیر ہو سکتی تھی لیکن انجام کار پختونستان بن کر رہے گا۔ کنفیڈریشن کے علاوہ پاکستان کا کوئی مستقبل نہیں، طاقتور ہمیشہ اپنی مرضی کرتا ہے۔

''47ء میں جو پاکستان بنا تھا وہ پانچ مختلف قوموں پر مشتمل تھا جن میں اکثریتی قوم علیحدہ ہو چکی اور مغربی پاکستان میں جو چار قومیں آباد ہیں ان کا ایک دوسرے سے کوئی تہذیبی اور ثقافتی تعلق نہیں، پٹھان، سندھی پنجابی اور بلوچی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور مذہب کی بنیاد پر ان میں باہمی رشتہ نہیں بن سکتا۔ بنگال سے یہ ثابت ہو چکا کہ ہماری بھارت یا اندرا گاندھی سے کوئی دشمنی نہیں اس نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔ اندرا گاندھی نے بنگلہ دیش میں کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ اس نے مشرقی پاکستان کے ایک کروڑ مہاجروں کو پناہ دی اور وہاں کے عوام کو پاکستانی افواج کے مظالم سے نجات دلوائی۔ اس لئے بھارت یا اندرا گاندھی حملہ آور نہیں بلکہ آزادی کی علامت ہیں، بھارتی جارحیت کا مفہوم صرف پنجاب والوں کی اختراع ہے''۔

بگٹی کے مطابق ''سندھ اور بلوچستان کے منتخب نمائندوں نے یہاں تک کہا کہ اگر بھارتی افواج اپنی پیش قدمی جاری رکھتیں تو ہم بھی آزاد ہو جاتے''۔ بلکہ کوئٹہ میں لوگوں نے پاکستان مردہ باد اور جگ جیون رام اور مسز اندرا گاندھی کی جے کے نعرے لگائے اور جب اس مسئلہ پر بات چیت کے لئے وزیر اطلاعات حفیظ پیرزادہ کوئٹہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے یہی کہا تھا کہ ''لوگوں نے ایک حقیقت بیان کی ہے اور پاکستان مر چکا ہے، ہم پنجاب سے آزادی چاہتے ہیں جس نے دوسرے صوبوں کا استحصال کیا ہے''۔ ''مشرقی پاکستان میں ظلم کرنے والی فوج اور ہونیوالے جنگی قیدی سب پنجابی ہیں، بھارت سے جنگ پنجاب نے لڑی اور شکست کھائی، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بھارت کی غلامی پنجاب کا مقدر ہم کسی کے غلام نہیں نہ ہی ہماری بھارت سے دشمنی ہے۔ جہاں ملک میں لہلاتے باغوں کا چند لوگوں کو فائدہ ہو تو ایسے ملک کو آگ لگا دینی چاہئے۔ ایوب خان اور یحییٰ خان سب پنجاب کے ایجنٹ اور پاکستان کی

فوج پنجاب کی ہے جسے دوسرے صوبوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔"

بھارت جلد سپر پاور کا درجہ حاصل کرے گا اور دریائے سندھ کے ایک طرف بھارت اور دوسری طرف روس کے زیر اثر علاقے ہوں گے۔ ایران بھی بلوچستان سے منسلکہ علاقوں میں اپنا اثر بڑھانا شروع کر چکا ہے تاکہ اس بندر بانٹ میں وہ اپنا حصہ وصول کر سکے لیکن روس اس کی اجازت نہیں دے گا۔ کیونکہ روس خود بلوچستان کے راستے گرم پانیوں تک رسائی چاہتا تھا۔ چین کوئی بڑی طاقت نہیں اور پاکستان کو بچانے میں کوئی کردار ادا نہ کر سکے گا۔ صرف بھارت اور روس ہی ایسی دو طاقتیں ہیں جو برصغیر میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہیں اور دونوں کے مفادات مشترکہ ہیں۔ صدر بھٹو کا جو وفد روس گیا تھا وہاں ان سے اعلیٰ حکام نے صاف کہہ دیا تھا کہ بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کا ساتھ دینا روس کی پالیسی کا حصہ تھا اور روس آئندہ بھی عوام کی آزادی کی تحریکوں کا ساتھ دے گا۔ یورپ میں مغربی پاکستان کے عوام کے بارے میں شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ پنجابیوں کو لوگ یہاں سفاک اور ظالم سمجھتے ہیں کیونکہ مغربی پاکستان یعنی پنجاب کی فوج نے دو لاکھ عورتوں کی عصمت دری کی اور تیس لاکھ بنگالیوں کو ہلاک کیا۔ اور یہ تعداد شیخ مجیب کے مطابق ہے اس لئے اس پر یقین کیا جانا چاہیے۔ مسز اندرا گاندھی نے بنگالیوں کی دعوت پر انہیں آزاد کرایا، بنگالی انتہائی بے غیرت ہوں گے اگر وہ مغربی پاکستان سے کوئی مفاہمت کریں۔

اکبر بگٹی کے اس انٹرویو نے نیپ کے لئے مسئلہ کھڑا کر دیا۔ یہاں تک کہ پانچ مئی 1972ء کو ولی خان نے پشاور میں یہ اعلان کیا کہ نیپ پر یہ الزام سراسر غلط ہے اور ہم تو صوبہ کا نام بھی بدلنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ 3 مئی کو نیپ اور جمعیت نے پیپلز پارٹی سے مذاکرات کے بعد اعلان کیا کہ آزاد پختونستان اور آزاد بلوچستان کے لئے کوئی تحریک چلائی گئی تو وہ اسے سختی سے کچل دیں گے۔

بہرحال اکبر بگٹی لندن میں بیٹھ کر پاکستان توڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے اور نہ صرف ولی خان کے لئے مسائل پیدا کرتے رہے بلکہ مسٹر بھٹو کو سرحد میں نیپ اور بلوچستان میں جمعیت کی اکثریت سے چھٹکارا پانے کا جواز فراہم کرتے رہے۔ ان کا یہ کردار دو دھاری خنجر کے مترادف تھا۔ نیپ اور پیپلز پارٹی میں ہونے والی مفاہمت سے پاکستان اپنے پیروں پر

کھڑا ہو سکتا تھا جو اکبر بگٹی کو گوارا نہ تھا وہ تو پاکستان ٹوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر بھٹو بگٹی کے نیپ مخالف بیانات کی بنیاد پر نیپ کو کچلنا چاہتے تھے اور یہی وجہ بنی کہ جب پاکستان کی مخالفت کرنے والا یہ سیاستدان پاکستان لوٹا تو بھٹو حکومت نے اس کی پاکستان دشمنی کا نوٹس لینے کی بجائے نیپ کے خلاف استعمال کرتے ہوئے اسے بلوچستان کا گورنر بنا دیا۔

لندن میں ہی 19 اگست 1972ء کو ایک بار پھر لندن میں مقیم معروف تاجر محمد اقبال سے ایک ملاقات میں اکبر بگٹی نے پاکستان کے خاتمے کی پیشگوئی دہرائی اور سندھ میں ہونے والے فسادات کو اسی طوفان کا پیش خیمہ قرار دیا جو پورے پاکستان میں رونما ہونے والا تھا۔ اکبر بگٹی جو امریکہ کا دورہ منسوخ کر کے لندن پہنچے تھے انہوں نے کہا کہ شیخ مجیب الرحمان لندن پہنچنے والے ہیں اور میں ان سے ملاقات کے لئے واپس آیا ہوں۔ تحریک استقلال کے جنرل سیکرٹری ملک غلام جیلانی نے بھی اکبر بگٹی سے طویل ملاقاتیں کیں۔ اکبر بگٹی نے کہا کہ بھٹو حکومت کا خاتمہ قریب ہے فوج اقتدار سنبھالے گی، بلوچستان کے عوام اپنی قسمت کے آپ مالک بننا چاہتے ہیں۔ اس لئے فوج نے طاقت سے انہیں دبانے کی کوشش کی تو طاقت کا جواب طاقت سے دیا جائے گا۔ کیونکہ بلوچی بنگالی نہیں کہ فوج من مانی کر سکے، فوج کو بلوچوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ وہ اسلحہ کا استعمال جانتے ہیں اور ان کے پاس اس کی کوئی کمی بھی نہیں۔ بھٹو کے بعد فوج کا اقتدار سنبھالنا اور طاقت کا استعمال پاکستان کو ختم کرنے کا موجب بنے گا۔ ان دنوں صرف نواب اکبر بگٹی ہی پاکستان مخالف کردار ادا نہیں کر رہے تھے بلکہ تحریک استقلال کے متعدد دیگر رہنماؤں میں بھی ان کا ساتھ دیا جن میں نوجوان لیڈر ممتاز احمد تارڑ بھی شامل ہیں جنہوں نے نوائے وقت کے لئے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''پنجاب پاکستان کا چوہدری''۔

اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان کو جتنا نقصان پنجابی ذہن نے پہنچایا ہے اتنا کسی دوسرے صوبے نے نہیں پہنچایا۔ مضمون نگار کے مطابق ''مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سبب بھی یہی پنجابی ذہنیت تھی کیونکہ پنجابی کردار دیہات کے روایتی چوہدری کا کردار ہے جو اپنے مزارعوں کو اور گھریلو ملازموں کو کھانے پینے اور رہائش وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے مگر انہیں ہر صورت اپنے حکم کے تابع رکھتا ہے یہی سلوک پنجاب کا دوسرے صوبوں کے ساتھ رہا

اور بلاشبہ پنجاب دوسرے صوبوں کے لئے قربانی دیتا رہا لیکن ان پر اپنی مرضی اور پسند ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہا۔“

15 جنوری 1973 کو مرکز میں بھٹو عبوری آئین کے تحت صدر، سرحد میں نیپ کے ارباب سکندر گورنر اور جمعیت اور نیپ کے مشترکہ امیدوار مفتی محمود وزیر اعلیٰ تھے۔ ولی خان 14 جنوری 1973 کو کہتے ہیں کہ دو صوبوں پر ہماری حکومت ہے اس لئے پیپلز پارٹی کی طرف سے یک جماعتی اقتدار یا آئین برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ادھر 15 فروری کو اکبر بگٹی پریس کانفرنس کرتے ہیں کہ مینگل اور ان کے ساتھی غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اور ایک وطن پرست کی حیثیت سے ان کا پردہ فاش کر رہا ہوں۔ اسی روز بلوچستان کے گورنر بزنجو کا بیان اخبارات کی زینت بنتا ہے کہ جو عناصر پیپلز پارٹی اور نیپ میں تصادم کرانا چاہتے ہیں وہ ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں، بزنجو یہ بھی کہتے ہیں کہ ”پیپلز پارٹی کے غوث بخش رئیسانی نے کچھ زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا، ہم نے ان کے آدمی گرفتار کئے تو جام غلام قادر آف لسبیلہ کی قیادت میں جیل پر حملہ کر دیا گیا۔ ملزموں کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے تھے تاہم وہ کراچی فرار ہو گئے۔ کراچی پاکستان کا حصہ ہے اور وہ پکڑ لئے جائیں گے“۔

ان ملزموں میں جام غلام قادر وہ ہیں جنہیں بعد میں بھٹو نے بلوچستان کا وزیر اعلیٰ بنا دیا تھا۔ 18 جنوری کو شیر پاؤ کا بیان آیا کہ نیپ تین سیٹیں لے کر دو صوبوں پر حکومت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ 21 جنوری کو وزیر اعلیٰ بلوچستان عطاء اللہ مینگل نے پیپلز پارٹی کے حلیف قیوم لیگ کے سربراہ اور وزیر داخلہ خان قیوم پر الزام لگایا کہ وہ بلوچستان میں غیر ملکی اسلحے کی آمد کی باتیں کر کے خود اپنی نااہلی ثابت کر رہے ہیں اور وفاقی حکومت کی طرف سے ہماری صوبائی حکومتوں پر بلاوجہ دشنام طرازی ہے۔ پیپلز پارٹی اور نیپ میں کشمکش بارے 21 جنوری کو نوائے وقت میں شورش کاشمیری مرحوم کا مضمون ”ولی خان کو مجیب نہ بنایئے“ شائع ہوا۔ مرحوم اس بات پر زور دیتے رہے کہ سرحد اور بلوچستان کی اکثریتی جماعتوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی بجائے پیپلز پارٹی افہام و تفہیم سے کام لے۔

23 جنوری کو اکبر بگٹی پھر کہتے ہیں کہ سرحد اور بلوچستان میں اسلحہ سمگل ہو رہا ہے اور نیپ کے لیڈروں نے مغربی پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی خواہش مکمل کر لی ہے،،۔

29 جنوری کو اکبر بگٹی کوئٹہ پہنچتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ مرکزی حکومت مداخلت کرے اور لسبیلہ میں فوراً فوج بھیجے۔ (انٹرویو میں فوج کی طرف سے اقلیتی صوبوں کو کچلنے اور نتیجتاً ان کے الگ ہونے کے تناظر میں اس بیان کو دیکھا جائے تو ان کی ذہنیت صاف نظر آئے گی)۔ 30 جنوری کو گورنر بزنجو کہتے ہیں کہ لسبیلہ میں حالات پر قابو پالیا گیا ہے اور شر پسندوں کا صفایا ہو چکا ہے۔ یہ صوبائی حکومت کے خلاف ایک سازش تھی۔ 31 جنوری کو خبر آتی ہے کہ وفاقی حکومت نے بلوچستان میں فوج بھیج دی ہے۔ اسی روز بزنجو کہتے ہیں کہ آئینی بحران دور کرنے کی کوشش کی جائے اور بھٹو بلوچستان میں صدر راج نافذ کرنے کی غلطی نہ کرے۔

یکم فروری کو اکبر بگٹی لاہور پہنچے۔ پریس کانفرنس کی اور اس ''عظیم محب وطن'' نے خبردار کیا کہ بلوچستان میں نیپ حکومت کے خلاف کارروائی میں تاخیر ہوئی تو علیحدگی کی تحریک زور پکڑ لے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مشرقی پاکستان میں بھارتی حملے کے وقت بھی بلوچستان کو الگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور یہ کہ بلوچستان لیوی کی تنظیم ایسٹ بنگال رائفل کی طرز پر ہے اور نیپ بلوچستان کو الگ کرنے والی ہے۔ اسی روز گورنر بزنجو اعلان کرتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں مداخلت کی گئی تو ہم مزاحمت کریں گے۔ بلوچستان میں فوج بھیجنے کی درخواست نہیں کی گئی۔ جام غلام قادر کا الزام غلط ہے اور لسبیلہ کے ہنگاموں میں 400 نہیں صرف 4 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اسی روز مفتی محمود وزیر اعلیٰ سرحد کا طیارہ جو انہیں لے کر جھنگ آیا تھا، اچانک آگ پکڑ لیتا ہے اور مفتی محمود بمشکل طیارے سے اترنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اچانک آگ پکڑنے کی وجہ معلوم نہیں ہو پاتی اور تحقیقات کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

3 فروری کو مستقل آئین کا بل پیش کر دیا جاتا ہے۔ 5 فروری کو ولی خان اور بزنجو لاہور میں جلسہ عام میں تقریر کرتے ہیں۔ ولی خان کہتے ہیں یحییٰ خاں پر مقدمہ چلایا جائے اور پاکستان کی سلامتی کی طرف بڑھنے والا ہاتھ توڑ دیا جائے۔ اسی روز کوئٹہ میں عطاء اللہ مینگل کہتے ہیں کہ ہماری سول فوج نے بغاوت ختم کر دی ہے۔ صوبے میں امن و امان ہے اور پاکستان کی دفاعی فوج صوبے میں موجود ہے مگر اس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ 3 فروری کو قیوم خان کہتے ہیں کہ فوج نے بلوچستان میں امن و امان بحال کر دیا ہے۔ اسی روز اکبر بگٹی بلوچستان کی رابطہ مہم پر نکلتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ صوبوں میں غیر جانبدار گورنر مقرر کئے جائیں اور

بزنجو کے اس الزام کی تردید کرتے ہیں کہ وہ شیخ مجیب سے ملے تھے۔ 8 فروری کو اکبر بگٹی کہتے ہیں بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کی تنظیم 1963ء سے کام کر رہی ہے۔ لندن پلان حقیقت ہے۔ ولی خاں اور مینگل کے ساتھ ایک غیر ملکی طاقت کے تین نمائندوں کی ملاقات ہوئی تھی مجھے جب علم ہوا تو میں ان سے الگ ہو گیا نیز یہ کہ نیپ اس تنظیم کی آرگن ہے۔ 10 فروری کو بلوچستان کے وزیر اعلیٰ مینگل یہ کہتے ہیں کہ فوج نے لسبیلہ کا کنٹرول سنبھال لیا ہے۔ یہ وفاقی حکومت کی جانب سے صوبائی معاملات میں مداخلت ہے۔ مرکز بلوچستان اور سرحد کی صوبائی حکومتوں کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ مینگل یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ لسبیلہ فسادات پیپلز پارٹی کے ایماء پر کروائے گئے۔ اور کراچی سے اسلحے کے دو ٹرک وہاں بھیجے گئے۔ یہ پریس کانفرنس انہوں نے ہسپتال سے کی۔ جہاں وہ دل کے دورے کے بعد زیر علاج تھے۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ پیپلز پارٹی کے جنرل اکبر خاں نے نبی بخش زہری، اکبر بگٹی اور جام غلام قادر لسبیلہ سے مل کر فساد کا منصوبہ بنایا تھا۔

اس روز ولی خاں اور مفتی محمود نے مطالبہ کیا کہ لسبیلہ میں فوجی کارروائی مرکز کی طرف سے کھلی مداخلت ہے اور صوبائی حکومت حالات پر قابو پا چکی ہے۔ مگر ملزموں کو مرکزی حکومت نے پناہ دی۔ ادھر وفاقی وزیر داخلہ قیوم خاں نے کہا کہ بلوچستان میں صوبائی حکومت نے اپنے مخالفوں کا راشن بند کر دیا تھا اور راشن کی سپلائی بحال کرنے کے لئے صدر بھٹو نے فوج کو وہاں بھیجا۔ اسی روز لاہور کے اخبارات میں انجمن اتحاد پاکستان کے فرضی نام سے ایک اشتہار چھپا جس کے مطابق سردار دودا خاں، میر نبی بخش زہری اور جام غلام قادر لسبیلہ کے ساتھ ساتھ اکبر بگٹی بھی ایک جلسہ عام سے خطاب کریں گے۔ اس جلسے کے لئے فنڈ پیپلز پارٹی کی حکومت نے مہیا کئے۔ ادھر 11 فروری کو عراقی سفارتخانے سے روسی اسلحے کا ذخیرہ برآمد ہوا اور سارے پاکستان میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی پیپلز پارٹی کی حکومت کے ترجمان نے کہا کہ ہتھیاروں کی تازہ کھیپ پکڑی گئی ہے۔ اس سے پہلے تمام اسلحہ جو آیا علیحدگی پسندوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس روز اکبر بگٹی نے موچی دروازہ لاہور میں تقریر کی جسے سرکاری احکامات کے تحت اخبارات میں نمایاں جگہ دی گئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ اسلحہ صرف دس فیصد ہے کیونکہ بقایا 90 فیصد بلوچستان میں تقسیم کیا جا چکا ہے۔ جہاں غیر ملکی ماہرین علیحدگی پسندوں کو گوریلا جنگ

کی تہنیت دے رہے ہیں۔ اکبر بگٹی نے بلوچستان کی حکومت پر کڑی تنقید کی اور وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا کہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں فوری طور پر توڑ دی جائیں ورنہ نیپ سرحد اور بلوچستان کو پاکستان سے علیحدہ کر دے گی۔ اسی روز بلوچستان کے گورنر بزنجو نے کوئٹہ سے عراقی اسلحے کی برآمدگی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے واضح کیا کہ ہم پر یہ الزام غلط ہے کہ ہم اسلحہ سمگل کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اسلحہ بلوچستان سے نہیں بلکہ اسلام آباد سے آرہا تھا اور یہ جاننے کے لئے کہ اسلحہ کہاں جاتا ہے مرکزی حکومت تحقیقات کرائے، ہم ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ اسی روز خان قیوم بزنجو پر برسے اور کہا کہ ثابت ہو گیا ہے کہ سرحد اور بلوچستان والے اسلحہ منگوا رہے ہیں۔

13 فروری کو اکبر بگٹی نے دعویٰ کیا کہ اسلحے کی برآمدگی سے نیپ پر لگائے جانے والے الزامات ثابت ہو گئے ہیں چنانچہ فوراً ان حکومتوں کو توڑا جائے۔ ادھر بزنجو اور ارباب سکندر دونوں گورنروں نے اسلحے کی برآمدگی پر تشویش کا اظہار کیا لیکن نیپ کو ملوث کرنے کی مذمت کی۔ پشاور سے ولی خاں نے مطالبہ کیا کہ عراقی اسلحے کے بارے میں سپریم کورٹ کے کسی جج سے تحقیقات کرائی جائیں اور قومی اسمبلی میں اس پر بحث ہو۔ اسی روز گورنر پنجاب مسٹر کھر کے حکم پر پنجاب سے نیپ کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ عاشورہ کے موقع پر انہوں نے شیعہ سنی فسادات کرانے کا منصوبہ بنایا۔ اس الزام کی پنجاب کے سیاسی حلقوں میں بہت ہنسی اڑائی گئی کیونکہ نیپ وہ واحد جماعت تھی جس کو سیکولر سمجھا جاتا تھا اور جس کے لئے عاشورہ کے موقع پر ہنگامے کرانا بچگانہ الزام تھا۔ اسی روز حکومت عراق کی جانب سے اس خبر پر تعجب کا اظہار کیا گیا کہ ان کے سفارتخانے سے اسلحہ برآمد کیا گیا ہے۔ ادھر سندھ کے ایک وزیر جام صادق علی نے سندھ کے گورنر رسول بخش تالپور پر الزام لگایا کہ ان کے بھائی علی احمد تالپور اسلحے کے سکینڈل میں ملوث ہیں اور رسول بخش ان کی امداد کر رہے ہیں۔ 14 فروری کو گورنر رسول بخش تالپور نے استعفیٰ دے دیا اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں سندھ کی نئی گورنر بنیں۔ اسی روز پاکستان مسلم لیگ کے نائب صدر زاہد سرفراز نے بیان دیا کہ حکومت عراقی اسلحے کو ایک خاص جماعت کے خلاف استعمال کر رہی ہے نیز یہ کہ نواب اکبر بگٹی کی شخصیت خود مشکوک ہے لہٰذا اسلحے کی سازش کی تحقیقات سپریم کورٹ سے کرائی جائیں۔ اگلے روز بلوچستان اور سرحد میں

صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ نیپ اور جمعیت کی کابینہ توڑ دی گئی، وزرائے اعلیٰ برطرف کر دیے گئے۔ سرحد میں اسلم خٹک اور بلوچستان میں اکبر بگٹی کو گورنر بنا دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے وزیر کوثر نیازی نے کہا کہ عراقی اسلحے کی پہلی پیٹی آئی تو ہمیں اس کا علم تھا۔ پنجاب کے مخالف رہنماؤں نصر اللہ خاں، جنرل سرفراز خاں، ملک قاسم، منظر بشیر، رانا ظفر اللہ خاں نے مشترکہ بیان میں سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کو برطرف کرنے کی مذمت کی۔ اسی روز عراقی اسلحے کو بہانہ بنا کر چودھری ظہور الٰہی کی کوٹھی واقع گجرات میں چھاپہ مارا گیا کہ پولیس کے بقول وہاں سے اسلحہ برآمد ہوا۔ 17 فروری کو مسلم لیگ کے نائب صدر زاہد سرفراز نے الزام لگایا کہ گورنروں کی برطرفی اور صدر راج کا نفاذ غیر جمہوری ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اکبر بگٹی کا جلسہ لاہور میں سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا اور عراقی اسلحہ کو بنیاد بنا کر وفاقی حکومت مخالفوں کو کچل رہی ہے۔

اسی روز چودھری ظہور الٰہی کو گرفتار کر لیا گیا۔ 19 فروری کو قیوم خان نے کہا کہ صدر بھٹو کے اقدامات درست ہیں کیونکہ نیپ نے سرحد مکتی اور بلوچ باہنی بنا رکھی تھیں۔ 20 فروری کو پنجاب حکومت نے ڈی پی آر کے تحت جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد کو گرفتار کر لیا ادھر ولی خان نے کہا کہ اکبر بگٹی کے تقرر سے بلوچستان کی صورتحال خراب ہو جائیگی۔

## بگٹی خاندان کی مزاحمت کا پس منظر

نواب اکبر خان بگٹی اپنے قبیلے کے وہ پہلے فرد نہیں تھے جسے حکومتِ وقت کے ہاتھوں المناک موت سے دوچار ہونا پڑا، تقریباً ڈیڑھ صدی قبل غلام حسین بگٹی بھی اسی طرح برطانوی فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوئے تھے۔ غلام حسین اور نواب بگٹی کے آخری ایام میں انتہائی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اپنے قبیلے کے ساتھ چھوڑ جانے پر غلام حسین نے مری قبیلے میں پناہ لی تھی اور وہیں سے مرتے دم تک مزاحمت جاری رکھی اور حکومتی ترجمانوں کی طرف سے 'کمانڈرز' کہے جانے والے نواب بگٹی کے انتہائی قریبی لوگ بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے، جس پر نواب کو بھی مری علاقے میں روپوشی اختیار کرنی پڑی۔

غلام حسین بگٹی، قبیلے کی مسوری شاخ کے وڈیرے تھے لیکن اس وقت کے برطانوی افسروں کی طرف سے لکھی گئی یادداشتوں میں ان کا ذکر ایک 'قانون شکن' فرد کے طور پر آتا ہے

جس نے حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ان پر لگائے گئے الزامات بھی کم و بیش وہی تھے جو پاکستان کی فوجی حکومت نے نواب بگٹی کے خلاف لگا رکھے تھے، مثلاً یہ کہ انہوں نے اپنی ملیشیا بنا رکھی تھی، جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی کرتے اور اردگرد کے قبائل ان سے تنگ تھے۔

اٹھارہ سو ستاون کی ناکام جنگ آزادی کے بعد، جسے نوآبادیاتی حکمران بغاوت اور غدر کا نام دیتے ہیں، برطانوی استعمار برصغیر کے کونے کونے میں اپنا اثر ونفوذ بڑھا رہا تھا۔ اس حوالے سے کوہ سلیمان کے مشرقی جانب واقع ضلع ڈیرہ غازی خان کے بلوچ قبائل مزاری، لغاری، کھوسہ، دریشک، بزدار، بلنڈ اور گورچانی کے سردار حلف تابعداری اٹھا چکے تھے جبکہ مغربی جانب والے قبائل میں سے بگٹی سردار غلام مرتضٰی خان بھی وفاداری کا دم بھر رہے تھے۔ تاہم مری سردار گزن خان سرکشی کی طرف مائل تھے۔

ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن (بعد میں سر) رابرٹ سنڈیمن تھے جن کی وضع کردہ حکمت عملی کی بدولت، جسے 'فارورڈ پالیسی' کا نام دیا جاتا ہے، بلوچستان کے قبائل کو مطیع کیا گیا تھا۔ فارورڈ پالیسی کا مقصد لاقانونیت کے لیئے مشہور بلوچ اور پشتون قبائل کو کسی ضابطے میں لانا تھا تاکہ ایشیاء کی وسطی ریاستوں تک جانے والے راستے کو تجارت کے لیئے محفوظ بنایا جاسکے۔

اٹھارہ سو ستر میں سنڈیمن کے ماتحت کام کرنے والے ایک انگریز اسسٹنٹ کمشنر رچرڈ آئزک بروس اپنی کتاب 'فارورڈ پالیسی اینڈ اٹس ریزلٹس' میں لکھتے ہیں: 'وسط ایشیائی ریاستوں تک بھرپور تجارتی رسائی کے لیئے بولان اور کچھی سے گزرنے والے راستوں کو سفر کے لیئے محفوظ بنانا بہت ضروری تھا'۔ جناب سنڈیمن جب ہڑند سے واپس جا رہے تو ایک گورچانی نے یہ کہتے ہوئے ایک تھیلے میں سے غلام حسین کا سر ان کے سامنے رکھ دیا کہ اس کے بغیر وہ یقین نہ کرتے (کہ ان کی کہی ہوئی بات پوری ہوگئی ہے)۔ لیکن غلام حسین اور ان کے وفادار اس میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھے جا رہے تھے۔ غلام حسین کو 'ضابطے' میں لانے کے لیئے سردار غلام مرتضٰی بگٹی (نواب اکبر بگٹی کے پردادا) اور مزاری سردار امام بخش خان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مرتضٰی بگٹی ایک دفعہ غلام حسین کو سنڈیمن کے دربار میں ساتھ لے

آنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن غلام حسین نے تابعداری سے انکار کیا۔ جب وہ دربار سے جارہے تھے تو بقول بروس سنڈیمن نے کہا کہ اس سرکشی کی قیمت تمہارا سر ہوگا'۔

غلام حسین نے بگٹی، مری اور کھیتر ان قبائل کے افراد پر مشتمل بارہ سو سواروں کا ایک لشکر تیار کیا اور ستائیس جنوری سنہ اٹھارہ سو اڑسٹھ کے روز ہڑند میں واقع برطانوی فوجی چھاؤنی پر حملہ آور ہوا لیکن سردار مرتضیٰ بگٹی نے حکومت کو اس حملے کے بارے پیشگی اطلاع کر رکھی تھی۔

## اکبر بگٹی کے آخری ایام، فوج اور بلوچستان

26 اگست 2006 کو کوہلو میں غار میں چھپے ہوئے اکبر بگٹی کو جب یقین ہوا کہ فوج ان کو زندہ گرفتار کر کے دنیا کے سامنے ان کے ساتھ تضحیک آمیز سلوک کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک خودکش بمبار میں بدل لیا۔ اکبر بگٹی جہاں پناہ لئے ہوئے تھے، جولائی کے پہلے ہفتے میں وہاں شدید بمباری کی گئی۔ اس حملے میں گن شپ ہیلی کاپٹر اور طیارے استعمال کئے گئے۔ اکبر بگٹی گھیرے میں آچکے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ لڑنے والوں نے اس گھیرے کو توڑ دیا اور اکبر بگٹی کو محفوظ مقام پر لے گئے۔ اس کے بعد مرحوم کو یقین ہو گیا کہ حکومت انہیں زندہ پکڑنا چاہتی ہے یا پھر مار دینے پر تلی ہوئی ہے۔ اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے اکبر بگٹی کے اکثر و بیشتر وڈیرے حکومت کے ساتھ تادیر محاذ آرائی نہ کر سکے اور ہتھیار ڈالنے لگے۔ سب سے طاقتور وڈیرے بنگا خان بگٹی نے اپنے ساتھیوں سمیت حکومت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو اکبر بگٹی تنہا رہ گئے اور ان کے لئے ڈیرہ بگٹی میں رہنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے ڈیرہ بگٹی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے دونوں پوتوں کو کہہ دیا کہ ملک چھوڑ دیں اور جہاں وہ محفوظ رہ سکتے ہیں چلے جائیں۔ یوں ان کے پوتوں نے جولائی ہی میں پاکستان چھوڑ دیا۔ اور افغانستان چلے گئے۔

نواب نے فیصلہ کر لیا کہ اب ڈیرہ بگٹی ان کے لئے غیر محفوظ ہو گیا ہے، اس لئے انہیں اپنے وڈیروں کی بے وفائی کا علم ہو گیا تھا۔ یوں اکبر بگٹی کے تمام خفیہ ٹھکانے غیر محفوظ ہو گئے تھے اور جہاں جہاں انہوں نے وڈیروں کے لئے اسلحہ رکھا ہوا تھا اس کی نشاندہی وڈیرے

ہتھیار ڈالنے کے بعد حکومت کو کر چکے تھے۔ یوں وہ تنہا اور غیر محفوظ کر دیئے گئے، جس پر انہوں نے ڈیرہ بگٹی میں لڑائی ترک کر کے نقل مکانی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور نارنائی کے علاقے میں چلے گئے جو اونچے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے اور ان کے نچلے حصے میں انہوں نے ایک غار کو اپنے لئے محفوظ تصور کر کے ٹھکانہ بنالیا۔ یہ علاقہ ڈیرہ بگٹی سے نزدیک بھی تھا۔ یوں وہ اپنے بعض ساتھیوں سے رابطہ بھی کر سکتے تھے جن لوگوں نے اس حصے کو دیکھا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ یہ بے آب و گیا علاقہ ہے اور اس کے ہر حصے میں غاروں کا سلسلہ موجود ہے۔ یہ علاقہ بھی انہوں نے بالاچ مری کے مشورے پر محفوظ سمجھا تھا۔ ایک طرف اکبر بگٹی یہاں اپنے آپ کو مکمل محفوظ تصور کر رہے تھے، دوسری طرف حکومت ان پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ان کے وفاداروں کی تعداد خاصی کم ہو چکی تھی، بعض مری قبائلی اطراف کی پہاڑیوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ یوں اکبر بگٹی مطمئن تھے کہ وہ محفوظ ہو گئے ہیں۔

اب وہ لڑنے کا ارادہ ترک کر چکے تھے اس لئے پہلے انہوں نے اپنا قلعہ چھوڑا، اس کے بعد اپنی آبائی زمین چھوڑی، یوں وہ مرحلہ وار اپنے لوگوں اور دوستوں سے دور ہوتے چلے گئے۔ نارنائی کے علاقے سے وہ کہیں اور جانے کا سوچ رہے تھے کہ ان کی مخبری ہو گئی اور ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا۔ ایک کرنل کی سربراہی میں کمانڈو دستہ بھی علاقے میں بھیج دیا گیا جس نے اطراف کی پہاڑیوں پر پہرہ دینے والے مری قبائل کو دبوچ لیا اور اکبر بگٹی کو بالکل تنہا اور بے بس کر دیا گیا۔ اس کے بعد نواب صاحب کو ان ہی کے ایک محافظ کے ہاتھوں پیغام پہنچایا گیا کہ وہ گھیرے میں ہیں اور ہتھیار ڈال دیں۔

اکبر بگٹی کے لئے اس مرحلے پر کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ وہ گھیرا ڈالنے والے کرنل سے بات چیت پر آمادہ ہو گئے۔ یہ نقشہ 12 اگست سے پہلے ترتیب پا گیا تھا۔ 12 اگست سے اکبر بگٹی اور کرنل کے درمیان رابطہ ہو گیا تھا، گفت و شنید شروع ہو گئی تھی اور اکبر بگٹی بعض شرائط پر حکومت کے ساتھ مفاہمت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وہ شرائط کیا تھیں؟ اس کا علم تو نہ ہو سکا تاہم بہت سے معاملات کرنل کے ذریعے اکبر بگٹی اور حکومت کے درمیان طے پا رہے تھے کہ اکبر بگٹی کے سامنے نئی شرط رکھ دی گئی۔ یہ کہ اکبر بگٹی الیکٹرانک میڈیا اور پریس کے سامنے سرنڈر ہونے کا اعلان کریں گے۔ یہ شرط گورنر بلوچستان نے دی تھی جبکہ وہ اپنے بیانات کے ذریعے اکبر بگٹی

کے ساتھ مسلسل محاذ آرائی پر تلے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اکبر بگٹی ان کی موجودگی میں سرنڈر کا اعلان کریں۔ جب اکبر بگٹی کے سامنے یہ موقف رکھا گیا تو انہوں نے توقف کیا اور بعد میں جواب دینے کا کہا۔ اس دوران درمیان کی کڑی آ گئی۔ خبر مشہور کر دی گئی کہ اکبر بگٹی کوئٹہ پریس کلب آکر صحافیوں سے خطاب کریں گے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ اکبر بگٹی نے خود کو حکومت کے حوالے کر دیا ہے یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ وقت گزرتا رہا مگر اکبر بگٹی کی آمد کے آثار نہیں تھے۔ رات کا ایک بج گیا لیکن اکبر بگٹی نہیں لائے گئے۔ حالانکہ آئی ایس پی آر نے خبر کی توثیق کر دی تھی۔ اس مرحلہ تک اکبر بگٹی حکومت کی گرفت میں آ چکے تھے اور کرنل مطمئن تھا کہ وہ اپنی پناہ گاہ سے جلد نکلیں گے اور ہیلی کاپٹر میں کوئٹہ چلیں گے جہاں گورنر اویس غنی سے ملاقات کے بعد پریس کانفرنس کریں گے اور سرنڈر کا اعلان کر دیں گے۔

انہیں سرنڈر کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے سوچا کہ حکومت انہیں رسوا کرنا چاہتی ہے اور پھر انہوں نے وہ فیصلہ کر لیا جو کرنل اور حکومت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ 26 اگست 2006ء کی شام انہوں نے اپنے محافظ کے ذریعے کرنل کو اطلاع دی کہ وہ بات چیت کے لئے غار کے اندر آ جائیں۔ کرنل اپنی ٹیم کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ 2 میجر، 3 کیپٹن اور کچھ سپاہی تھے، جونہی وہ غار میں داخل ہوئے، زوردار دھماکہ ہوا اور وہ سب اس کی زد میں آ گئے۔ دھماکے میں غار کی چٹانیں ٹوٹ کر گر گئیں اور وہ ان کے تلے دب گئے۔ اکبر بگٹی بھی ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ اکبر بگٹی کئی بار کہہ چکے تھے کہ وہ زندہ حکومت کے ہاتھ نہیں آئیں گے بلکہ موت کو ترجیح دیں گے۔ بعض اطلاعات کے مطابق وہ اپنی موت کا فیصلہ کر چکے تھے اور اپنی جیکٹ کے نیچے بیلٹ باندھ لی تھی۔ یہی وہ فیصلہ تھا جس کے لئے اکبر بگٹی نے کرنل سے کچھ وقت لیا۔

اب بگٹی کا خون بلوچستان کی سیاست کو زیر وزبر کرتا رہے گا اور بہت کچھ تبدیل کر دے گا۔ نواب اکبر بگٹی کو جس طرح فوج سے مقابلے میں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے، اس کے اثرات نہ صرف بلوچستان پر اثر انداز ہوئے بلکہ پاکستان کی قومی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئی۔ اکبر بگٹی کے ساتھ کشمکش کے دوران ایک لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے کے ایک فوجی افسر نے گورنر ہاؤس کوئٹہ میں صدر پرویز مشرف سے کھل کر کہا تھا کہ بگٹی کے خلاف فوجی آپریشن

درست نہیں اس کو روک دیں۔ اس پر صدر پرویز مشرف نے لیفٹیننٹ جنرل سے کہا کہ آپ کو بہت سی چیزوں کا علم نہیں، ان سے میں آپ کو بعد میں آگاہ کروں گا۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق فوج اور اکبر بگٹی میں مقابلے کی ویڈیو فلم بھی بنائی گئی۔ مقتول بلوچ سردار کی لاش کو اٹھائے جانے سے لے کر تدفین تک کی فلم بھی تیار کی گئی۔ ان دنوں تمام سیاسی جماعتوں کا مطالبہ تھا کہ بگٹی کے قتل کی عدالتی تحقیقات کرائی جائیں۔ اکبر بگٹی نے جس طرح جان دی، اس کے اثرات بلوچستان پر بہت واضح نظر آرہے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا اثر قوم پرست پارٹیوں پر پڑا اور بلوچستان نیشنل پارٹی کے دو ارکان نے بلوچستان اسمبلی سے اور رؤف مینگل نے قومی اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا۔ بلوچستان اسمبلی سے مستعفی ہونے والوں میں اختر حسین لانگو اور اکبر مینگل شامل ہیں۔ اس کے بعد نیشنل پارٹی کے ارکان پر دباؤ بڑھ گیا کہ وہ بھی مستعفی ہو جائیں لیکن پارٹی کے سربراہ عبدالحئی بلوچ کا موقف تھا کہ وہ چونکہ پونم اور اے آر ڈی کا حصہ ہیں اس لئے سب کے مشورے کے بعد اجتماعی طور پر مستعفی ہو جائیں گے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اکبر بگٹی کا ڈی این اے ٹیسٹ بین الاقوامی میڈیکل بورڈ سے کرایا جائے۔ اکبر بگٹی کے بعد بلوچستان کی قوم پرست پارٹیوں نے احتجاجی مہم شروع کر دی۔ اس مہم میں قوم پرست پارٹیوں کے ساتھ پیپلز پارٹی بھی شامل ہو گئی اور پشتون خوا بھی، مگر پشتون خوا ملی عوامی پارٹی کے سربراہ محمود خان اچکزئی نے اکبر بگٹی کے بیٹوں سے بگٹی ہاؤس جا کر تعزیت تک نہ کی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نواب اکبر بگٹی نے دور گورنری میں ان کے والد عبدالصمد خان اچکزئی ایک بم دھماکے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ جس کا الزام اکبر بگٹی پر لگایا گیا تھا۔ اکبر بگٹی کے بیٹے سلیم بگٹی مرحوم اور نواب اسلم رئیسانی کے درمیان تصادم میں اسلم رئیسانی کا چھوٹا بھائی مارا گیا تھا۔ اکبر بگٹی کے 2 نواسے بھی ہلاک ہوئے تھے۔ چنانچہ اکبر بگٹی کے قتل پر بلوچستان میں قبائل کی احتجاجی تحریک میں زیادہ جوش و خروش پیدا نہ ہو سکا۔ البتہ یہ خیال زیر گردش رہا کہ سب پارٹیوں کو اکٹھا ہونا چاہئے۔ یہی بات اکبر بگٹی نے پہاڑ پر جانے سے قبل کہی تھی۔ اس کا کوئی مثبت جواب نہ دیا گیا تھا بلکہ سردار عطاء اللہ مینگل نے اسے طنزیہ جملوں میں اڑا دیا تھا۔ جب ان سے اکبر بگٹی کی اس تجویز کے بارے میں سوال کیا گیا تو ان کا جواب تھا یہ تو ایسا ہی ہے کہ اچانک کوئی کہے کہ مجھے اپنا داماد بنا لیں۔ یوں اکبر بگٹی کی اہم تجویز کو

سردار عطاء اللہ مینگل نے ہوا میں اڑا دیا تھا۔ نواب خیر بخش مری اس پر خاموش رہے تھے۔ یوں اکبر بگٹی کی طرف سے سنگل بلوچ پارٹی کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ اس سلسلے میں بلوچ عوام کا بھی دباؤ تھا، مگر حقیقت میں کوئی قوم پرست پارٹی اپنی سیاسی باگ ڈور دوسرے کے ہاتھ تھمانے کو تیار نہیں تھی، بلوچ علاقوں میں بلوچستان نیشنل پارٹی سردار عطاء اللہ مینگل کے زیر اثر تھی، دوسری جماعت نیشنل پارٹی ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر حیٔ بلوچ ہیں۔ وہ کسی طور عطاء اللہ مینگل کے ماتحت نہیں جانا چاہتے تھے۔ تیسری بلوچ پارٹی اکبر بگٹی کی جمہوری وطن پارٹی ہے جسے ان دونوں کے زیر اثر جانا پسند نہیں تھا۔ اس وقت سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بالاچ مری ایک طرف اسمبلی کے رکن بھی تھے اور پہاڑوں پر جا کر لڑتے بھی رہے۔ ان کا تعلق کالعدم بلوچ لبریشن آرمی سے ہے اور اگر حکومتی دعووں کے مطابق اسے افغانستان سے اسلحہ اور پیسہ بھی مل رہا تھا تو حکومت نے خاموشی کیوں اختیار کی اور حکومت کی نظر میں وہ دہشت گرد ہیں تو ان پر مقدمہ کیوں نہیں چلایا جاتا۔ حکومت نے ان کی نشست کیوں ختم نہیں کی تھی۔ حکومت کی اس متضاد پالیسی پر سب انگشت بدنداں تھے کہ بالاچ مری فوج سے مسلح تصادم بھی کر رہا تھا اور بلوچستان اسمبلی کا رکن بھی تھا۔

O

باب نمبر 2

# پاکستان میں امریکی مداخلت

## ریاست ہائے متحدہ امریکہ

دنیا کی تاریخ کا مطالعہ انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔ دنیا میں انسانی آبادی کی ابتداء کے متعلق مورخین و محققین کسی ایک نظریے پر متفق نہیں۔ غیر الہامی ماخذوں کی شہادت پیش کرنے والوں نے گذشتہ صدی کے دوران کچھ ایسے اصول اور پیمانے وضع کیے جن کی مدد سے انسانی آبادی کی ابتداء کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی۔ ان کے مطابق، انسانی یادداشت اور تہذیب کے آغاز سے قبل دنیا میں حیات کی موجودگی کے متعلق ہمارے علم کا بنیادی ماخذ ان جاندار اشیاء کی باقیات اور فوسلز ہیں، جو طبق در طبق جمے پتھروں سے ملے ہیں۔ الہامی ماخذوں کے پیروکار (مذاہب کے پیروکار خصوصاً مسلمان) سب سے زیادہ معتبر ماخذ آسمانی کتابوں کو قرار دیتے ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو آدمؑ سے پیدا کیا ہے۔ قرآن میں انسان کی تخلیق بڑے واضح اور دوٹوک انداز میں بیان کی گئی ہے۔ آدمؑ کے بعد ایک اہم واقعہ قرآن میں نوحؑ کا بھی بیان ہوا ہے کہ جب دنیا کے گناہ گاروں کو سزا کے طور پر سپرد آب کر دیا گیا اور اللہ کے اطاعت گذاروں کو ایک کشتی میں سوار کر کے محفوظ کر لیا گیا جن کی اولاد انسانوں کی موجودہ نسل ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک نوحؑ کے سات بیٹے تھے جو مختلف رنگ اور نقوش کے حامل تھے جو ساتوں براعظموں میں پھیل گئے۔ اسی لیے آج دنیا میں مختلف رنگوں، نسلوں اور چہروں کے انسان دیکھے جاتے ہیں۔ ماہرین سماجیات کا کہنا ہے کہ چہرے اور رنگ کی ساخت کا تعلق ہر خطے کی مخصوص آب و ہوا، جغرافیے اور خوراک سے

ہوتا ہے۔ انہی میں سے سفید رنگ اور نیلی آنکھوں والے انسانوں کی ایک بڑی تعداد امریکیوں کی ہے۔ اس موضوع کو ہم نے کتاب کے شروع میں بیان کیا ہے یہاں ہمارا موضوع دنیا میں پھیلے ہوئے کروڑوں انسانوں میں سے ایک ایسے گروہ کی مختصر تاریخ بیان کرنا ہے جو گذشتہ سات آٹھ دہائیوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ اسے امریکہ یا ریاستہائے متحدہ امریکہ کہا جاتا ہے۔

## امریکہ (یو ایس اے) کی مختصر تاریخ

جب برصغیر میں مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر، جس کا پردادا امیر تیمور دہلی کو فتح کر کے یہاں انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر اپنی ہیبت ناکی سے لوگوں کو اپنی رعایا بنا کر عدم میں جا چکا تھا، نے آنے والے تین سو سال تک اپنی نسل کے لیے ہندوستان کو سلطنت بنانے کا ارادہ کیا تو اسے فرغانہ سے نکل کر دہلی کی طرف سفر کرنا پڑا۔ ہندوستان میں جب بابر 1526 میں ابراہیم لودھی سے لڑ رہا تھا تو سات سمندر پار دور ایک ہسپانوی لوکاس واز کیوز ڈی ایلین (امریکہ) کیرولینا میں ایک نئی کالونی کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھا۔ شمالی امریکہ میں جن یورپی باشندوں نے سب سے پہلے کالونیاں قائم کیں وہ سپین کے رہنے والے تھے۔ اٹھارویں صدی کے بعد تین چوتھائی حصہ میں تاریخ نے تقسیم شدہ یورپ کے غیر معمولی تماشے دیکھے جن کا سبب یورپ ہی تھا جس میں کوئی سیاسی یا مذہبی اتحاد باقی نہ رہا تھا، جبکہ دوسری طرف کتابوں کی اشاعت، طبع شدہ نقشہ جات اور بحری جہازوں کے سفر کی نئی سہولت نے انسانی تخیل کو بے پناہ تحریک دی۔ اگرچہ یہ تحریک غیر منظم اور متنازعہ ہی تھی تاہم اس نے انسان کو اس اہل بنا دیا کہ وہ دنیا کی بندرگاہوں پر حکمرانی کر سکے۔ کسی منصوبہ بندی کے بغیر اور بے جوڑ جوش کی یہ مہم جوئی بقیہ انسانیت کے عارضی اور حادثاتی مفادات کے تحت جاری ہوئی۔ انہی مفادات کے تحت اس نئے اور بڑی حد تک خالی براعظم امریکہ کو مغربی لوگوں نے پُر کیا۔ جبکہ جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے آباد کاروں نے مستقبل کی ممکنہ یورپی آباد کاری کے لیے راہ ہموار کی۔ اس زمانے میں معاشی مفادات بڑی حد تک تجارت سے وابستہ تھے۔

کولمبس کا امریکہ اور واسکوڈی گاما کا ہندوستان تک جانے کا واحد محرک تجارت ہی

تھا جو شروع میں ہی ملاحوں کی ترغیب کا باعث بنا ہوا تھا۔ اور ایک گنجان آباد اور وسائل سے بھر پور مشرق کی طرف مذکورہ سیاحوں کے لیے یہ محرک زیادہ مضبوط ثابت ہوا۔ یورپی آبادیاں تجارتی مراکز کی حیثیت سے ہی کافی عرصے تک قائم رہیں۔ امریکہ میں مقیم کارندوں نے عام طبقہ سے زیادہ قریبی تعلقات قائم نہ کیے بلکہ ایک لحاظ سے فاصلہ ہی رکھا۔ پاپائیت اور ہسپانوی امریکیوں کے خلاف مقامی لوگوں میں ایک شدید تحریک پیدا ہوئی جس پر امریکہ میں مسلح یورپی داخل ہونا شروع ہوئے۔ ان میں سے کچھ افراد نے منصوبہ سازوں اور محققین کا کردار بھی ادا کیا۔ شمال میں انہوں نے سور کی کھال کا کاروبار کیا۔ بدیس میں بستیاں تعمیر کرنے کے لیے انہوں نے لوگوں کو اپنا مرہون منت کر لیا۔ جب انگریز راہب سترھویں صدی کے اوائل میں مذہبی تعزیرات سے بچنے کی خاطر نئے انگلستان میں داخل ہوئے، جب اٹھارویں صدی میں اوگلیتھورپ نے انگریز قرض خواہوں کے عقوبت خانوں سے لوگوں کو نکال کر جارجیا بھیجا، اور جب اٹھارویں صدی کے اواخر میں ڈنمارک کی حکومت نے یتیموں کو "کیپ آف گڈ ہوپ" میں آباد کیا تو اہل یورپ نئے گھروں کی تلاش میں سمندروں کے پار جا چکے تھے۔ خاص طور پر انیسویں صدی میں دخانی بحری جہاز کی ایجاد کے بعد یورپی لوگوں کی امریکہ اور آسٹریلیا کے نئے غیر آباد خطوں کی جانب ہجرت چند دہائیوں میں نہایت تیز رفتار رہی۔ اس طرح یورپین کی مستقل بدیسی آبادیاں قائم ہوئیں تو یورپی تمدن وسیع علاقوں میں پھیلنے اور نمو پانے لگا۔ نئی سر زمینوں پر ان آبادیوں کی بدولت لائی گئی تہذیب بغیر منصوبہ بندی اور کسی شعوری کوشش کے پرورش پاتی رہی۔ یورپی سیاستدانوں اور حکمرانوں نے ان آبادکاروں کو محصولات کا وسیلہ اور اپنی ملکیت ہی سمجھا جو ان پر انحصار کرتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں اپنی الگ سماجی زندگی کے متعلق گہرا شعور بیدار ہونے لگا جو ایک صدی سے اپنے آبائی وطن میں ایک بے یار و مددگار عوام کے روپ میں اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ یہ آبادکاری بہت دور تک پھیل گئی اور اگر سمندر سے ان کے خلاف کبھی کوئی کارروائی کی جاتی تو وہ یکسر غیر موثر ثابت ہوتی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ انیسویں صدی تک ان تمام غیر ملکی سلطنتوں کا باہمی رابطہ بحری جہازوں کی بدولت قائم تھا۔ خشکی پر سب سے تیز ترین سواری گھوڑا تھا اور خشک علاقوں پر سیاسی نظاموں کا اشتراک و اتحاد گھوڑوں کے ذریعے ہونے والے تبادلہ اطلاعات سے ہی برقرار تھا۔

اٹھارویں صدی کے تین چوتھائی دور کے اختتام پر شمالی امریکہ کا دو تہائی حصہ برطانوی قلمرو میں شامل ہو چکا تھا۔فرانس امریکہ سے دست بردار ہو گیا جبکہ برازیل پرتگیزیوں کے قبضے رہا۔ لیکن اس وقت تک وہاں ڈچ، سویڈش اور فرانسیسی کالونیاں بھی موجود تھیں۔آبادی اور ہیئت کے اعتبار سے یہ متنوع آبادیاں ان کے علاوہ تھیں جو برطانوی سلطنت کہلاتی تھیں۔

''میری لینڈ'' میں کیتھولک جبکہ نئے انگلستان میں پروٹسٹنٹ برطانوی آباد تھے جو خود کھیتی باڑی کرتے لیکن ورجینیا اور جنوبی علاقوں میں درآمد شدہ حبشی غلاموں سے مشقت کروائی جاتی تھی۔ایسی ریاستوں میں کوئی فطری اتحاد نہ تھا۔ایک ریاست سے دوسری میں سفر کرنے کا مطلب بحراوقیانوس سے پار جانے کا تکلیف دہ سفر کرنے کے مترادف تھا۔امریکہ اور برطانیہ کا یہ اتحاد امریکہ پر جبری طور پر برطانیہ کی طرف سے ٹھونسا گیا تھا۔مقامی باشندوں سے محصول لیا جاتا لیکن اسے خرچ کرنے کے متعلق وہ دریافت کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ان کی تجارت کو برطانوی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔اگرچہ ورجینیا کے باشندوں نے خود بھی حبشی غلام رکھے ہوئے تھے اور ان سے کام لیتے تھے تاہم وہ حبشی غلاموں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خوفزدہ بھی تھے کہ کہیں یہ وحشی ان کو کچل نہ دیں۔چنانچہ وہ سرعام غلاموں کی تجارت کرنے سے گھبراتے تھے۔اس کے باوجود برطانوی حکومت نے غلاموں کی منافع بخش تجارت کو جائز قرار دے رکھا تھا۔ان دنوں برطانیہ ایک مثالی بادشاہت کے لیے پر تول رہا تھا جس کے لیے جارج سوم نے (1820..1760) ان ملکی اور غیر ملکی کالونیوں کو باہم جوڑنے کی کاوش بھی کی۔

## کالونیوں سے برطانیہ کے اختلافات اور جنگ کا آغاز

اختلافات اس وقت شدید ہوئے جب امریکی بحری تجارت کی بجائے لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں قانون سازی کی گئی۔ان قوانین کے تحت جب برطانیہ نے چائے کے دو بحری جہاز امریکہ سے منگوائے تو چند لوگوں نے، جو ہندوستانی معلوم ہوتے تھے، چائے سے بھرے ان مال بردار دونوں جہازوں کو 1773 کو بوسٹن کی بندرگاہ پر سارا مال واسباب سمندر میں پھینک دیا۔لیکن جنگ کا ماحول اس وقت پیدا ہوا جب 1775 میں برطانوی حکومت نے بوسٹن کے قریب لیکسنگٹن میں دو امریکی راہنماؤں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔زیر زمین

امریکی ملائیشیا کے چھپائے ہوئے اسلحہ پر برطانوی فوجیوں نے قبضہ کرنے کی کوشش کی تو تمام ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ اس وقت امریکیوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس ضمن میں برطانوی کارندوں نے ہی سب سے پہلے لیکسنگٹن میں فائرنگ کی۔ لیکن پہلا تصادم کانکرڈ کے مقام پر ہوا جہاں برطانوی فوجیوں نے آٹھ امریکیوں کو مار دیا۔ یوں امریکی جنگ آزادی کی ابتداء ہوئی۔

تقریباً ایک سال تک ان کالونیوں کے لوگ اپنے آبائی وطن سے اپنے تعلقات منقطع کرنے پر بالکل رضامند نہ تھے۔ 1776 کے وسط میں ان فتنہ انگیز ریاستوں کی ''کانگرس'' نے آزادی کے اعلان نامے (Declaration of Independence) کا اعلان کر دیا۔ موجودہ یو ایس اے کی یہ پہلی کنفیڈریشن تھی جو بعد ازاں فیڈریشن میں تبدیل ہوئی۔ جارج واشنگٹن، جس نے کالونیوں کے دیگر راہنماؤں کے ساتھ فرانس کے خلاف عسکری تربیت حاصل کر رکھی تھی، کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔

## آزادی کے لیے جنگ

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوران یکے بعد دیگرا یسے واقعات رونما ہوئے کہ مقامی لوگوں اور برطانوی حکومت کے درمیان ناراضگی بڑھتی گئی۔ بوسٹن میں قتل و غارت اور برطانیہ کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں قانون سازی سے قبل برطانوی اشیا کا بائیکاٹ اور ٹیکس دینے سے انکار سے حالات کشیدہ ہوئے تو صورتحال جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ نکورڈ سے بوسٹن کی طرف جاتے ہوئے جب امریکی فوج کے 73 فوجی مارے گئے تو جنگ میں شدت پیدا ہو گئی۔ اسی دوران شاہی گورنری نظام منہدم ہوا اور امریکیوں نے شاہی مداخلت کے بغیر حکومت بنانے کا مطالبہ کر دیا۔ انہی دنوں برطانوی چارٹر کی جگہ نیا امریکی آئین تشکیل دیا گیا۔ کنفیڈریشن میں ایک قرارداد کے ذریعے جنگ کا اعلان کیا گیا اور غیر ملکی اتحادیوں کی تلاش کرنے پر زور دیا گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ بوسٹن سے فرار ہونے والی برطانوی فوج کینیڈا کی طرف بھاگ نکلی جہاں پہلے ہی وہ قابض تھے۔ وہاں سے برطانیہ نے فوج کو منظم کیا اور اگست 1776 میں آزاد کالونیوں پر حملہ کر دیا جو متحد ہو چکی تھیں۔ امریکہ

اور برطانیہ کے درمیان یہ جنگ 7 سال تک جاری رہی جس میں برطانیہ کو جزوی طور پر کامیابی حاصل ہوئی لیکن امریکہ کے اتحادیوں (فرانس، جرمن اور سپین) نے برطانیہ کو یورپ سے باہر نہ نکلنے دیا۔ اسلحہ اور خوراک سے بھرے بحری جہازوں کو ساحلوں سے دور رکھا گیا تو برطانوی فوج مشکل میں پھنس گئی اور اس نے مجبور ہو کر 1783 میں فرانس سے معاہدہ کر لیا۔ جنگ بندی کا اعلان کیا گیا۔ 1789 میں امریکہ کا نیا آئین تحریر کیا گیا اور جارج واشنگٹن کو ہی پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ 1802 تک مذکورہ فیڈریشن میں 18 ریاستیں شامل ہو چکی تھیں۔

1814 میں نپولین کی تخت سے دست برداری کے بعد برطانیہ نے امریکہ کے خلاف جارحیت میں اضافہ کر دیا اور امریکی جہازوں کی بندرگاہوں تک رسائی روک دی۔ برطانیہ نے کچھ ایسے جرمن باشندوں کو گرفتار کیا جو بھگوڑے نہ تھے۔ اس کے بعد امریکہ نے 1812 میں برطانیہ کیخلاف جنگ کا اعلان کر دیا جو 1815 تک جاری رہی۔ اس جنگ میں امریکہ کو مجموعی طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ اگلے سو سال تک یو ایس اے کو جنوبی امریکی ریاستوں کے سیاہ فام باشندوں کے ساتھ اور اندرونی خلفشار ختم کرنے کے لیے کئی جنگیں لڑنا پڑیں۔ یہ سلسلہ پہلی جنگ عظیم تک جاری رہا۔ 1914 تک شمالی امریکہ ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک بن چکا تھا۔ اس کے بعد امریکہ کا مطلب یو ایس اے یعنی شمالی امریکہ ہی لیا جانے لگا جو پہلی جنگ عظیم سے قبل تین بڑی جنگیں لڑ کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ دخانی کشتیاں، ریلوے اور مواصلات کا نظام امریکہ کی ترقی اور طاقت کا سبب بنے۔

## پہلی اور دوسری عالمی جنگیں اور امریکہ

1914 میں جرمن اور برطانیہ کے درمیان شروع ہونے والی جنگ جسے پہلی جنگ عظیم کہا جاتا ہے کے متعلق سپنگلر نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "The Decline Of Europe" میں بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا۔ جب یہ جنگ شروع ہوئی تو امریکہ کی آبادی تقریباً دس کروڑ تھی۔ امریکہ کے نزدیک اس وقت تک برطانیہ ایک امیر ترین اور طاقتور ترین ملک تھا جو یورپ اور ایشیاء و افریقہ کے ملکوں پر قابض تھا۔ جرمنی کے اکسانے کے باوجود ابتدا میں امریکہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ امریکی صدارتی امیدوار 'ووڈرو ولسن' نے یہ نعرہ بلند

کیے رکھا کہ وہ ''امریکی عوام کو جنگ سے باہر رکھے گا''۔ امریکہ کی طرف سے جرمنی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران میکسیکو کو امریکہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک خط لکھا جو امریکہ کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ جب امریکہ کی مدد جرمنی کے بجائے برطانیہ کو مل گئی تو جنگ کا فیصلہ برطانیہ کے حق ہو گیا۔ امریکی فوجوں نے فرانس میں رہ کر جرمنوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ یہ جنگ 1918 میں ختم ہوئی تو امریکہ میں 1919 میں نسلی فسادات شروع ہوئے جو 1921 تک جاری رہے۔ ان فسادات کا سبب وہ سیاہ فام تھے جو دو عشرے پہلے جنوبی امریکہ سے ہجرت کر کے شمالی امریکہ آئے تھے۔ اس کے بعد 1939 تک امریکہ کئی بحرانوں سے دوچار ہوا لیکن اسی دوران اس نے ریکارڈ ترقی کی۔ ڈالر کو مستحکم کیا گیا اور معیشت کو مضبوط کیا گیا۔ سائنسی میدان میں ترقی کرتے ہوئے ایٹم بم بنایا۔ آئین میں ترامیم کر کے آئینی پیچیدگیوں کو ختم کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم بھی جرمنی اور برطانیہ کے درمیان لڑی گئی جس نے دنیا کو دو واضح بلاکوں میں تقسیم کر دیا۔ جرمنی کے بڑھتے ہوئے قدموں کے پیش نظر امریکی صدر روز ویلٹ نے فوج میں اضافہ شروع کر دیا۔ 1941 میں جب جاپان نے جو جرمنی کا ساتھی تھا، بحرالکاہل کی پرل ہاربر پر حملہ کیا تو امریکہ نے جاپان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ ان دنوں امریکہ کی ائیر کرافٹ بنانے کی صنعت عروج پر تھی۔ 1942 کے تیسرے مہینے میں جاپانیوں کی ایک بڑی تعداد امریکہ کے مغربی ساحل پر اتری جن میں سے اکثریت کو گرفتار کر لیا گیا۔ باقی ماندہ واپس بھاگ گئے۔ 6 اگست 1945 میں جب جاپان نے امریکہ کے سامنے سرنڈر ہونے کے بجائے جنگ جاری رکھنے کا اعلان کیا تو اس نے جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ اس جنگ میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کو فتح ملی۔ امریکی صدر روز ویلٹ جس نے جنگ کے دوران بہترین حکمت عملی سے امریکیوں کو کافی حد تک محفوظ رکھا 12 اپریل 1945 میں جنگ کے خاتمے سے پہلے انتقال کر گیا۔ 1945 سے لیکر 1989 تک امریکہ کو دنیا میں پھیلے ہوئے کیمونزم کے خلاف کئی سرد و گرم جنگیں لڑنا پڑیں۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر طاقت بن گیا تو اس نے مسلمانوں اور اسلامی ریاستو ں کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ 1990 کے بعد امریکہ کسی نہ کسی صورت میں مسلمانوں کے

خلاف نبرد آزما رہا ہے۔ 21 ویں صدی کے شروع ہوتے ہی امریکی جارحیت میں شدت آگئی اور اس نے بیک وقت کئی مسلم ریاستوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ذیل میں پاک امریکہ تعلقات اور امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔

## امریکہ میں اسلام اور مسلمان

امریکہ میں اسلام گزشتہ تین دہائیوں میں تیزی سے پھیلا ہے۔ امریکی انتظامیہ کا بھی یہی کہنا ہے کہ امریکی بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں اور یہ سب سے زیادہ اپنایا جانے والا مذہب ہے۔ گیارہ ستمبر 2001ء کے واقعات نے اگرچہ اسلام کے بارے میں ایک منفی تاثر پیدا کیا۔ لیکن اس کے بعد اسلام کو سمجھنے، اسلامی تعلیمات کے بارے میں جاننے اور پڑھنے کے رجحانات بھی بہت تیز ہوئے۔ قرآن پاک بمعہ انگریزی ترجمے کے نسخے لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں کئی پرانی کتابوں کے تازہ ایڈیشن بھی شائع ہوئے جن کو لوگوں کی بڑی تعداد نے خریدا۔

امریکہ میں پہلا مسلمان کب اور کیسے پہنچا۔ 'ڈیانا ایل ایک' نے اس پر بھی گہری تحقیق کی ہے۔ اس کے مطابق اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں افریقہ سے جبری طور پر لائے جانے والے ایک کروڑ انسانوں کو غلام بنایا گیا۔ ان میں سے کم از کم دس فی صد مسلمان تھے۔ اور ان میں اکثر پڑھے لکھے تھے۔ ان کے سفید فام آقاؤں نے بھی ان کی دیانتداری، فرض شناسی کی تعریف کی۔ ان مجبور و مظلوم افریقیوں سے ہی امریکہ میں مسلمانوں کی پہلی نسل کا آغاز ہوا۔ ان کے بارے میں کئی کتابیں اور دستاویزات دستیاب ہیں۔ جبری غلامی کے بعد یہ مسلمان باقاعدہ امریکی شہری بنتے رہے۔ اور وہاں مستقل آباد ہوتے رہے۔ شروع میں انہیں اپنی جائیداد بنانے اور خریدنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

نئی امریکن نسل میں اسلام کے بارے میں خاص طور پر بہت گہرا تجسس پایا جاتا ہے۔ اس لیے پبلشرز۔ ٹی وی چینل مجبور ہیں کہ وہ ایسی کتابیں شائع کریں، ایسے پروگرام پیش کریں جن کے ذریعے نوجوان امریکیوں کے ذہنوں میں ابھرتے سوالات کا جواب مل سکے۔ امریکہ میں باقاعدہ کوئی مسلم شماری تو نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مختلف مضامین، کتابوں، جرائد اور

رپورٹوں کے مطابق مسلمان امریکہ کی کل 28 کروڑ کی آبادی میں 60لاکھ کے قریب ہیں۔جن میں مقامی افریقی، امریکی مسلمانوں کے علاوہ جنوبی ایشیائی بالخصوص بھارت، پاکستان، مشرق بعید اور مشرق وسطی سے آنے والے تارکین وطن بھی شامل ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی الگ الگ تنظیمیں بھی قائم کی ہوئی ہیں۔ جو بہت موثر انداز سے اپنا موقف عام امریکیوں اور انتظامیہ تک پہنچاتی ہیں۔

''ایک نیا مذہبی امریکہ'' کی مصنف ڈیانا ایل کی نے دوسرے مذاہب، بدھ مت، ہندومت، بہائی، جین مت وغیرہ کے ساتھ ساتھ امریکہ میں اسلام کے حوالے سے بھی بہت تحقیق کی ہے۔ مختلف ریاستوں میں مقیم مسلمانوں کے کنونشنوں، مذہبی رسوم میں شرکت کی۔ مساجد اسلامی اسکولوں اور اسلامی مراکز میں خود گئیں۔ منتظمین سے ملاقاتیں کیں۔ یہ تفصیلات ان کی اہم تصنیف میں پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ اسلام کے پھیلاؤ سے خوفزدہ نہیں ہیں بلکہ روشن پہلو دیکھتے ہوئے کہتی ہیں کہ مساجد کے میناروں اور گنبدوں نے امریکہ کے افق کو حسین تر کردیا ہے۔ ان کے مطابق پورے امریکہ میں 1400 کے قریب بڑی اور مرکزی مساجد ہیں۔ ہوسٹن میں دو درجن سے زیادہ اسلامی مراکز ہیں۔ جن میں سے دس اسلامک سوسائٹی آف گریٹر ہاؤسٹس کے رکن ہیں۔ جو 1968ء میں قائم کی گئی تھی۔

مسلمانوں کی ترجمانی کرنے والی دوسری تنظیموں میں امریکن مسلم کونسل، مسلم پبلک افیئرز کونسل، امریکن مسلم الائنس، ہارورڈ اسلامک سوسائٹی، اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ بھی قابل ذکر ہیں۔ کئی ریاستوں اور شہروں میں متعدد تنظیمیں مقامی طور پر بھی سرگرم عمل ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں اس وقت بھی اسلام کا خوف غالب ہے۔ اسلام فوبیا کی اصطلاح عام تھی۔ 1893ء شکاگو میں world's parliament of Religions مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ منعقد کی گئی۔ اس وقت خلافت عثمانیہ موجود تھی۔ وہاں سے کوئی مسلم مندوب نہ لیا گیا۔ یہاں مسلمانوں کی نمائندگی محمد رسل الیگزینڈر ویب نے کی جو نیویارک کے ایک اخباری پبلشر کے صاحبزادے تھے۔ امریکہ کے ہائی اسکول، کالج سے تعلیم یافتہ ویب پہلے رپورٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر فلپائن میں امریکہ کے قونصل جنرل مقرر ہوئے۔ وہاں انہیں اسلامی تعلیمات قریب سے جاننے کا موقع ملا اور انہوں نے اسلام قبول

کرلیا۔ مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا تھا:

"میں امریکیوں کا امریکی ہوں۔ میں بھی برسوں تک ہزاروں امریکیوں کی غلط فہمیوں کو ساتھ لے کر چلتا رہا۔ جو وہ اب بھی لے کر پھر رہے ہیں۔ یہ غلط فہمیاں تاریخ میں مضبوط ہو چکی ہیں۔ جعلی تاریخ نے اسلام کے بارے میں آپ کے نظریے کو متاثر کیا ہے۔ دس سال پہلے میں نے مشرقی مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ غلط فہمیوں کے زیر اثر اس وقت بھی میں نے اسلام کو درخور اعتنا خیال نہیں کیا۔ لیکن جب میں گہرائی میں گیا۔ اور یہ جانا کہ اسلام حقیقتاً کیا ہے؟، اور رسول عربی ﷺ کون تھے، کیا تھے؟ میں نے اپنے خیالات بدل لیے۔ اور اب میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک مسلمان ہوں۔"

اس وقت امریکہ میں بھی یہ تصور چھایا ہوا تھا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہے۔ ویب نے اسی حوالے سے کہا: "میں امریکہ اس لیے نہیں لوٹا ہوں کہ میں آپ سب کو مسلمان بناؤں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک میں قرآن لے کر چل پڑیں اور ہر اس شخص کو قتل کر ڈالیں۔ "جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" نہ کہے۔ مجھے امریکی دانش، اور تدبر پر اعتماد ہے۔ مجھے انصاف سے امریکی محبت پر یقین ہے جو امریکی ذہن اسلام کو سمجھے گا۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اسے پسند نہ کرے۔" ایک صدی پہلے کی آواز اب بھی امریکہ میں گونجتی ہے۔ مسلمانوں کی تنظیمیں امریکیوں سے یہی کہتی ہیں کہ آپ خود اسلام کا مطالعہ کریں۔ ذرائع ابلاغ نے پروپیگنڈے کے ذریعے اس کی جو مسخ شدہ صورت پیش کی ہے اس پر نہ جائیں۔ اسلامی تعلیمات کو خود پڑھیں پھر اپنی رائے قائم کریں۔

واشنگٹن میں سعودی عرب کے سفارت خانے کی طرف سے انتہائی خوبصورت لے آؤٹ کے ساتھ اور قیمتی کاغذ پر شائع شدہ ایک بروشر " Understanding Islam and the muslims" اسلام اور مسلمانوں کی تفہیم، کے زیر عنوان تقسیم ہوتا ہے۔ جس میں مختصراً یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کیا ہے، مسلمان کون ہیں۔ مسلمانوں کے عقائد کیا ہیں، مسلم کیسے بنتا ہے۔ اسلام کا مطلب کیا ہے۔ اسلام اکثر اجنبی کیوں لگتا ہے، کیا عیسائیت اور اسلام کی بنیادیں الگ ہیں۔ خانہ کعبہ کی کیا اہمیت ہے۔ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ وہ پیغمبر خدا کیسے بنے۔ اسلام نے دنیا کو کیسے متاثر کیا۔ قرآن پاک کیا ہے۔ اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ دوسری

مقدس تعلیمات کیا ہیں۔ احادیث رسول کی اہمیت کیا ہے۔ کیا اسلام دوسرے عقائد کی برداشت کرتا ہے۔ مسلمان حضرت عیسیٰ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں خاندان کی اہمیت کیوں ہے۔ مسلمان خواتین کے حقوق کیا ہیں۔ کیا ایک مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اسلامی شادی اور مسیحی شادی میں فرق، مسلمان اپنے بزرگوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ موت کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات، جنگ کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے۔ خوراک پر اسلام کی تعلیمات، مساجد کی تعمیر میں مختلف طرز ہائے تعمیر اور ثقافت، امریکہ میں اسلام، اسلام حقوق انسانی کی ضمانت کیسے دیتا ہے۔ امریکی ذہن جیسے سوچتا ہے، امریکہ میں طرز زندگی جیسی ہے۔ آپ کو انہی اصطلاحات اور اسی حوالے سے اسلام کے بارے میں سمجھانا پڑتا ہے۔ تب وہ اسلام کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے اندازِ فکر سے ان کو سمجھائیں گے تو وہ کچھ نہیں سمجھ پائیں گے۔

11 ستمبر سے پہلے بھی امریکن معاشرے کے بعض حصوں میں مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا تھا۔ بعض متعصب یہودی اور عیسائی تنظیمیں مسلمانوں پر تنقید کرتی رہتی تھیں۔ اور ان پر انتہا پسندی کا الزام عائد کرتی تھیں۔ نیویارک میں ورلڈ ٹاور، واشنگٹن میں پینٹاگون پر حملوں کے بعد تو ان تنظیموں اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرے اداروں کو بھی موقع مل گیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم شروع کردی۔ چونکہ ان بھیانک وارداتوں میں مشرق وسطیٰ کے نوجوانوں پر الزامات لگائے گئے تھے۔ اس لیے مساجد پر حملے ہوئے۔ مسلمانوں کی تجارت۔ بزنس۔ کمپنیاں، تباہ کردی گئیں۔ بعض مقامات پر جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے تاجروں، دکانداروں اور ملازمت پیشہ افراد کو نشانہ بنایا گیا ہے چاہے وہ مسلمان نہیں بھی تھے۔ حالانکہ یہ لوگ بڑی ذمہ داری سے اسی طرح اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ جس طرح دوسرے امریکی مسلمانوں نے 11 ستمبر کے بعد ایک تنظیم سالیڈ پریٹی انٹرنیشنل یو ایس اے قائم کی ہے۔ جس کا مقصد موجودہ حالات میں مسلمانوں کو قانونی تحفظ فراہم کرنا ہے۔ ایف بی آئی وغیرہ کی تفتیش کی صورت میں وکیل کی مدد دینا ہے۔ عام طور پر مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ زیادہ نمایاں نہ ہوں۔

11 ستمبر کے بعد ڈاکٹروں کے پاس آنے والے مریضوں کی تعداد کم ہوگئی۔ صدر

بش کی اسلامی مرکز واشنگٹن میں آمد کو دوسرے انداز سے دیکھا گیا۔ انکے مطابق اس سے مسلمانوں اور بالخصوص عربوں کے خلاف امتیازی سلوک کے رجحانات زیادہ شدید ہوئے۔ مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جنہوں نے انتہائی صدق دلی اور پرامن انداز سے ایک طرف عام امریکیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام دہشت گردی نہیں سکھاتا۔ تشدد کی تعلیم نہیں دیتا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو بھی باور کروایا کہ انہوں نے اپنے طور پر عام شہریوں سے تعلقات میں بہتر ساکھ پیدا کرنے کی کوششیں نہیں کیں۔ ان میں اسلامک ایسوی ایشن آف ریلے نارتھ کیرولینا کے منتظمین اور مسجدوں کے اماموں نے بھرپور استقامت سے یہ ثابت کیا کہ قرآن پاک بے گناہوں کی ہلاکت کی مذمت کرتا ہے۔ نیویارک کی ایک مسجد کے امام فیصل عبدالرؤف کی تصنیف ''اسلام کے نزدیک کیا جائز ہے'' شائع ہوئی جو ایک اس حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔ یہ مسجد 11 ستمبر کو نشانہ بننے والے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے 12 بلاک نزدیک واقع ہے۔ امام فیصل نے اپنی تحقیق اور مطالعے کے نتیجے میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ خطرناک ہوگا کہ امریکہ یا اسلام میں سے کسی کے نظریات کا دوسرے کے عمل سے تقابل کیا جائے۔ اس سے تضادات نظر آئیں گے۔ دونوں کے نظریات کا نظریات سے عمل کا عمل سے موازنہ کیا جائے۔ امام فیصل خود بھی مصر، ملائیشیا اور انگلینڈ میں قیام کے بعد امریکہ میں لڑکپن میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی تصنیف کا عنوان ہے ''اسلام کے نزدیک کیا جائز ہے'' امام فیصل کویت کی پیدائش ہیں۔ تعلیم امریکہ میں ہی حاصل کی۔ کولمبیا یونیورسٹی سے ڈگری لینے والے فیصل کو امریکہ کی تاریخ۔ اقدار، شہری اصولوں پر اتنا عبور حاصل ہے۔ جو امریکہ میں پیدا ہونے والے اسکالرز کو بھی نہیں ہوگا۔ ان کا تجزیہ ہے کہ موجودہ تنازع خالصتاً مذہبی نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے عام تنازعات کی طرح یہ اختیارات اور اقتصادی مفادات کا تصادم ہے۔

یہ تو امریکہ کے اندر مسلمانوں اور امریکیوں کے، خصوصاً نائن الیون کے بعد، مسلمانوں کے متعلق خیالات اور سلوک کا ایک سرسری جائزہ تھا۔ امریکی حکومت کا اسلامی ممالک میں مداخلت اور اس تناظر میں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کا ذیل میں اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں اس بات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکی سی آئی اے نے مسلم حکمرانوں کو کس طرح اپنے زیر تسلط رکھا ہوا ہے۔

## امریکہ، برطانیہ، مسلم ممالک اور پاک امریکہ تعلقات

پہلی جنگ عظیم کے فوری بعد یورپ نے جس تیز رفتاری سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے مسلمانوں کے زیر قبضہ علاقوں کو اپنے تابعدار حکمرانوں میں تقسیم کیا اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو ختم کر کے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے راستے کی رکاوٹیں ختم کرنا چاہتا تھا۔ جو کام یورپ سرانجام نہ دے سکا اسے امریکہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل یورپ، افریقہ اور ایشیاء میں برطانیہ ہی غالب قوت تھا۔ کچھ مشرقی یورپین، ایشیائی اور اپنے ہمسایوں پر سوویت یونین کو کسی حد تک رسوخ حاصل تھا۔ ان تمام علاقوں میں برطانیہ نے جاسوسی کا ایک نیٹ ورک بھی قائم کر رکھا تھا۔ خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے سے قبل برطانیہ نے مشرق وسطیٰ اور ترکی میں اپنے مہرے قائم کر لیے تھے۔ ان علاقوں میں جب تیل کی بھنک بڑی طاقتوں کو پڑی تو انہوں نے اپنے حواریوں کو متحرک کرنا شروع کر دیا۔ رابرٹ ڈریفس نے ''مسلم ممالک میں امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کے شیطانی کھیل'' میں لکھا ہے کہ 'تاہم، اگر ہم انیسوی صدی کے اواخر میں یورپی استعماری کوششوں کو سامنے رکھیں اور پھر انگریزوں کی جانب سے خطہ عرب کی جغرافیائی حد بندی اور تقسیم، دوسری جنگ عظیم کے بعد نئے امریکی کردار اور پھر تیل کی اچانک اور بے پناہ دولت جیسے عوامل پر غور کریں تو واضح ہونے لگتا ہے کہ مسلمان حکمران کسی داخلی یا باطنی گمراہی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ایک وسیع تر سامراجی حکمت عملی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ 1920 سے لیکر 1999 تک سامراج نے مسلم حکمرانوں سمیت اہم اسلامی تنظیموں کو بھی اپنے مفادات اور اسلامی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے استعمال کیا۔

1899 سے لے کر پہلی عالمی جنگ کے ختم ہونے تک برطانیہ عظمیٰ نے بہترین طے شدہ حکمت عملیوں میں سے ایک پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ سلطنت عثمانیہ انیسویں صدی میں ''یورپ کا مرد بیمار'' آخری سانسیں لے رہی تھی۔ استعماری بحری جہازوں، ریل کے انجن اور آٹوموبیل نے تیل کی ایک ناقابل تسکین طلب پیدا کر دی تھی۔ ٹیکساس، رومانیہ اور باکو میں

تیل کی پیداوار کے مراکز بننے کے باوجود استعماری حکمت عملی تیار کرنے والوں کو خیال آیا فارس، عراق اور عربیہ میں پٹرولیم کی دولت چھپی ہوئی ہے۔ استعماریت پسندوں نے جنوب مغربی ایشیاء کو ایک دیو قامت شترنج کے بورڈ کے طور پر دیکھا، اور وہ نگرانوں کا کردار ادا کر رہے تھے۔ لندن میں بیٹھے تدبیر کنندگان کا مقصد اسلامی دنیا کے روشن خیالوں اور جدید مسلم اشرافیہ سے اپیل کرنے کے بجائے دنیا بھر کے مسلمانوں کے ایمان سے کھیلنا اور روایت پسند ذہن رکھنے والے عوام اور آمروں کو ساتھ ملانا تھا۔ برطانیہ کو مشرق وسطیٰ سے فرانس کو باہر نکالنے کے وقت تین طاقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے لیے ایک پریشانی شمال سے مسلسل نیچے اترتے ہوئے روسی تھے۔ دوسری پریشانی جرمن بنے، جن کی عالمی طاقت قیصر کی زیر قیادت وسعت پا رہی تھی اور وہ ترکی کے ساتھ مضبوط بندھن باندھتے ہوئے برلن سے بغداد تک ایک ریلوے لائن بچھانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ تیسری طاقت ترک تھے جن کی سلطنت کی قوت حیات انحطاط پذیر تھی، مگر وہ اب بھی کچھ دم خم رکھتے تھے۔ یعنی استنبول میں خلافت کی موجودگی اگرچہ برائے نام تھی لیکن دنیا بھر کے راسخ العقیدہ سنی مسلمان اس سے اپنے تعلق کا دعویٰ ضرور کرتے تھے۔

اس وقت برصغیر پر برطانیہ کی گرفت مضبوط تھی اور لارڈ کرومر کی مدد سے انہوں نے مصر اور نہر سویز کو ہندوستان تک اپنی شہ رگ کے طور پر قبضے میں لے رکھا تھا۔ وہ افغانستان اور فارس میں بھی غالب اثر رکھتے تھے۔ قبرص سے لے کر مشرقی افریقہ اور عدن تک ان کی اہم اور قیمتی املاک موجود تھیں جن کو خلیج فارس میں اقتدار کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ عراق اور موجودہ سعودی عرب پر کنٹرول کے لیے اور انہیں وسیع و عریض صحرائی علاقے میں ترکی کو قابو کرنے کے لیے ایک طاقت کی ضرورت تھی۔ یہ 'کارنامہ' سرانجام دینے میں پہلا مرحلہ، سعودی عربیہ کے مستقبل کے بادشاہ السعود اور طویل عرصے سے جاری وہابی اسلامی تحریک کے ساتھ تاج برطانیہ کا ایک اتحاد قائم کرنا تھا۔ اس اتحاد کے عمل کو سمجھنے کے لیے وہابی خاندان کے سربراہ عبدلوہاب اور مستقبل کے شاہی خاندان السعود کے اٹھارویں صدی میں ہوئے پہلے اتحاد کا جائزہ لینا پڑے گا۔

## السعود کی حکومت کا مختصر پس منظر

18ویں صدی کے وسط میں ایک متقی مسلمان مبلغ نے جزیرہ نما عرب کی شمالی سرحدوں اور زرخیز ہلال میں ادھر ادھر آنا جانا شروع کیا۔ اس نے مکہ، مدینہ، بصرہ کے مشرق کی طرف بغداد اور دمشق تک کئی چکر لگائے۔ محمد ابن عبدالوہاب (پیدائش 1703) نے بدعات، جو مسلمانوں میں رچ بس چکی تھیں، کے خلاف آواز بلند کی۔ پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد ان کی آواز پر لبیک کہہ کر منحرفین کو بارود اور آگ سے تباہ و برباد کرنے میں جت گئے۔ عبدالوہاب کے پیروکاروں میں السعود خاندان بھی شامل تھا۔ اٹھارویں صدی میں محمد ابن سعود نے اسلام کے نام پر کئی علاقے فتح کیے۔

عبدالوہاب کو الشیخ (استاد) کہا گیا اور تب کے بعد اس کی اولادیں بھی الشیخ کہلائیں۔ السعود اور الشیخ خاندانوں کے درمیان ترقی کرتے ہوئے اتحاد نے 1920 کی دہائی میں سعودی عرب کی بنیاد رکھی۔ اپنے قبیلے کے نام پر تشکیل دی گئی ریاست کے قیام کے دوران السعود خاندان کے پہلے سعودی فرماں روا عبدالعزیز نے اختلاف کرنے والوں کی گردنیں جسم سے الگ کر دیں، اس قتل و غارت میں ساتھ دینے والوں کو جنگ کے آخر میں قید میں ڈال دیا گیا جو 1980 کی دہائی تک قید خانوں میں ہی مر گئے۔ 18ویں صدی سے 1920 تک السعود خاندان نے بار بار ریاستیں قائم کیں جنہیں عدم تشدد کے قائل لچکدار عقیدے کے حامل دنیادار مسلمانوں اور کم کٹر عثمانیوں یا مصر میں ان کے حلیفوں نے، یا پھر مخالف عرب قبائل نے تاراج کر دیا۔ برصغیر میں وہابی اہل حدیثوں کو کہا جاتا ہے جسے ایک توہین آمیز اصطلاح سمجھا جاتا ہے۔ عقیدے پر بحث کی یہ جگہ نہیں اور نہ ہی ہمارے موضوع کا یہ حصہ ہے۔

## برطانیہ کی سرپرستی، السعود اور سعودی عرب کا قیام

السعود کے انگلینڈ کے ساتھ تعلقات انیسویں صدی کے وسط میں بنے، جب ایک برطانوی کرنل نے ریاض میں السعود گھرانے سے رابطہ کیا۔ حمید الگر بتاتا ہے کہ پہلا رابطہ 1865 میں ہوا اور برطانوی مالیاتی رعاتیں سعودی خاندان کے خزانے کو بھرنے لگیں۔ پہلی

جنگ عظیم تک اس خزانے میں اضافہ ہوتا گیا۔ 1899 میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے کویت کا پروٹیکوریٹ بنوایا اور السعود کے ساتھ لندن کے تعلقات میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ (یاد رہے کہ السعود قبیلے کا آبائی علاقہ کویت ہے) عرب کو فتح کرنے کے لیے السعود کو کویت میں ایک اڈا بنانے کی دعوت دی گئی۔ اس کے تین سال بعد السعود نے پورے جزیرہ نما عرب پر کنٹرول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اس وقت السعود کی عمر 20 سال تھی جب امیر کویت نے اسے عثمانیوں کے حامی راشدیوں سے ریاض شہر واپس لینے کے لیے بھیجا۔ 1902 میں جب ریاض ابن سعود کے قبضے میں آ گیا تو اس نے ''اخوان'' کے نام سے جارحیت پسندوں پر مشتمل ایک تنظیم بھی قائم کر لی۔ ابن سعود نے ان قبائلی جنگجوؤں میں 'خالص' اسلامی روح پھونکی اور انہیں جنگ میں لگا دیا۔ 1912 میں اخوان کی تعداد 11000 ہو گئی اور ابن سعود وسطی عربیہ اور نجد اور مشرق میں الحسا دونوں کا مختار بن چکا تھا۔

1899 اور پہلی جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں مشرق وسطیٰ مین تیل کی افواہیں حقیقت بن چکی تھیں۔ تیل نکالنے والوں نے توپ بردار بحری جہازوں کی مدد سے کمزور باجگوار ریاستوں اور زیر حراست قبائلی رہنماؤں پر زبردستی لاگو کیے گئے یک طرفہ استعماری معاہدوں پر دستخط کرائے گئے۔ خلیج فارس اور عربیہ کو برطانیہ نے سویز سے ہندوستان جانے والی زنجیر کی ایک کڑی کے طور پر دیکھا۔ ان دو مقامات کو ایسے اڈوں کے طور پر بھی دیکھا جانے لگا جہاں سے برطانیہ جنوب فارس، عراق، اور خلیج میں اپنے تیل کو تحفظ دے سکتا تھا۔ کویت مین ولیم شیکسپیئر نامی برطانوی افسر کو پولیٹیکل ایجنٹ نامزد کیا گیا جس نے انگلینڈ و عربیہ کے درمیان 1915 میں ایک معاہدہ کرایا۔ بعد ازاں وہ الراشد قبیلے کے خلاف ابن سعود کے لیے لڑتا ہوا مارا گیا۔ 1914 میں جنگ چھڑنے پر برطانیہ نے ترکی کو عربیہ سے باہر نکالنے کا ایک بہترین موقع خیال کیا۔ سلطنت عثمانیہ کے ڈگمگانے پر دو برطانوی ٹیموں نے دو الگ الگ اور مخالف عربیائی جزیرہ نما کی صحرائی وسعتوں میں عرب کھلاڑیوں کی پشت پناہی کی۔

پہلی ٹیم کی قیادت ہیری سینٹ جان بریجر فلبی نامی برطانوی جاسوس کر رہا تھا جس نے ای جی براؤن سے مذہبی عقیدے کی سیاسی افادیت پر کافی اچھی تعلیم حاصل کی تھی جو انگلینڈ کے مؤقر سکولوں کی پیداوار تھا۔ ان اداروں میں ایک کیمبرج بھی تھا جو بیسویں صدی کے

سلطنت کے معماروں کے لیے ایک تربیت گاہ تھا۔ فلبی نے ایک ملحد ہونے کے باوجود سیاست پر مذہب کے اثر کی زبردست افزودگی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے مذہبی عقیدے کو "تمام دساتیر میں سے عظیم ترین" قرار دیا جو "تمام مخالفت کی زبردست مدافعت رکھتا ہے"۔ کیمبرج میں اس نے فلسفہ، مشرقی زبانوں اور ہندوستانی قانون کا مطالعہ کیا اور پھر انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ فلبی جس نے بعدازاں محض دکھاوے کے لیے اسلام قبول کیا اور عبداللہ نام منتخب کیا، براؤن کے پڑھائے ہوئے تمام اسباق فلبی کی بغل میں تھے جب وہ ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان میں ایک معمولی اہلکار کے طور پر زندگی کی ابتدا کرنے والا یہ مرتد عربیہ جا کر ابن سعود کے ساتھ برطانوی کوارڈینیٹر کے طور پر کام کرنے لگا جس نے بعد میں شیکسپیئر کی جگہ لی۔ اس سے قبل ٹی ای لارنس بھی عرب میں اپنی "ڈیوٹی" پر موجود تھا جسے قاہرہ میں قائم برطانوی آفس کی حمایت حاصل تھی۔ مختصر یہ کہ برطانوی ہاشمیوں، جو اپنے خاندان کو حضرت محمد ﷺ کی براہ راست اولاد کہلواتے تھے کی بجائے ابن سعود کو نسبتاً زیادہ وفادار سمجھتے تھے۔ عرب میں دو حریف ہاشمی اور السعود خاندان حکمرانی کے لیے برطانیہ کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے اور صحرا کی گرم ریت عربوں کے گرم خون سے سرخ ہو رہی تھی۔

1917 جنوری سے ابن سعود کو 5000 پونڈ ماہانہ دیے جانے لگے۔ 1919 میں فلبی نے ابن سعود کے بیٹے مستقبل کے شاہ فیصل کو لندن لے جا کر اپنے استاد بوڑھے ای جی براؤن کو ملوایا۔ فلبی کے سوانح نگار نے لکھا کہ "1920 کے عشرے میں عربیہ میں فلبی کے پسندیدہ السعود نے 4,00,000 افراد کو قتل اور زخمی کیا، 40,000 کو موت کی سزائیں دیں اور اسلامی شریعت کے تحت 3,50,000 مثلہ کرنے کے احکامات جاری کیے۔ السعود کے لیے اخوان کے فتح کردہ عربیہ نے برطانیہ کو بحر عرب سے ہندوستان تک باج گذار ریاستوں اور نوآبادیوں کے ایک متوتر سلسلے کا مالک بنا دیا۔

## خلافت عثمانیہ کا خاتمہ اور السعود کی قطعی فتح

اخوان اور وہابیوں کے ساتھ اتحاد کے نشے میں مست ابن سعود نے نئی سلطنت کے نظام حکومت اور اپنے اسلامی نظریے کی شناخت کی پرواہ کیے بغیر اسے حالات کے رحم و کرم پر

چھوڑ دیا۔ایک زیرک برطانوی افسر پرسی کاکس لکھتا ہے کہ ''1915 کے آخر یا1916 کے ابتدا میں ابن سعود کو پتہ چلا کہ اخوان ازم نجد کے معاملات پر قطعی کنٹرول حاصل کر رہا تھا۔اس نے دیکھا کہ اسے دو فیصلوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ایک دنیاوی حکمران بننا اور اخوان ازم کو کچل ڈالنا، یا نئے وہابی ازم کا روحانی قائد بننا۔۔۔انجام کار وہ اس کے عقائد قبول کرنے اور اس کا رہنماء بننے پر مجبور ہوا، یا خود بھی یہی چاہتا تھا''۔

پہلی جنگ عظیم کی خاک بیٹھنے اور مشرق وسطیٰ کی ریاستوں کی سرحدیں طے کرنے والی مختلف استعماری کانفرنسوں کے بعد سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔لرزہ براندام عثمانی ایک ایسی خلافت چلا رہے تھے جو دنیا بھر کے مسلمانوں پر برائے نام غلبہ رکھتی تھی، عثمانی تمام اطراف سے محصور ہو گئے تھے اور برطانیہ نے اسلامی وفاداروں کو ترکوں کے خلاف استعمال کیا۔یہ پالیسی لندن کی مشرق وسطیٰ ٹیم نے تیار کی تھی جس کا بے ایمان سربراہ مارک سائکس تھا۔ اسی آڑ میں یہودیوں سے فلسطین کا وعدہ کیا گیا۔برطانیہ کو خطے میں مطلق بالادستی حاصل ہوئی۔فلبی کے مطابق 1920 کے عشرے میں ابن سعود کے اخوان کی تعداد 50,000 سے زیادہ تھی۔مغرب کی طرف حجاز میں اب بھی ہاشمی حکومت کر رہے تھے لیکن ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔1924 میں نئی ترک حکومت نے جدیدیت پسند مصطفیٰ کمال اتاترک کی زیر قیادت ریاست کے مذہب اسلام کو مسترد کیا اور خلافت کے خاتمے کا اعلان کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں کو حیران کر دیا۔برطانیہ کے حمایت یافتہ شریف مکہ نے اتاترک کے اقدام سے فائدہ اٹھانا چاہا۔شائد ٹی ای لارنس کے عظیم منصوبے کو ذہن میں رکھتے ہوئے حسین نے خلیفہ بننے کا اعلان کیا لیکن اس کی کسی نے بات نہ سنی۔تب تک برطانیہ حسین سے ہاتھ کھینچ چکا تھا۔اور اس نے ابن سعود یا ایک اور ابھرتے ہوئے کٹر مسلمان حج امین الحسینی کا ساتھ دینے کی راہ منتخب کر لی تھی۔منرو لکھتا ہے کہ ''اسلامی دنیا میں بے یقینی کے دوران ایک دفعہ شام سے واپس آتے ہوئے فلبی نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ عربیہ میں حسین کی طاقت حجاز تک محدود تھی، اور عرب میں ابن سعود کے سامنے خلافت کے بارے میں اس کا رویہ بے معنی تھا''۔کچھ ہی عرصہ بعد ابن سعود کے لشکر نے حجاز پر چڑھائی کی اور ہاشمیوں کو عرب سے باہر نکال دیا۔سینکڑوں مرد عورتوں کو قتل کیا گیا اور عربیہ کو ریاض کے ماتحت کر لیا۔یوں جدید سعودی ریاست کا آغاز ہوا۔ہنوز

ابن سعود کا قریبی دوست فلبی ریاست کی تخلیق کے وقت وہاں موجود تھا۔ برطانیہ کی جانب سے سعودی ریاست کی تخلیق نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کو کام کرنے کے لیے ایک اڈا فراہم کر دیا۔ پہلے انگلینڈ اور پھر امریکہ کے لیے سعودی عرب تمام بیسویں صدی کے دوران استعماری عزائم کا لنگر بنا رہا۔

## امریکہ مشرق وسطیٰ میں

دوسری جنگ عظیم کے فوری بعد امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں آگے بڑھنے کے لیے اپنی حکمت عملی مرتب کرنے پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدا میں امریکہ کے لیے اس خطے کا تجربہ نہ ہونا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ امریکی ادارے بھی مشرق وسطیٰ کی سیاست، جغرافیہ اور مذہبی روایت پسندی سے لاعلم تھے۔ ان کی معلومات کا واحد ذریعہ دوسری جنگ عظیم کے وہ برطانوی ممنون ادارے اور افسران تھے جو گذشتہ چار دہائیوں سے مسلمانوں کا خون ان ہی کے ہاتھوں کروا کر خلافت عثمانیہ کی جگہ من پسند چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرنے میں معروف تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں سربراہانہ کردار ادا کرنے کے باوجود شمالی افریقہ اور خلیج فارس میں امریکی فوج نہ ہونے کے برابر تھی۔ 1947 میں وجود میں آنے والی نوزائیدہ اور ناتجربہ کار امریکی سی آئی اے 1950 تک برطانوی انٹیلی جنس کا دامن تھامے مشرق وسطیٰ کے بارے میں بنیادی معلومات جمع کرنے لگی۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کو برطانوی فتح میں تبدیل کرنے والے امریکہ کے لیے عرب کے خطہ خالی چھوڑنے کے لیے برطانیہ ہرگز تیار نہ تھا۔ اگرچہ مصر، عراق اور ایران برائے نام خود مختار اور برطانوی رعیت تھے، فلسطین اور اردن بھی اس کے مینڈیٹ تھے۔ کویت، خلیجی جاگیریں، ہندوستان برطانوی نوآبادیات تھے۔ لیکن مشرق وسطیٰ میں تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے امریکی کردار کے سامنے برطانیہ کی اس خطے میں موجود تیل پر گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

## متحد ہو کر لوٹنے کی پالیسی کا آغاز

امریکہ نے اپنے پیشرو برطانیہ کی پیروی کرتے ہوئے جب دنیا کے وسائل

(خصوصاً تیل کی دولت سے مالا مال علاقوں) پر قبضہ کرنے کے لیے اقدامات شروع کیے تو اس کا آغاز سعودی عرب سے کیا گیا۔ مستند حوالوں کے مطابق، مشرق وسطیٰ میں سرکاری سطح پر پہلی مرتبہ امریکی آمد کا سال 1945 بتایا جاتا ہے جب نہر سویز کے آر پار ایک کشتی لنگر انداز ہوئی۔ اس کشتی میں اس وقت کے امریکی صدر فرینکلن ڈیلا روز ویلٹ جو yalta سے بحری سفر کے ذریعے واپس واشنگٹن جا رہے تھے۔ فرینکلن کی ملاقات سعودی شاہ عبدالعزیز ابن سعود سے ہوئی۔ یہ کسی امریکی صدر اور سعودی بادشاہ کی پہلی ملاقات تھی جو آج تک (2014) قائم تعلقات کی بنیاد بنی۔ امریکی صدر نے یہ بھی اعلان کیا کہ ''سعودی عرب کا دفاع امریکہ کے لیے نہایت ضروری ہے''۔ لیکن ابن سعود اور روز ویلٹ ملاقات سے قبل دو واقعات ایسے رونما ہوئے جو اس سے قبل کے سعودی عرب میں امریکی مداخلت کا سراغ لگانے میں ممد ثابت ہوئے۔ 1933 میں سعودی عربیہ نے امریکہ کو تیل کی رعایت دینے کا ایک معاہدہ کیا جس نے آگے بڑھ کر 'عربین امریکن آئل کمپنی' کی صورت اختیار کی جس میں بروکر کا کردار برطانوی جاسوس فلبی نے ادا کیا جو 1920 میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کر چکا تھا۔ ملحد بہروپیا فلبی اسلام کو عقیدے کے بجائے ایک سہولت کے طور پر استعمال کرتا ہوا بالآخر سعودی عرب میں فورڈ موٹرز کا آفیشل نمائندہ بن گیا۔ ابن سعود سے اپنی دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ 'سٹینڈرڈ آئل آف کیلیفورنیا' کا ایجنٹ بھی بن گیا۔ امریکہ نے سعودی عرب کو 50,000 پونڈ یکمشت ادا کیے اور 5000 پونڈ سالانہ ادئیگی کے معاہدے کے عوض 60 برس کے لیے 3,60,000 مربع میل کا علاقہ بھی حاصل کر لیا۔ یوں سعودی بادشاہ نے ایک قلیل رقم کے عوض ملک کا قیمتی ترین خزانہ بیچ ڈالا تھا۔ اس طرح امریکہ کو وہاں پاؤں جمانے کا موقع بھی فراہم کر دیا گیا۔ روز ویلٹ کا سعودی عرب کو گلے لگانے کا مقصد واضح ہو چکا تھا کہ ایک طرف وہ سعودی عرب کے تیل کے پر قبضہ اور دوسری طرف خلیج فارس کو گھیرے میں لیکر سوویت یونین اور کیمونزم کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ اپنے حلیف برطانیہ کا بھی مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ برطانیہ کو خطے میں برتری حاصل تھی لیکن مشرق وسطیٰ میں تیل کے معاملے پر امریکہ کے ساتھ اس کی رقابت شروع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ فرانس اور اٹلی کے ساتھ بھی کچھ رنجشیں تھیں، چنانچہ سب حاسدانہ انداز میں اپنی اپنی

کمپنیوں کے مفادات کو تحفظ دے رہے تھے۔

کشتی پر ہوئی ملاقات سے چار سال قبل روز ویلٹ سعودی عرب کو برطانوی تحفظ میں دینے پر آمادہ تھا لیکن جب امریکی آئل کمپنیاں وجود میں آ گئیں تو ان کمپنیوں نے امریکی سیکرٹری داخلہ کے ذریعے روز ویلٹ کو برطانیہ کے سامنے ڈٹ جانے کا پیغام دیا۔ دونوں حلیفوں نے دوسری عالمی جنگ کے دوران مشرق وسطیٰ کے تیل پر ایک معاہدہ کیا۔ امریکی صدر روز ویلٹ نے برطانوی سفیر لارڈ ہالی فاکس سے کہا "فارس کا تیل تمہارا ہے، کویت اور عراق کے تیل میں ہم شریک ہیں اور سعودی عرب کا تیل بھی ہمارا ہوگا" روز ویلٹ نے لندن میں ونسٹن چرچل کو تار بھیجا کہ "ہم عراق اور ایران میں آپ کے آئل فیلڈز پر نظریں نہیں لگائے بیٹھے"۔ اس کے جواب میں چرچل نے بھی یقین دہانی کروائی کہ "سعودی عرب میں آپ کے تیل اور جائیدادوں میں مداخلت کا ہمارا ابھی کوئی ارادہ نہیں"۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد روز ویلٹ نے عبدالعزیز، جو کبھی عرب سے باہر نہیں گیا تھا، کو اپنے پاس بلوانے کے لیے یو ایس ایس murphy جہاز بھیجا۔ سعودی بادشاہ کے قافلے میں اس کے اہل خانہ، مصاحب، خادم اور گوشت کے لیے بھیڑیں بھی شامل تھیں جبکہ بادشاہ نے سونے کے لیے جہاز کے عرشے پر ہی ایک خیمہ لگایا۔ روز ویلٹ کے بیٹے ایلیٹ روز نے اس ملاقات کا حال یوں بیان کیا ہے "میری بہن اس روز والد سے اجازت لے کر قاہرہ کی سیر کرنے گئی کیوں کہ مسلمان خاندان کی عورتوں کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ والد نے ابن سعود سے وعدہ کیا کہ وہ عرب لوگوں کے خلاف کسی بھی امریکی اقدام کی منظوری نہیں دیں گے۔ اور قابل رشک نگاہوں سے والد کی وہیل چیئر کی طرف دیکھتا ہوا ابن سعود اس وقت حیران رہ گیا جب والد نے فوراً اسے وہ تحفے میں دیدی"۔ "امریکہ سعودی عرب کا دفاع کرے گا" کی پالیسی کی ہر امریکی صدر نے توثیق کی، اس کا سب سے زیادہ اعادہ 1957 اور 1980 کے دوران کیا گیا۔ دہران میں ایئر فورس کا ایک اڈہ قائم کیا گیا۔ اس کے بعد امریکہ و سعودیہ کے درمیان کئی ایک سول اور فوجی معاہدے کیے گئے۔ 1960 کی دہائی تک امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ ترکی، اردن، اسرائیل، ایران، عراق اور پاکستان سمیت کئی ممالک کو مختلف معاہدوں کے ساتھ مربوط کر دیا۔ ان میں سے ایک معاہدہ سیٹو تھا جس میں امریکہ شامل نہیں

تھا۔ تیل کے حصول کی دوڑ سے جنم لینے والی رقابتوں نے اپنا کام دکھایا تو 1958 میں بغداد میں بیٹھے برطانیہ کے تعینات کردہ شاہ کا تختہ الٹ دیا گیا اور ایک نئے معاہدے کی تشکیل کی گئی جسے سینٹو کا نام دیا گیا۔ اس کے تحت امریکہ، برطانیہ، ترکی، ایران اور پاکستان باہم مربوط ہو گئے۔ اس طرح پاکستان 'ساؤتھ ایسٹ ایشیاء ٹریٹی آرگنائزیشن (سینٹو) کے ذریعے بھی مغرب سے منسلک رہا۔ عراق میں فوجی قوم پرستوں اور کیمونسٹوں کو متحد کر کے نیا حکومتی بندوبست کیا گیا جس کے تناظر میں امریکہ نے 80 کے عشرے تک عربوں کو کیمونزم کے خلاف متحد کیا۔

کیمونزم کے خلاف مسلم ریاستوں کی صف بندی کی گئی۔ مذکورہ بالا حالات و واقعات کو اس باب میں اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ مغرب خصوصاً امریکہ کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے اور اس کا وسائل پر قبضہ کرنے کی پالیسی کو طوالت بخشنے کے لیے ان واقعات نے اہم کردار ادا کیا۔ 1945 کے بعد امریکہ نے اپنے دو اہم اور واضح جن دو دشمنوں کی نشاندہی کر لی تھی ان میں ایک مسلمان جن کی خلافت عثمانیہ کو اڑھائی عشرے پہلے ختم کیا گیا تھا اور دوسرا ایشیا اور مشرقی یورپ میں بڑھتا ہوا کیمونزم تھا جس کا مرکزی تحرک زمین کے ساتویں حصے پر قابض سوویت یونین تھا جس نے دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے خلاف اہم کردار ادا کیا تھا۔ برصغیر کے مسلمان چونکہ خلافت عثمانیہ اور اس کے بعد عرب دنیا سے عقیدت رکھتے تھے اس لیے مذکورہ بالا معاہدوں اور مسلم کش سامراجی اقدامات سے ان کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ سامراج نے دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جس کی تفصیل کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے۔

ہرمان ایلٹس لکھتا ہے کہ اسلام کو ماسکو کے خلاف لڑائی میں ایک حلیف تصور کرنا ''مبالغہ آرائی'' تھا۔ ہرمان نے 1940 میں ایران اور سعودیہ میں اپنی سروس شروع کی۔ ہرمان مزید کہتا ہے کہ ''بحرکیف ایک نقطہ نظر موجود تھا کہ اسلام اور کیمونزم ایک دوسرے کی ضد ہیں''۔ اس سے قبل بھی امریکی و ایشیائی دانشوروں کی ایک چھوٹی سی جماعت اسلام کو کیمونزم کے خلاف ایک بند تصور کرتی تھی۔ 1980 تک امریکہ نے اگرچہ اسلام کے ماسکو پر اثر انداز ہونے اور اس کے بعد ازاں اثرات پر تحقیق کر لی تھی جس میں ''تہذیبوں کے تصادم'' کی

اصطلاح کا موجد پرنسٹن میں پروفیسر برنارڈ لیوس پیش پیش تھا۔اس کی تحقیق سے اس موضوع پر گفتگو چھڑی جو یورپ اور امریکہ میں مذاکروں تک پہنچ گئی۔اسرائیل سے قریبی تعلق، جانبدار اور رجعت پسندانہ نکتہ نظر کے حامل متنازعہ برنارڈ لیوس کے 1953 کے ایک مضمون ''اسلام اور کیمونزم'' میں اس کے نظریات کو جنگ عظیم دوم پر مروج سوچ سے واضح کیا جا سکتا ہے۔اس کے مطابق، مسلم دنیا میں مطلق العنان حکومتوں کے قیام کی مغرب کی طرف سے حوصلہ شکنی نہ کرنا کیمونزم کے فروغ کو ہی دراصل روکنا تھا۔یعنی منقسم مشرق وسطیٰ یا مسلم دنیا کو کیمونزم کے خلاف مستقبل کا ایک ممکنہ بند تصور کیا گیا، اگر اہل اسلام نے کیمونزم یا پالیمنٹیرین ازم کے حق میں اپنی روایت ترک کر دی تو یہ مغرب کے لیے نقصان دہ ہوگا''۔

مطلق العنان مسلم حکومتوں کی ''خوش قسمت'' مشابہت کا حوالہ دیتے ہوئے لیوس نے رائے دی کہ 'واقعی اسلام مارکسی نظریات کے لیے زرخیز زمین ثابت نہیں ہوگا۔اس سے قبل پرنسٹن میں اس موضوع پر مذاکرے کا آغاز ہو چکا تھا جس میں مسلم دنیا سے کافی تعداد میں مسلم سیاست دانوں یا پھر دانشور کارکنوں کو بھی مدعو کیا گیا۔لیوس نے جب مذکورہ بالا مضمون لکھا تو اسی سال جو پرنسٹن میں مذاکرہ منعقد ہوا اس میں پاکستان سے ایک دانشور مظہر الدین صدیقی نے بھی شرکت کی جو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ تھے۔ہندوستان کے ایک مدرسے سے فارغ التحصیل صدیقی نے بھی اپنا نکتہ نظر پیش کیا۔صدیقی نے ''اسلام اور کیمونزم''، مارکسزم اور اسلام'' اور ''تاریخی مادیت اور اسلام'' لکھی۔پرنسٹن میں اپنے خطاب میں صدیقی نے واضح کیا کہ ''کیمونزم کا راستہ صرف تبھی روکا جا سکتا ہے جب اس کی مخالفت عقیدے اور اسلامی بنیادی اصولوں پر مبنی ہو''۔انہوں نے مسلم ''مطلق العنانیت'' پر بھی حملہ کیا۔مظہر الدین صدیقی نے اسلامی دنیا کے ''سیکولرازم پسندوں، نام نہاد سائنس دانوں اور نیم پختہ دانشوروں کے خلاف بھی بات کی جو خفیہ یا کھلے عام طور پر مذہب کے درجہ بدرجہ خاتمے کی حمایت کرتے'' اور کہتے ہیں کہ مذہب ''ایسے توہمات، کٹر اصولوں اور مافوق الفطرت عقائد کا مجموعہ ہے جو عقل کی طاقت کا بطلان کرتے ہیں۔'' کیمونسٹ نہیں بلکہ سیکولرسٹ استحکام پاکستان، اور نتیجتاً وسیع تر مشرق وسطیٰ کے لیے عظیم ترین خطرہ ہیں۔انہوں نے اس موضوع پر ایک طویل مقالہ پڑھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ 'کیمونسٹ الحاد پرستی اپنے اندر ایسی القائی قوت رکھتی ہے جو خالص

استدالیت کو حاصل نہیں۔ یہ سائنس کے ساتھ ساتھ ایک عقیدہ بھی ہے، ایک مابعد الطبیعیاتی نظام کے ساتھ ساتھ ایک سماجی انجیل بھی۔ یہ مذہبی عقیدے کا واحد حقیقی متبادل ہے جس کی مدد سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے چیمپئن پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنا چاہتے ہیں۔' آخر میں ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے استحکام کو اصل خطرہ کیمونزم کے بجائے ان لوگوں سے ہے جو اسلام کے عمیق پہلوؤں کی آگہی کے بغیر مسلمانوں کی زندگیوں میں ایک روحانی خلا پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں، یہ رجحان یقیناً کیمونزم کی طرف لے جائے گا۔

اس کے بعد کیمونزم کے خلاف مغرب میں تشہیری مہم شروع کی گئی۔ ایسے کارٹون، ٹی وی اور تھیٹر ڈرامے شروع کیے گئے جن میں سوویت یونین اور کیمونزم کو سور سے تشبیہ دی گئی جس سے مسلمانوں کو کراہت کی حد تک نفرت ہے۔ پھر 1970 کی دہائی آئی جب چین سے امریکی تعلقات کا آغاز ہوا اور 1970 کی دہائی کے آخر تک سی آئی اے سوویت یونین کو افغانستان کے خلاف جارحیت پر اکسانے میں کامیاب ہوگئی۔ پھر کیا ہوا، پوری دنیا سے عسائیت اور اسلام پسند روس کے خلاف متحد ہوئے اور ایک عشرے کے اندر اندر دنیا میں امریکی بالادستی اور سرمایہ درانہ ظلم و ستم کی راہ ہموار ہوگئی۔ سوویت یونین کو روس بنانے اور کیمونزم کو شکست دینے کے بعد امریکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا گیا جو کئی مسلم ریاستوں میں بربادی کے بعد اپنی پسند کی حکومتوں کے قیام پر منتج ہوا۔

## یورپ، امریکہ، اسرائیل کا مسلم دنیا سے رویہ اور پاکستان

1980 کی دہائی سے لے کر 2001 تک پاکستان کی خارجہ پالیسی کی حکمت عملی میں افغانستان کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ پاکستان نے 1979 سے 1989 کے عشرے میں سوویت یونین کے خلاف امریکہ کے ساتھ مل کر مشترکہ کوششیں کیا۔ لیکن بعدازاں پاکستان کو امریکہ نے نظرانداز ہی نہ کیا بلکہ اس پر اقتصادی پابندیاں بھی لگا دیں۔ ایک مختصر واقعہ جو پاکستانی حکمرانوں کے بارے امریکی حکام کے ارادوں کی غمازی کرتا ہے یہ ہے کہ ستمبر 1983 کو افغان جنگ عروج پر تھی اور پاکستان فرنٹ لائن ریاست شمار ہوتا تھا۔ امریکی ڈیفنس سیکرٹری کاسپر دین برگر پاکستان کے دورے پر آرہا تھا، اس کے ساتھ کچھ امریکی صحافی بھی

جہاز میں سوار تھے، پاکستان میں ان دنوں ضیاالحق کے خلاف ایم آر ڈی کی تحریک زوروں پر تھی خصوصاً سندھ میں حالات کافی خراب تھے۔ امریکی ڈیفنس سیکرٹری سے جہاز میں جب پوچھا گیا کہ 'ایم آر ڈی کی تحریک کے ردعمل کے طور پر امریکہ کی ترجیح کیا ہوگی؟ وین نے جواب دیا ''اس صورت میں ہمیں ضیاالحق کا متبادل تلاش کرنا ناگزیر ہوگا'' یہی ضیاالحق جنہوں نے افغان جنگ میں ناقابل یقین کردار ادا کیا تھا۔ امریکہ نے افغانستان کے سلسلے میں ہر بات کو فراموش کر دیا۔ لیکن ان مجاہدین راہنماؤں سے رابطہ جاری رکھا جو پاکستان کے خلاف خیالات رکھتے ہیں۔ پاکستان نے 1990 کی دہائی میں افغان حکمت عملی خود مرتب کی جو بری طرح ناکام ہوئی۔ اس دہائی میں ہی طالبان کو پاکستانی مددگاروں کے ذریعے افغانستان پر قابض کیا گیا۔ اس دوران پاکستان نے اپنے قریبی ساتھیوں کو فراموش کر دیا۔ اس کے تباہ کن اثرات برآمد ہوئے۔ حتیٰ کہ پاکستان طالبان کے خلاف ہراول دستہ (فرنٹ لائن اتحادی) بننے پر مجبور ہوگیا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ نے اپنی پالیساں تبدیل کر دیں تاکہ افغانستان میں ایک اسلامی حکومت کے خاتمے کے لیے مزاحمت کو کم از کم درجے تک رکھا جا سکے۔

1970 میں مغربی جرمنی کے چانسلر ولی برائٹ نے اپنی ''آسٹ پولیٹک'' یعنی مشرق کے لیے پالیسی کا آغاز کیا جس کا مقصد مشرقی جرمنی کے لیے تعلقات کا دروازہ کھولنا تھا۔ یہ ایک اہم اقدام تھا اور امریکہ و یورپ کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے تھا۔ یہ سرد جنگ کا زمانہ تھا۔ واشنگٹن میں جرمن سیاستدان کو خاص پزیرائی نہ ملی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں مغرب اور مسلمانوں کے درمیان کیمونزم کے خلاف لڑنے کی حکمت عملی کے بنیادی خدوخال وضع کیے جا رہے تھے۔ بالکل ایسے ہی خطوط استوار کیے جا رہے تھے جیسے 2001 کے بعد القائدہ اور طالبان کے خلاف صف بندی کی گئی۔ مسلمانوں کے مسائل کے متعلق مغرب کی حساسیت کا جائزہ لینے کے لیے ذیل کے واقعات سے استعفادہ کیا جا سکتا ہے جو 2002 میں رونما ہوئے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جارحیت کرنے کے لیے کن امور کو پس پشت ڈالا گیا اور کن کے ساتھ سمجھوتا کیا گیا۔

1- 5 اپریل 2002 کو لکسمبرگ میں یورپین یونین کے وزرائے خارجہ نے فیصلہ

کر کے خارجہ امور کے ماہر جادیر سوارنا کو مئی 2002 میں پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر پر کشیدگی کم کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ جنوبی ایشیاء کے متنازعہ امور کے سلسلے میں یورپ کے سفارتی حلقوں کا یہ پہلا اقدام تھا۔

2- 'انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون' نے 17 اپریل 2002 کو عوامی آرا پر مشتمل ایک سروے کے نتائج شائع کیے جن سے ظاہر ہوا کہ اسرائیل اور فلسطین کے تنازعے کے بارے میں یورپ اور امریکہ کے تصورات الگ الگ ہیں۔ فرانس، اٹلی، جرمنی اور برطانیہ کی عوامی اکثریت نے اسرائیل کے مقابلے میں فلسطین کی حمایت ظاہر کی۔ لیکن جنگ کے نرغے میں پھنسے ہوئے فلسطینیوں سے ہمدردی کے برعکس اسرائیل کے حق میں رائے دہندگان کی تعداد دوگنی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل امریکہ اس مسئلے پر فلسطینیوں کے حق میں اپنی پالیسی کا اعلان کر چکا تھا۔

3- بوسنیا کے مسلمانوں کے خلاف یورپ نے بہیمانہ جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ بوسنیا کے شہر سربرینکا میں 7000 مردوں اور بچوں کے قتل کی تحقیقی رپورٹ جولائی 1995 سامنے آئی تو 16 اپریل 2002 کو ڈچ حکومت نے استعفیٰ دیدیا۔ یہ قتل وغارت عام سربوں نے اقوام متحدہ کی امن کی ذمہ دار ڈچ فوج کے سامنے کی تھی۔ اس کی مثال یورپ میں دوسری عالمی جنگ کے بعد نہیں ملتی۔ ڈچ حکومت کا استعفیٰ مسلم نسل کشی کا اعتراف تھا۔ اس کے باوجود مغرب نے مسلمانوں کے خلاف اپنی پالیسی ترک نہ کی۔ استعفیٰ اس لیے دلوایا گیا کہ افغانستان اور عراق پر حملے کے ردعمل سے بچا جا سکے۔

4- اس سے بھی کئی سال قبل 1982 میں بیروت کی جنگ میں صبرہ اور شتیلہ میں جنگی جرائم کے ارتکاب کا بیلجیئم کی عدالت نے فیصلہ دیا جس میں اسرائیل کے وزیراعظم ایریل شیرون کے خلاف عدالتی کارروائی کا حکم دیا گیا تھا۔ امریکہ نے اس پر عملدرآمد نہ ہونے دیا۔ یورپ، چین اور عرب کی کلیدی ریاستوں نے امریکہ کی ''دہشت گردی کیخلاف جنگ'' میں شراکت سے پہلوتہی سے کام لیا۔ کیونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسرائیل اپنے ''کھیل'' کو آگے بڑھا رہا ہے جو اسرائیل کے ایسے دشمنوں کے خلاف بھی کھیلا جانے لگا جن کے لیے امریکہ کا مخالف ہونا ضروری نہیں تھا۔ ایران، عراق اور فلسطین کا القائدہ، اسامہ بن لادن اور طالبان

سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا یہ محض اسرائیل کے مخالف ہونے کی وجہ سے امریکی ہٹ لسٹ پر آ گئے۔ اس واقعہ سے بھی امریکہ اسرائیل گٹھ جوڑ نظر آتا ہے 2002 میں اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی ٹاڈ لارسن نے جنین کے پناہ گزین کیمپ کے دورے میں اسرائیلی کی قاتلانہ غارت گری کا جو منظر دیکھا اسے ہولناک اور بہیمانہ قرار دیا۔ لیکن امریکی صدر بش نے اس کے باوجود 18 اپریل 2002 کو شیرون کو "امن کا آدمی" قرار دیا تھا۔

## عرب و فلسطین کے خلاف اسرائیل کی محاذ آرائی

ستمبر 2000 میں شیرون نے یروشلم میں مسجد اقصیٰ کا دورہ انتہائی اشتعال انگیز طریقے سے کیا جس پر فلسطین میں انتفاضہ ثانی کی تحریک رونما ہوئی، جس کے نتیجے میں 900 فلسطینی شہید ہوئے جبکہ 300 اسرائیلی ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد اسرائیل نے لبنان میں حزب اللہ کے خلاف مہم جنگی چلائی جس مین اسے کامیابی نہ ملی۔ یہ الگ بات ہے کہ عرب اور دیگر اسلامی دنیا کا کردار بھی زیادہ فعال نہیں رہا۔ مثلاً شہیدوں کے خاندانوں کی کفالت جیسے معاملات سے گریز کیا جانے لگا۔ اس سے قبل عربوں خصوصاً سعودی عرب دیگر مسلم ممالک کے مسائل میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتا رہا ہے۔ اکتوبر 1973 میں شاہ فیصل نے جنگ رمضان (ماہ رمضان میں انور سادات کے دور میں اسرائیل کیخلاف لڑی جانے والی مصر کی جنگ جس میں مصر کو کامیابی تو حاصل نہ ہوئی البتہ مسلم دنیا میں خصوصاً مشرق وسطیٰ میں ایک نیا جوش وجذبہ ضرور پیدا ہوا۔) میں اسرائیل کی مدد کرنے والے مغربی ممالک کے خلاف تیل کی پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ تیل پر پابندی نے امریکہ پر کاری ضرب لگائی تھی جس کے نتیجے میں ہنری کسنجر کی مشہور زمانہ دھمکی سامنے آئی اور فروری 1975 میں شاہ فیصل کو سنسنی خیز انداز میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر ہنری کسنجر نے کہا تھا "امریکی قومی تحفظ کے لیے تیل کی فراہمی ضروری تھی اور مستقبل میں اگر اس قسم کی پابندی عائد کی گئی تو امریکہ عرب کے تیل کے چشموں پر قبضہ کر لے گا"۔ یاد رہے کہ پاکستان نے رمضان جنگ میں اپنی ائرفورس بھیجی جو شام کی ایئرفورس کے ساتھ مل کر اسرائیل کے خلاف لڑی تھی۔ (کہا جاتا ہے کہ 1980 میں پاکستان اور اسرائیل کے درمیان جو خفیہ رابطے تھے اس نے سوویت یونین کے خلاف افغان مجاہدین کی امداد کی تھی)

1973 میں ہوئی مذکورہ جنگ میں 19000 عرب اور فلسطینی شہید ہوئے جبکہ 2688 اسرائیلی ہلاک ہوئے۔ اسی طرح 1982 میں لبنان و اسرائیل جنگ میں 20,825 مسلمان شہید اور 30,000 زخمی ہوئے جبکہ 1,216 یہودی ہلاک اور 2,383 زخمی ہوئے۔ ان دو عرب و اسرائیل جنگوں کے علاوہ اگر 1920 سے 2009 تک کے اسرائیل و عرب جنگوں میں اور فلسطین و اسرائیل تنازعے میں فریقین کی اموات کا جائزہ لیا جائے تو اس کی تفصیل کچھ یوں سامنے آتی ہے۔ معلوم اعداد و شمار کے مطابق فلسطین کی جنگ آزادی اور عرب و اسرائیل جنگوں میں عرب و فلسطین کے شہداء کی تعداد 90,785 اور اس دوران زخمی ہونے والے 67,602 ہیں، لیکن یہ یہ تعداد بہت کم ظاہر کی گئی ہے۔ اس عرصے میں 24,845 یہودی ہلاک اور 35,356 زخمی ہوئے۔ 1948 سے 2013 تک فلسطینیوں کی کارروائیوں سے 3,724 اسرائیلی ہلاک ہوئے۔ اسرائیل جسے امریکہ اور کچھ یورپی و ایشیائی ممالک کی حمایت حاصل ہے گذشتہ ایک صدی سے فلسطینی مسلمانوں کی نسل کشی کر رہا ہے۔

## افغانستان پر سوویت یونین کی یلغار

1979 میں افغانستان کے ہمسائے ملک ایران میں تبدیلی کے باعث ایک مذہبی ریاست وجود میں آچکی تھی جبکہ پاکستان میں بھی ایک جمہوری حکمران کو تخت سے اتار کر تختے پر چڑھایا جا چکا تھا اور مارشل لاء لگانے والی فوج اپنے پاؤں جما چکی تھی۔ اس دوران روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں اور کابل پر قابض ہونے کے بعد ملک کے دیگر حصوں میں پھیل گئیں۔ سوویت یونین اس سے قبل اپنے 5000 فوجی اور سویلین اہلکار افغانستان بھیج چکا تھا۔ افغانستان میں داخلی شورش 1970 سے جاری تھی جس میں کئی افغانی سربراہوں کو قتل کیا گیا اور کئی ایک کو اقتدار سے بھی محروم ہونا پڑا۔ افغانی صدر داؤد کے 27 اپریل 1978 میں قتل کے بعد اور اس سے پہلے 17 اپریل کو سوویت یونین کی حمایت یافتہ خلق پارٹی کے ایک اہم راہنما اکبر علی خیبر کے قتل سے افغانستان میں ہنگامے شروع ہوئے جو حکومت پر قبضے پر ختم ہوئے۔ امریکہ جو اس صورتحال پر نظر رکھے ہوئے تھا، نے 50 ممالک جن میں اکثریت مسلم ممالک کی تھی کی مدد سے 1980 میں افغانستان میں روس کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی

میں 104 ممالک نے امریکی قرارداد، جس میں روسی فوجوں کے افغانستان سے نکلنے کا کہا گیا تھا، کے حق میں جبکہ 20 ممالک نے مخالفت میں ووٹ دیے۔ اس تمام جنگ کا مختصر احوال کسی دوسری جگہ کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ پہلے سوویت یونین اور پھر مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے لیے امریکہ اور یورپ نے اپنی پالیسی کیسے تبدیل کی اور اس کے مسلمانوں اور پاکستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ ایک موقف یہ بھی سامنے آچکا ہے کہ امریکہ کو روسی جارحیت کا پہلے سے علم تھا۔ اس دعویٰ کو ''تہران میں سی آئی اے کی خفیہ فائلوں کے راز'' کے مضمون سے بھی تقویت ملتی ہے۔ سوائے بھارت کے دنیا کے کسی ملک نے بھی روسی جارحیت کو درست قرار نہ دیا تھا۔

یہ جنگ ایک طرف سرمایہ درانہ نظام اور کیمونزم کے درمیان تھی جس کی بنیادی وجہ عالمی منڈی کے ایک بہت بڑے حصے پر اشترکیت کا قبضہ تھا جہاں یورپین اور کثیر القومی کمپنیوں کی مصنوعات کی خرید وفروخت ممنوع تھی۔ یہ ایک طویل بحث ہے جس کی یہاں ضرورت نہیں۔ بحر کیف امریکہ نے کیمونزم کے خلاف شروع کیے ہوئے عالمی محاذ کو ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل کرتے ہوئے کمال ہنرمندی سے مجاہدین کے ساتھ ہولیا اور یورپ و مسلم دنیا کے لاکھوں مسلح افراد کو اس جنگ میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ افغانستان ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے خلاف جنگ کو جہاد قرار دینا عین اسلام ہے۔ ظاہر ہے اسلام کی انہی تعلیمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وقت افغان روس لڑائی کو جہا قرار دیا گیا جس میں تمام عالم اسلام سے مجاہدین نے شرکت کی۔ اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لینے میں حرج نہیں کہ اس جنگ کے تمام نقصانات پاکستان اور مسلمانوں کے حصے میں آئے جبکہ ثمرات امریکہ اور یورپ نے سمیٹے جن کو اپنی مصنوعات فروخت کرنے کے لیے ایک مارکیٹ مل گئی۔ اس کے علاوہ وسطی ایشیائی ریاستوں کے وسائل بھی براہ راست امریکہ کے تصرف میں آگئے۔ افغان جہاد کی وجہ بننے والی روسی جارحیت کے اختتام پر جو اندازے لگائے گئے ان کے مطابق سوویت یونین کو اس جنگ میں بھاری قیمت اٹھانا پڑی۔ روسی وزیر اعظم نکولائی ریزکوف کے مطابق ان کے ملک کو 70 بلین یو ایس ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ سوویت یونین ٹوٹ گیا اور اسلامی ریاستیں جو پہلے سوویت یونین کا حصہ تھیں مرکز سے الگ ہوگئیں۔

اس دس سالہ جہاد کے دوران مئی 1988 تک 13310 روسی فوجی مارے گئے، 35478 زخمی ہوئے، 400 کے قریب لاپتہ ہوئے۔ فوجی ساز و سامان کے نقصان کا اندازہ کچھ یوں لگایا گیا۔ اس دوران سوویت یونین کے 800 ٹینک، 1113 بکتر بند فوج بردار گاڑیاں، 7760 دوسری گاڑیاں، 888 توپیں، 1500 طیارے اور ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے۔

اسی طرح افغانستان حکومت نے تسلیم کیا کہ اس دس سالہ جہاد میں اس کے 2 لاکھ فوجی اور اتحادی مارے گئے، 81000 زخمی ہوئے، 52000 کلومیٹر پختہ سڑکیں، 355 پل، 5200 ٹرک تباہ و برباد ہوئے۔ 51 لاکھ مویشی ہلاک اور 14 لاکھ دوسرے ممالک میں چلے گئے۔ زرعی پیداوار میں 70 فیصد کمی واقع ہوئی۔ 30 لاکھ سے زائد مہاجرین پاکستان میں آئے جو روسی فوجوں کے بعد بھی یہاں رکے رہے۔ پاکستان نے امریکی یقین دہانیوں کے بعد دنیا بھر کے مسلمان نوجوانوں کو پاکستان اور افغانستان میں جنگ اور گوریلا کارروائیوں کی ٹریننگ دی۔ روس نے متعدد بار پاکستان کو افغانستان سے دور رہنے اور اس جنگ میں مداخلت کرنے پر دھمکیاں بھی دیں۔ پاکستان کی بری اور فضائی حدود کی ہزاروں مرتبہ خلاف ورزی کی گئی جس کے نتیجے میں تقریباً 2500 پاکستانی جاں بحق ہوئے۔ روسی فوجوں کے افغانستان سے انخلاء کے بعد ایک گروپ کی حتمی فتح تک، جسے پاکستانی فوج کی مدد حاصل تھی، جہادی رہنماؤں نے اگلے چار سال ایک دوسرے کے حامیوں کی لاشیں گرانے میں گزارے۔ اس ایک گروپ جس کی تشکیل اسلام آباد میں کی گئی کو طالبان کا نام دیا گیا۔ کابل پر انکے قبضے کے فوری بعد افغانستان میں ان کی حکومت کو پاکستان نے تسلیم کر لیا اور ملک کے باقی حصے پر ان کو قابض کرانے کے لیے مالی اور عسکری تگ و دو جاری رکھی۔ اس دوران مسلمان ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے جس میں مزار شریف کے مقام پر کئی سو پاکستانی قتل ہوئے۔ طالبان کے لشکروں میں لڑنے والوں میں ایک بڑی تعداد ان غیر ملکیوں کی تھی جو سوویت یونین کے خلاف لڑنے والوں پر مشتمل تھی اور وہ 1989 میں اپنے ملکوں کو واپس جانے کے بجائے افغانستان اور پاکستان کے فاٹا کے علاقوں میں سکونت پزیر تھی۔ ان مجاہدین میں سے کچھ کو عالمی جہاد نے اور کچھ کو ان کے اپنے ممالک نے ان کی شہریت منسوخ کر کے پاکستان اور افغانستان میں ٹھہرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ان میں عرب اور ازبک مجاہدین کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

انہوں نے یہاں مقامی لوگوں میں شادیاں کیں اور اڑھائی عشروں سے یہاں ہی قیام پذیر ہیں۔ آج یہ افغان طالبان اور تحریک طالبان پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں سے 2001 کے بعد سینکڑوں پاکستان سے گرفتار ہوئے جن کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

کیا افغانستان اور عراق پر حملوں کو پہلے سے تیار شدہ ایجنڈ اقرار دیا جا سکتا ہے؟۔

باب ووڈورڈ نے اپنی کتاب ''پلان آف اٹیک''۔ میں لکھا ہے کہ صدر بش نے افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے لیے 11 ستمبر 2001 سے ایک ہفتہ قبل کے میمو کے مطابق، 4 ستمبر 2001 کو نیشنل سیکورٹی پریزیڈینشیل ڈائریکٹو، کے مطابق صدر نے محکمہ دفاع سے کہا تھا کہ افغانستان میں طالبان کے اہداف کے خلاف ممکنہ فوجی کارروائیوں کا منصوبہ تیار کرے۔ اس حکم میں ''دہشت گردی'' کے ٹھکانے، قیادت کمانڈ اینڈ کنٹرول کمیونی کیشنز ٹریننگ اور لاجسٹک سہولیات بھی شامل تھیں۔ اسی طرح عراق کے خلاف حملے کے لیے صدر بش نے 21 نومبر 2001 کو ہی وزیر دفاع رمسفیلڈ کو عراق حملے کا منصوبہ تیار کرنے کی ہدایت کر دی تھی۔ عراق اور افغانستان دونوں جنگوں کے منصوبے پیشگی تیار کر لیے گئے تھے اور یہ غلط ہے کہ افغانستان پر حملے گیارہ ستمبر کے واقعہ کا ردعمل تھا یا عراق پر حملہ خطرناک ہتھیاروں کے لیے کیا گیا تھا۔ عراق پر ممکنہ امریکی حملے کے خلاف واشنگٹن میں اکتوبر 2002 میں ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا گیا جو 1967 کے اینٹی ویتنام احتجاج کے لاکھوں لوگوں کے مظاہرے کے بعد سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔

## 11 ستمبر 2001 کا واقعہ، افغان جنگ اور پاکستان

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ نے 6 عشروں سے اسلامی دنیا میں حکومتوں کی تبدیلی کی جس روایت کو جاری رکھا ہوا تھا اکتوبر 1999 میں پاکستان میں ایک منتخب حکومت کو ختم کر کے ایک جرنیل کو اقتدار دلوانا اسی پرانے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ افغانستان جہاں سات سالہ خانہ جنگی کے بعد ایک اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی، میں جب 1980 میں سوویت یونین کے خلاف جہاد شروع ہوا تھا تو بھی پاکستان پر ایک فوجی جرنیل کی حکومت تھی۔ دونوں آمروں نے امریکی تابعداری میں غیر متوقع کردار ادا کیا۔ ستمبر 2001 کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی

سے پہلے ہی امریکی صدر بش افغانستان میں طالبان کی حکومت کے خاتمے کی ہدایات اپنی فوج کو دے چکا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا واقعہ بھی خود ساختہ تھا۔ امریکہ نے اس سے قبل بھی 1998 میں افغانستان میں اسامہ بن لادن پر میزائل داغے تھے جس سے 11 پاکستانی جاں بحق ہوئے تھے لیکن اسامہ بچ گئے تھے۔ 9 ستمبر 2001 کو افغانستان کے اپوزیشن لیڈر اور شمالی اتحاد کے راہنما احمد شاہ مسعود کو صحافیوں کے روپ میں دو عرب باشندوں نے ایک بم دھماکے میں اڑا دیا تھا جس کا الزام اسامہ اور آئی ایس آئی پر لگایا گیا۔ لیکن 11 ستمبر 2001 کو امریکہ میں ہوائی جہازوں کے ہائی جیکنگ کے ذریعے جڑواں ٹاورز کی تباہی کے فوری بعد افغانستان پر امریکہ نے نیٹو افواج کی مدد سے حملہ کر کے طالبان کی حکومت کو ختم کر دیا اور ایک غیر معروف افغان حامد کرزئی کو افغانستان کی حکومت دیدی گئی۔ اس تیرہ سالہ جنگ میں پاکستان پر کیا اثرات پڑے نیز پاکستان نے اس میں کیا کردار ادا کیا؟ اس کا ذیل میں جائزہ لیا گیا ہے۔

11 ستمبر 2001 کی صبح اس وقت کے پاکستانی آئی ایس آئی کے چیف لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد واشنگٹن کے کیپٹل ہل میں امریکی سینٹ اور ہاؤس انٹیلی جنس کمیٹی کے چیرمین کانگرس کے رکن پورٹر گاس اور سینٹر بوب گراہم سے ناشتے پر ایک میٹنگ میں مصروف تھے۔ پاکستان کی ایمبسڈر ملیحہ لودھی اور سینٹر جان کیلی بھی وہاں موجود تھے۔ جونہی انہوں نے دہشت گردی کے حوالے سے (خصوصاً اسامہ بن لادن) گفتگو شروع کی، گراہم کے عملے نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر جہازوں کے ٹکرانے کی ان کو اطلاع دی۔ شرکاء نے میٹنگ جاری رکھی تا آنکہ ایک طیارہ کیپٹل ہل کے اوپر سے گذرا اور عمارت کو خالی کرنے کا حکم دیدیا گیا۔ جنرل محمود نے عجلت میں برخاست ہونے والی اس میٹنگ سے پہلے امریکی عوام کے لیے گہری ہمدردی کا اظہار کیا جو 4 ستمبر سے سی آئی اے کے سربراہ کی دعوت پر امریکہ کے دورے پر تھے۔ امریکی ائر پورٹس بند ہونے کی وجہ سے پاکستان واپس نہ آسکے۔ سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے درمیان 1980 سے قریبی تعلقات چلے آ رہے تھے اگرچہ اس دوران 1990 میں ایٹمی پروگرام کے حوالے سے پاکستان کو امریکہ کی طرف سے اقتصادی پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا اور اسلام آباد اور واشنگٹن کے تعلقات میں کئی بار سرد مہری بھی آئی تھی۔ جنرل محمود کا یہ دوسرا امریکی

دورہ تھا،اس سے قبل وہ اپریل2000 میں بھی ایک دورہ کر چکے تھے جس میں انہوں نے طالبان کے لیے امریکی امداد کی درخواست کی تھی جسے ٹھکرادیا گیا تھااور جنرل موصوف کو غصے اور تضحیک کے ملے جلے جذبات لے کر واپس آنا پڑا تھا۔ امریکہ کا خیال تھا کہ قدامت پسند طالبان کو پاکستان نے چھتری فراہم کر رکھی ہے جو اسامہ بن لادن اور دنیا کے ہزاروں عسکریت پسندوں کو پناہ دیے ہوئے ہیں۔ یہ بش انتظامیہ کے لیے ایک سنجیدہ مسئلہ تھا۔ پاکستانی فوج میں جنرل پرویز مشرف کے بعد جنرل محمود احمد طاقتور ترین جنرل تھے۔ وہ پنڈی میں 10th کور کے کمانڈر تھے اور 12 اکتوبر 1999 میں مشرف کو اقتدار میں لانے والے دو اہم جرنیلوں میں سے ایک تھے۔ انہی کے فوجی دستوں نے وزیر اعظم نواز شریف کو گرفتار کیا تھا۔ پرویز مشرف کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان کو اسی وفاداری کے انعام میں آئی ایس آئی کی سربراہی ملی تھی۔ عسکریت پسندوں سے ان کے رابطے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ان کے دور میں افغانستان میں طالبان اور کشمیر میں حریت پسندوں کو کافی تقویت ملی۔

جنرل محمود احمد کے دوسرے دورے کے دوران سی آئی اے، پینٹا گون اور قومی سلامتی کے شعبے کے افسران سے دہشت گردی پر ہونے والی گفتگو کے مرکزی نکات میں افغانستان سے باہر جانے والی انتہا پسندی اور دہشت گردی کو سب سے زیادہ زیر بحث لایا گیا۔ محمود احمد نے پاکستان کی طالبان پالیسی کا دفاع کرتے ہوئے امریکی سی آئی اے کے چیف جارج ٹینٹ کو طالبان کے سربراہ ملا عمر کے اوصاف گنوائے کہ وہ ایک متقی اور پرہیز گار شخص ہے جو تشدد پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اسی دن شمالی اتحاد کے سربراہ احمد شاہ مسعود جسے بھارت، ایران، روس اور امریکہ کی مدد حاصل تھی کی خودکش دھماکے میں موت کے واقعہ کے پیش نظر امریکی زمینی حقائق کی زبان میں بات کر رہے تھے جن کے سامنے جنرل محمود طالبان کا دفاع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ 11 ستمبر کو شام پانچ بجے پاکستانی سفارت خانے میں جنرل محمود ملیحہ لودھی کے ساتھ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے جڑواں ٹاورز پر ہوئے جہازوں کے حملے کی ٹیلی ویژن کوریج دیکھ رہے تھے کہ ان کو امریکی ڈپٹی سیکرٹری آف اسٹیٹ رچرڈ آرمیٹج کا فون آیا جس نے 12 ستمبر کو صبح 10 بجے ایک ہنگامی میٹنگ کی دعوت دی۔ جنرل محمود، ملیحہ لودھی اور ایمبیسی کا ایک افسر ضمیر اکرم اگلے دن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ پہنچے تو رچرڈ آرمیٹج نے کہا کہ ''ہم جاننا چاہتے

ہیں کہ آیا آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے خلاف ہیں"۔ پاکستانی جنرل نے دریافت کیا کہ "اس صورتحال میں اس کا ملک ان (امریکیوں) کے لیے کیا کر سکتا ہے"؟ آرمیٹج نے کہا "ہم پاکستان کی طرف سے مکمل سپورٹ اور تعاون چاہتے ہیں اور ہم کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں یہ کل آپ کو بتا دیا جائے گا"۔

جب جنرل محمود نے ایمبیسی پہنچ کر پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کو فون پر امریکی غم و غصے کے متعلق بتایا تو پرویز مشرف نے اس کو سنجیدگی سے نہ لیا کیونکہ وہ اس سے پہلے سیکرٹری آف اسٹیٹ کولن پاول کو فون پر پاکستان کے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرا چکے تھے۔ امریکہ میں جب 13 ستمبر کو آئی ایس آئی کے سربراہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ پہنچے تو آرمیٹج نے ایک کاغذ ان کے حوالے کیا جس پر لکھے ہوئے وہ سات مطالبات تھے جو امریکی حکومت پاکستان سے منوانا چاہتی تھی۔ جنرل محمود نے کاغذ پر سرسری نظر ڈالی اور اسے ملیحہ لودھی کے حوالے کر دیا۔ تاہم جنرل نے کہا "یہ تمام مطالبات ہمیں قبول ہیں"۔ آرمیٹج نے کہا کہ جنرل کیا تم ان مطالبات پر پرویز مشرف سے بات نہیں کرو گے؟ جنرل محمود نے جوب دیا کہ "میں ان کے ذہن کو اچھی طرح سمجھتا ہوں"۔ آرمیٹج نے کہا کہ 'اچھا پھر آپ لنگلے میں سی آئی اے چیف جارج ٹینٹ سے مل لیں جو آپ کا انتظار کر رہا ہے'۔ اسلام آباد میں امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین نے ان سات مطالبات پر مشتمل ایک کاغذ 13 ستمبر کو جنرل پرویز مشرف کے حوالے بھی کیا تھا جن کو امریکہ میں تسلیم کیا جا چکا تھا۔ وہ مطالبات مندرجہ ذیل تھے۔

1۔ پاکستانی سرحد پر القاعدہ کے تمام آپریشنز بند کیے جائیں اور بن لادن کی بحری اور بری راستوں سے آنے والی اسلحہ کی ترسیل روکی جائے۔

2۔ امریکی جہازوں کو پاکستان سے اڑنے اور لینڈ کرنے کی آزادی ہوگی۔

3۔ امریکہ کو پاکستان کے نیول، ائربیس اور سرحدوں تک رسائی دی جائے۔

4۔ انٹیلی جنس اور امیگریشن معلومات کا فوری تبادلہ۔

5۔ امریکہ، اسکے دوستوں اور اتحادیوں کے خلاف پائی جانے والی مقامی نفرت کو ختم کیا جائے۔

6۔ طالبان کو تیل کی فراہمی منقطع کی جائے اور پاکستان سے طالبان کی حمایت کے لیے

جانے والے رضا کاروں کو روکا جائے۔

7۔ پاکستان طالبان کے ساتھ ڈپلومیٹک تعلقات ختم کرے اور بن لادن اور القاعدہ نیٹ ورک توڑنے میں امریکہ کی مدد کرے۔

کہتے ہیں کہ جنرل محمود نے بڑے بوجھل دل سے امریکی مطالبات تسلیم کیے تھے۔ اگلے تین دن انہوں نے امریکی حکام سے جنگ میں پاکستانی کردار کے متعلق حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے گزارے اور 16 ستمبر کو پاکستان پہنچ گئے۔ اسی شام پرویز مشرف نے امریکی صدر کو دہشت گردی کے خلاف مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی کہ پاکستان اپنے تمام وسائل استعمال کرتے ہوئے یہ ہولناک کارروائی کرنے والوں کی تلاش اور سزا کے لیے اس کا ساتھ دے گا۔ صدر بش نے پرویز مشرف کے تعاون کے پیغام کا خیر مقدم کیا کیونکہ پاکستان کی حمایت بہت اہمیت کی حامل تھی جس کے پاس القاعدہ اور طالبان نیٹ ورک کے بارے میں وسیع معلومات تھیں۔ امریکہ کے نزدیک طالبان اور القاعدہ کے خلاف ایک سخت کارروائی کرنے کے لیے بھی پاکستان کی مدد انتہائی اہمیت کی حامل تھی کیونکہ پاکستان ان تین ممالک (دیگر دو سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات تھے) میں ایک تھا جنہوں نے طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا تھا جبکہ افغانستان میں ابھی جنگ جاری تھی۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ دشمن کا تشخص طیارے اغوا کرنے والے ان 19 افراد سے قائم کیا گیا جن کا تعلق عربوں سے تھا جبکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو اس سے منسلک کر دیا گیا اور ان کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

پاکستان طالبان کی حمایت سے دستبردار ہو کر امریکہ کے اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔ طالبان اور القاعدہ کے خلاف جنگ کو ''دہشت گردی کی عالمی جنگ'' قرار دیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ پاکستان نے طالبان پالیسی پر یوٹرن لے کر ایٹمی پالیسی اور کشمیر پالیسی کو محفوظ بنایا ہے۔ اس دوران پاکستان نے طالبان انتظامیہ سے رابطہ کیا اور اسامہ کی حوالگی کا مطابہ کیا جسے طالبان نے باہمی مشاورت سے مسترد کر دیا۔ امریکہ نے چند ہی دنوں میں نیٹو افواج کے ہمراہ افغانستان پر کارپٹنگ بمباری کر کے طالبان کا نیٹ ورک توڑ دیا۔ ابتدا میں طالبان کی طرف سے مزاحمت بہت کم دیکھنے میں آئی لیکن طالبان جلد ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور جوابی حملے شروع کر دیے جس سے اتحادی افواج کو کافی نقصان اٹھانا

پڑا۔ یہ جنگ گذشتہ 13 برسوں سے جاری ہے اور امریکہ نے تسلیم کیا ہے کہ افغانستان میں ان کا سخت مزاحمت کاروں سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔

امریکہ نے پاکستان میں کئی ائربیس استعمال کرنے شروع کر دیے اور پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان کی مغربی سرحد، پاک افغان سرحد کو بند کر دے تاکہ پاکستان سے افغانی طالبان کی مدد کے لیے آنے والوں کو روکا جا سکے اور افغانستان سے باہر کسی کو بھاگنے نہ دیا جائے۔ پاک افغان سرحد جسے ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے تقریباً 2220 کلومیٹر طویل ہے جس کو بند کرنا کافی مشکل تھا۔ پاکستان پر امریکہ کا دباؤ بڑھا کہ وہ پاکستان کے فاٹا کے علاقے میں چھپے (80 کی دہائی کے مجاہدین) عسکریت پسندوں کے خلاف بھی کارروائی کرے تاہم پاکستان نے اس مقصد کے لیے 80 ہزار فوج کو 2004 میں قبائلی علاقوں میں بھیج دیا جس سے قبائلیوں اور پاک فوج کے درمیان جنگ شروع ہو گئی جو آج تک جاری ہے۔ اس دوران القاعدہ اور مقامی عسکریت پسندون سے کئی ایک معاہدے ہوئے جن کو فریقین نے توڑ کر ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لیے ہیلی کاپٹروں، بھاری بھر توپ خانے اور خودکش حملوں کا استعمال کیا۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو پاک فوج اور عسکریت پسندوں کے درمیان لڑی جارہی تھی جبکہ پاکستان کے دیگر حصوں میں خفیہ ایجنسیوں کا آپریشن بھی جاری تھا۔ مذہبی و جہادی تنظیموں کے سینکڑوں کارکن پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیے گئے اور کروڑوں ڈالر کمائے گئے۔ 'pakistan center for peace and study' اور پرویز مشرف کی کتاب 'In the line of fire' کے مطابق پاکستان سے مقامی اور غیر ملکی عسکریت پسند کی 615 سے زائد تعداد امریکہ کے حوالے کی گئی۔ بعض واقعات میں گرفتاری کے دوران فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا۔ ایف بی آئی اور پاکستانی اداروں کے مشترکہ آپریشن کیے گئے۔ سینکڑوں لوگوں کو، ایجنسیوں نے ماورائے قانون کارروائیاں کرتے ہوئے، اٹھا کر غائب کر دیا جن کے لواحقین آج تک اپنے پیاروں کی تلاش میں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ پاکستان کی مذہبی، جہادی اور فرقہ ورانہ جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ سوائے جماعت الدعوہ کی لشکر طیبہ کے باقی تمام جہادی تنظیموں کو کالعدم قرار دیدیا گیا۔ جماعت الدعوہ کی قیادت کو دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔ پاکستان میں ان دنوں قانون اور آئین نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ پاکستان میں فوجی حکومت

کے خلاف فاٹا اور افغانستان میں ہونے والے آپریشنز کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا لیکن حکومت نے امریکی اطاعت کی اندھی تقلید میں کسی کی نہ سنی اور ملک کو مستقل خانہ جنگی میں دھکیل دیا گیا۔ افغانستان میں مسلمانوں کے خلاف لڑنے والوں میں عیسائی پیش پیش تھے۔ اسے افغان جنگ کہا گیا جبکہ اسی ملک میں ایک عشرہ قبل ہوئی جنگ کو جہاد کہہ کر مسلمانوں کی مدد حاصل کی گئی۔ اس سے قطع نظر کہ یہ جنگ ہے یا جہاد البتہ اس کے بعد مسلم دنیا میں ایک ایسی تبدیلی کا آغاز کیا گیا جس سے مسلم وحدت کا تصور پارہ پارہ ہو گیا اور تمام اسلامی تنظیمیں غیر فعال ہو گئیں۔ امت مسلمہ نے بھی بیداری کا ثبوت نہ دیا۔

## مراعات و نقصانات اور پاکستان پر پڑنے والے اثرات

1980 میں جب امریکہ اور پاکستان نے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جہاد کیا تھا تو امریکہ نے ابتدا میں ہی پاکستان کو مطلع کر دیا تھا کہ امریکہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد گردانتا ہے، (جس کو افغانستان کئی مواقع پر مسترد کر چکا تھا) امریکہ نے اس بات پر بھی مشروط رضامندی ظاہر کی کہ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام جاری رکھنے کے باوجود اس سے اقتصادی پابندیاں اٹھانے کے لیے تیار ہے، ستمبر 1981 میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے مطابق امریکہ پاکستان کو پانچ سالوں (1982 تا 1987) 3.2 بلین ڈالر کی فوجی و اقتصادی امداد دے گا۔ لیکن جمہوریت کی جگہ آمریت کی وجہ سے کچھ پابندیاں برقرار رہیں۔ اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ افغانستان میں مجاہدین کو دیا جانے والا اسلحہ اور فنڈز پاکستان کے ذریعے تقسیم کیے جائیں گے۔ اس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

28 مئی 1998 کو جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو اسی روز امریکن صدر بل کلنٹن نے پاکستان کے اس اقدام سے امریکی کانگرس کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں 1954 کے نیوکلیر ایکٹ کے تحت پاکستان پر متعدد پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں Forign Assistance Act کے تحت کی جانے والی تمام مالی امداد معطل کر دی گئی اور غیر ملکی فوجی امداد بھی روک دی گئی۔ قرضوں کے لیے دی گئی تمام امریکی ضمانتیں ختم کر دی گئیں۔ آئی ایم ایف

اور ورلڈ بنک کے علاوہ تمام امریکن بنک نے بھی اپنے قرضے روک لیے۔ 12/ 10 /
1999 کی شب جب نواز شریف کی جمہوری حکومت پر شب خون مارا گیا تو یہ خبر دنیا بھر کے
میڈیا نے نشر کی۔ اگلے دن امریکن قانون کے فارن آپریشن بل کا سیکشن 508 حرکت میں
آ گیا۔ اس قانون کے مطابق کسی بھی ایسے ملک سے براہ راست تعاون کی ممانعت ہے جہاں
منتخب حکومت کسی بغاوت یا فوجی اقدام کے تحت معزول کی گئی ہو۔ چنانچہ صدر بل کلنٹن نے
مذکورہ قانون کے تحت پاکستان پر مزید پابندیاں لگانے کا اعلان کر دیا۔ یہ پابندیاں صرف اسی
صورت میں اٹھائی جا سکتی ہیں جب امریکی صدر کانگرس کو بتائے کہ ملک ہذا میں جمہوری
حکومت کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔ مارچ 2000 میں امریکی صدر نے بھارت کا پانچ روزہ
دورہ کیا اور وہاں 10 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا بھی اعلان کیا۔ واپسی پر وہ پاکستان آئے اور
صرف 6 گھنٹے قیام کیا۔ وہ 31 سال میں پاکستانی عوام سے خطاب کرنے والے پہلے امریکی
صدر تھے۔

11 ستمبر 2001 کے واقعہ کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ جنوری 2001 میں جارج ڈبلیو
بش امریکہ کے 45ویں صدر کے طور پر اپنا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ انہوں نے 22 ستمبر
2001 کو صدارتی حکم نامہ، 2001/28 جاری کیا کہ "پاکستان اور بھارت پر عائد پابندیاں
امریکی مفادات کے خلاف ہیں"۔ 27 اکتوبر کو مزید ایک اعلان کے ذریعے جمہوریت کے
سلسلے میں عائد پابندیوں کو بھی ہٹا لیا گیا جنہیں دہشت گردی کی جنگ میں رکاوٹ کہا گیا۔
پاکستان کو سیکشن 508 سے مستثنیٰ قرار دیدیا گیا۔

غربت کے خاتمے کے لیے 5 بلین ڈالر کی آئی ایم ایف کی امداد، قرضوں میں ممکنہ
ریلیف، جاپان کی امداد، یورپی یونین کے وزارتی وفد کی تشریف آوری، امریکہ کی طرف سے
شکریے کے ٹیلی فون اور پاکستان کی تحسین بھی اس بارش میں شامل تھی۔ لیکن دوسرے ذرائع
کے مطابق 2001 میں پاکستان کو امریکہ نے 91 ملین ڈالر امداد دی جو 2002 میں بڑھ کر
1161 ملین تک پہنچ گئی۔ لیکن 2003 میں یہ کم ہو کر 522 ملین ڈالر تک آ گئی لیکن اسی سال
394 ملین ڈالر کا اضافہ کر دیا گیا۔ پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک نے امریکہ کو جنگ سے باز
رکھنے کے بجائے اپنے ہی لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا اور ڈالروں میں امداد لیتے رہے۔ پرویز

مشرف کی حکومت سمیت کئی ممالک نے 11 ستمبر کے واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھا جو ڈالروں وصول کرنے کے ساتھ ساتھ "ناپسند" عناصر سے گلو خلاصی کرا رہے تھے۔ پاکستان نے 2003 میں 58 ہزار افغانیوں کو مفت ویزے فراہم کیے۔ ان میں کئی ایسے لوگ بھی پاکستان میں در آئے جو کسی دوسرے ملک کے لیے کام کر رہے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ امریکی ادارے ایف بی آئی کو پاکستان میں کسی بھی شخص کو دہشت گرد کہہ کر گرفتار کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے بعد پاکستان میں دہشت گردی کا ایک ایسا عفریت داخل کر دیا گیا جس نے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ عوام اور فوج کو آپس میں لڑا دیا گیا، خود کش حملوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں جی ایچ کیو پر حملے ہوئے، ملک کی اعلیٰ شخصیات کو جان سے مار دیا گیا، اربوں ڈالر کا معاشی نقصان کیا گیا، پاکستان کا بیرون ملک ایک دہشت گرد ملک کا تعارف ہونے لگا، بھارت نے پاکستان کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کئی درجنوں عسکری گروپ معرض وجود میں آ گئے جن میں تحریک طالبان پاکستان قابل ذکر ہے۔ کئی ایک فرقہ وارانہ تنظیمیں ظہور میں آئیں جن کے کارکن افغانستان سے تربیت حاصل کر چکے تھے۔ سینکڑوں جہادی کارکن جو فارغ بیٹھے تھے فرقہ وارانہ کارروائیوں میں ملوث ہونے لگے۔

## پاکستان میں دہشت گردی اور فرقہ واریت کی لہر

پاکستان میں فرقہ واریت کی لہر 1980 کی دہائی کے وسط میں شروع ہوئی جس میں 1989 میں اس وقت شدت آئی جب پنجاب کے شہر جھنگ میں اس وقت کی 'انجمن سپاہ صحابہ' اور آج کی 'سپاہ صحابہ پاکستان' کے صدر حق نواز جھنگوی کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے آج تک دونوں فرقوں کے ہزاروں علماء اور ذاکرین باہمی قتل و غارت میں جاں بحق ہو چکے ہیں۔ فرقہ واریت کی اس جنگ میں 2001 سے پہلے فائرنگ کے لیے مقامی بندوق اور روسی کلاشنکوف کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن ستمبر 2001 کے بعد ایک ہی وار میں مخالفین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کا ٹارگٹ حاصل کرنے کے لیے خود کش حملوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے بعد فرقہ پرست عناصر نے خود کش حملوں میں سینکڑوں افراد کو موت کی نیند سلانا شروع کر دیا۔ حکومت اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اسے روکنے میں ناکام رہی۔ مختصراً یہ کہ

1989 سے 7 مارچ 2014 تک پاکستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے 2895 واقعات رونما ہوئے جن میں 4780 افراد جاں بحق جبکہ 9283 زخمی ہوئے۔ کچھ واقعات ایسے بھی رونما ہوئے جن میں ایک ہی وقت میں 100 سے زیادہ افراد جاں بحق ہوئے۔ آج کئی ایک گروپ غیر ملکی ایماء پر فرقہ واریت کو ہوا دے رہے ہیں۔ ان میں خلیجی ممالک پیش پیش رہے ہیں۔ تفصیلات کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔

## پاکستان میں دہشت گردی کی آمد

پاکستان کو آج جس دہشت گردی کا سامنا ہے اس کی باقاعدہ ابتدا 12 برس پہلے جولائی 2002 میں خیبر پختونخوا کے شہر کوہاٹ میں ہوئے ایک واقعہ سے ہوئی تھی۔ "پاکستان فرنٹ لائن" کے مصنف کے مطابق کوہاٹ کے قریب مصروف ہائی وے کے کنارے، پاکستانی فورسز کے ساتھ ایک جھڑپ میں القاعدہ کے مارے جانے والے چار جنگجوؤں کو، خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرنے والوں کا ان کی یاد میں تعمیر کی گئی عارضی قبر پر ہر روز ہجوم لگا رہتا تھا۔ مختلف رنگدار جھنڈیوں، کو پتھروں کے ڈھیر پر نصب ایک کھمبے کے ساتھ باندھا گیا تھا تا کہ اس جگہ کو نمایاں کیا جا سکے جہاں ان شہدا نے جان دی تھی۔ یہ ایک مقدس جگہ تھی جہاں شہدا کا خون گرا تھا۔ خون آلود پتھروں کے سامنے تعظیماً یا احتراماً جھکنا معمول بن چکا ہے۔ اس یادگار کے قریب پہنچ کر ٹرانسپورٹرز ان وفاداروں کے لیے دعائے خیر کرنے اور اس ٹیلے سے 'خاک' لینے کے لیے گاڑیاں آہستہ کر لیتے ہیں جسے احترام کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے مقدس سرزمین کہتے ہیں جن کا عقیدہ بن چکا ہے کہ ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کے گھروں پر اپنی رحمت برساتا رہتا ہے۔

یہ واقعہ جولائی 2002 کے پہلے ہفتے میں اس وقت پیش آیا جب موضع 'جرمہ' کی چیک پوسٹ پر پولیس نے ایک گاڑی کو روکا جس میں چار مسلح چیچن باشندے سوار تھے جو افغانستان سے بھاگے آ رہے تھے۔ یہ سوار کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھے۔ ان چیچنوں کے پاس مشین گنیں اور راکٹ لانچر تھے جنہوں نے ایک گھنٹے تک پولیس کا مقابلہ کیا اور آخر کار جام شہادت نوش کر گئے۔ بعد ازاں پولیس مقابلہ والی جگہ پر دیہاتیوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی

جن میں سے کچھ نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا جبکہ کچھ ان کے جسموں کے حصے اپنے گھروں کے صحنوں میں دفن کرنے کے لیے لے گئے۔ ان کا ایمان ہے کہ شہید کبھی نہیں مرتے اور گھروں میں ان کی موجودگی باعث رحمت ہوگی۔ ان کی نماز جنازہ میں پولیس کے کافی جوانوں اور سینکڑوں دیہاتیوں نے شرکت کی جوان کو مقدس جنگ جو قرار دیتے ہیں۔ لوگوں نے جنازے کے بعد کئی گھنٹوں تک ہائی وے کو بلاک رکھا اور اسامہ بن لادن کے حق اور امریکہ کے خلاف نعرے بلند کیے۔ پولیس اور مقامی لوگوں کے درمیان تصادم پھوٹ پڑا۔ اس جگہ کا نام 'شہدا چوک' رکھ دیا گیا جو جلد ہی حکومت مخالف احتجاج کا مرکز بن گیا۔ پاکستان کے اندر، خیبر پختونخوا میں ہونے والا یہ دوسرا واقعہ تھا جہاں مرنے والوں کی قبروں کو یادگار بنایا گیا تھا۔ اس سے پہلے کرم ایجنسی میں پاک افغان سرحد کے قریب بھی القاعدہ کے ہلاک ہونے والے کارکنوں کی قبروں کے مزار بنائے گئے تھے۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد جنگ پاکستان کی سرحدوں کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ تورہ بورہ (پشتو میں سیاہ راکھ کے ڈھیر یا پہاڑ کو تورہ بورہ کہا جاتا ہے، اسی مناسبت سے ان پہاڑوں کا نام تورہ بورہ ہے جہاں اسامہ بن لادن سمیت ہزاروں عرب مجاہدین رہتے تھے) پر امریکی 52بی اور دیگر جنگی طیاروں سے ہوئی بمباری سے مشرقی افغانستان سے ہزاروں غیر ملکی پاکستان کے قبائلی علاقوں میں آکر پناہ گزین ہو گئے۔ امریکی ایف بی آئی کئی سال تک پاکستان پر یہی الزام لگاتی رہی ہے کہ دسمبر 2001 کے وسط تک پاک افغان غیر محفوظ سرحد 1000 القاعدہ کارکنوں نے عبور کی تھی، ان میں اسامہ بن لادن بھی شامل تھے۔ 2001 / 9 /11 کے فوری بعد امریکہ میں مقیم مسلمانوں میں سے 1200 کو گرفتار کیا گیا جن میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ ان پر امیگریشن کے قوانین کی معمولی خلاف ورزی کے سوا کوئی سنگین نوعیت کا الزام نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی شخص بھی دہشت گردی میں ملوث نہیں تھا۔ جیلوں میں ان کو وکیل کرنے، اہل خانہ کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ان پر کوئی مقدمہ درج نہ کیا گیا۔ پاکستان میں جب اس ناانصافی کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا تو امریکی حکومت نے ان میں سے 273 کو جیلوں سے نکال کر پاکستان بھیج دیا۔ اس وقت پاکستان کی ان تمام خدمات کو نظر انداز کر دیا گیا جو پاکستان امریکہ کی نام نہاد جنگ میں ہراول دستے کے

طور پر انجام دے رہا تھا۔جبکہ 11 ستمبر کے حملوں میں کوئی ایک بھی پاکستانی شامل نہیں تھا۔پاکستان پراس تیرہ سالہ جنگ میں امریکہ کی جانب سے ایک الزام تسلسل سے لگایا جاتا رہا کہ وہ عسکریت پسندوں کے خلاف کارروائی میں مطلوبہ کارکردگی نہیں دے رہا۔پاکستان پراس دباؤ کا مقصد پاکستانی فوج اور عوام کے درمیان جاری خانہ جنگی کومزید گہرا کرنا اور پاکستان کوغیر مستحکم کرنا تھا۔

## امریکہ پاکستان میں 2001ء کے بعد

جون 2003 تک پاکستان تین یوٹرن لے چکا تھا۔ پہلا طالبان کی مدد سے دست برداری دوسرا پاکستان سے پاکستانیوں اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کی گرفتاریاں اور تیسرا 5 جون 2002 میں کشمیر کے متعلق تھا جس میں صدر بش نے جنرل پرویز مشرف کو کہا تھا ''سرحد پار دراندازی روکی جائے اور اس کا مطلب ہے کہ اس کو روکا جائے''۔اس مسئلے کو امریکی ذرائع ابلاغ میں خوب اچھالا گیا۔ چونکہ پاکستان کی عسکری اور سول اسٹیبلشمنٹ کے مجاہدین سے نظریاتی وابستگی کی بنیادیں پختہ نہیں تھیں اس لئے پاکستان کوطالبان کی حمایت سے دست کش ہونے میں دیر نہ لگی اور جس طریقے سے 1979ء میں سوویت یونین کوشکست دینے کے لئے امریکہ کا آلہ کار بنا تھا۔اب اسی طرح مجاہدین کے خلاف صف آراء ہوگیااور امریکہ کو ہرطرح سے لاجسٹک سپورٹ فراہم کی۔

پاکستان سے اتحادی فوجوں کے حملے جاری تھےاور 2003 تک پاکستان کی سرزمین سے 57800 جنگی پروازیں کی گئیں۔دوتہائی فضائی اڈے اور محفوظ بحری بندرگاہ اتحادی فوجوں کے استعمال میں رہے۔فوج نے امریکہ کے زیر استعمال اڈوں اور تنصیبات کی بخوبی حفاظت کی۔کسی اتحادی کوگزند نہ پہنچی۔ یہ بات امریکی سنٹرل کمانڈ کی طرف سے جاری کردہ ایک رپورٹ میں بتائی گئی۔پاکستان نے پانچ ہوائی اڈے اور ایئرپورٹ امریکہ کوفراہم کیے۔اس کے علاوہ امریکی طیاروں کو ہنگامی حالت میں کسی بھی ایئرپورٹ پر لینڈنگ کی سہولت بھی دی گئی۔ایک سال دس ماہ میں امریکی طیاروں کو اوسطاً چار لاکھ لیٹر تیل بھی فراہم کیا گیا، پاکستان نے افغانستان تک فضائی راہداری بھی فراہم کی۔اس طرح پاکستان نے اپنی فضائیہ کے زیر

استعمال دو تہائی اڈے امریکی فوج اور فضائیہ کے حوالے کردیئے۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کو اپنی سول اور فوجی پروازوں کا رخ بھی تبدیل کرنا پڑا۔ کمرشل فلائیٹ کے نئے روٹس مقرر کرنے پڑے۔ پاکستان نیوی نے امریکی فوج کے بحری جہازوں کو پسنی کے ساحل پر لنگر انداز ہونے کی سہولت فراہم کی اور فوج اتارنے میں مدد کی۔ امریکی اور اتحادی فوجوں کی یہ ضروریات پوری کرنے کے لئے اسے اپنے پروگراموں اور سہولیات میں بھی ردوبدل کرنا پڑا۔ امریکی میگزین کور گزٹ 2002ء کے مطابق اس سلسلے میں پسنی فوج کو اتارنے کا سب سے بڑا آپریشن کیا گیا جو کوریا کی جنگ کے آپریشن سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ آٹھ ہزار میرین فوجی 330 گاڑیاں 135 ٹن وزنی سازوسامان یہاں اتارا گیا۔ اس مقصد کے لئے بھیجی گئی درخواستوں کی تعداد 2140، تکمیل شدہ آپریشن 2008 اور زیر تکمیل آپریشنز کی تعداد 152 ہے۔ گرفتار کئے گئے غیر ملکی مطلوبہ افراد میں القاعدہ کے ابوزبیدہ اور رمزی بن الشیبہ انتہائی مطلوب تھے۔ انہیں پاکستانی ایجنسیوں نے گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کردیا۔ ابوزبیدہ القاعدہ کی دوسری اہم شخصیت تھے۔ اس سے دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کو زبردست کامیابی اور عروج حاصل ہوا۔ واضح رہے کہ رمزی الشیبہ مبینہ طور پر 11 ستمبر کے حملوں میں ملوث تھے۔

## پاکستان میں خودکش حملے، بم دھماکے اور ہلاکتیں

عسکری ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ 21ویں صدی میں علیحدگی پسندوں، عسکریت پسندوں، باغیوں، حریت پسندوں اور آزادی کے مجاہدین کے پاس خودکش بمباروں کی صورت میں ایک ایسا جنگی ہتھیار ہاتھ آگیا ہے جس کا ابھی تک کوئی توڑ نہیں نکل سکا۔ اس کا مظاہرہ پاکستان میں 1965 کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر پاک فوج کے جوانوں نے اس وقت کیا تھا جب بھارت نے پاکستان پر سیالکوٹ جموں سرحد سے چھ سو ٹینکوں کا حملہ کیا تھا۔ اسے ہمارے فوجی جوانوں نے اپنے جسموں پر بم باندھ کر ٹینکوں کے نیچے لیٹ کر ناکام بنایا تھا۔ یہ کمزور مزاحمت کاروں کا طاقتور فوجوں اور جدید ہتھیاروں کے مقابلے میں ایک کارگر جنگی وسیلہ ہے جو ان کی بقاء کا ضامن بن چکا ہے۔ اس سے ان کی اپنے مقصد سے کمٹ منٹ اور مقابلے

کے لیے حد سے گزر جانے کے جذبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسلمان خودکش حملوں کے جائز اور غیر اسلامی ہونے پر منقسم ہیں اور ایک طبقہ اس طریقہ جنگ کو درست تسلیم نہیں کرتا۔

پاکستان میں 2001 سے پہلے 2000 میں کراچی اور حیدر آباد میں صرف دو ایسے واقعات رونما ہوئے تھے جن میں 12 افراد مارے گئے تھے۔ اس سے پہلے اسلام آباد میں 1995 میں مصری سفارت خانے کو ایک دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ (یاد رہے کہ یہ دھماکہ مصری حکومت نے خود کرایا تھا تاکہ مصر کی ایک مذہبی جماعت پر اس کی ذمہ داری ڈال کر اس کے خلاف انتقامی کارروائی کی جا سکے اور پاکستان میں ایف بی آئی کی پاکستان میں موجودگی کا جواز پیدا کیا جا سکے) پاکستان میں امریکی آمد اور افغانستان پر امریکی حملے کے بعد بم دھماکوں اور خودکش حملوں سے پاکستان کی زمین اگلے تیرہ سال تک کانپتی رہی اور یہ سلسلہ ہنوز بھی جاری ہے۔ پاکستانی حکومت کے طالبان سے مذاکرات کے دوران بھی مارچ 2014 میں اسلام آباد کچہری میں فائرنگ اور دو خودکش حملہ آوروں کے دھماکوں سے ایک جج سمیت 17 افراد جاں بحق ہوئے۔ صرف 2014 کے پہلے تین ماہ میں 1092 افراد دہشت گردی کا شکار ہوئے، ان میں 551 سویلین، 183 سیکورٹی فورسز کے اہلکار اور 358 عسکریت پسند لقمہ اجل بنے۔ 2002 میں پاکستان میں دو بڑے خودکش حملے ہوئے۔ ان میں سے ایک اسلام آباد کے چرچ میں ہوا جس میں امریکی ڈپلومیٹ کی بیوی اور بیٹی سمیت پانچ افراد مارے گئے۔ دوسرا حملہ کراچی میں شیراٹن ہوٹل کے باہر ہوا جس میں 11 فرانسیسی انجینئر اور 4 دیگر افراد مارے گئے۔

اس کے بعد پاکستان میں خودکش حملوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں ملکی سربراہوں سمیت عسکری اور اعلیٰ سول حکام کو نشانہ بنایا گیا۔ ان میں بے نظیر بھٹو، پرویز مشرف، سابق وزیر اعظم شوکت عزیز سمیت صوبہ کے پی کے کئی وزراء کو نشانہ بنایا گیا۔ بے نظیر پر پہلا حملہ کراچی میں ان کی آمد کے وقت ہوا جس میں سو سے زیادہ پاکستانی جاں بحق ہوئے لیکن بے نظیر محفوظ رہیں۔ اسے سانحہ کارساز کا نام دیا گیا۔ اس کے چند دنوں بعد 27 دسمبر 2007 کو لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسے سے خطاب کر کے جب وہ باغ کے گیٹ سے باہر نکلیں تو ان پر پہلے فائرنگ کی گئی اور ساتھ ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا جس میں بے نظیر بھٹو سمیت دو درجن سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔ ان کی موت کا شدید ردعمل سامنے آیا۔ پاکستان میں ہر

طرف توڑ پھوڑ شروع ہوگئی جسے حکومت نے روکنے کی کوشش نہ کی جس کے نتیجے میں پاکستان کو کھربوں روپے کا نقصان ہوا۔ پاکستان دہشت گردی کی جنگ میں نان نیٹو اتحادی بنا تو یہ خود دہشت گردی کا شکار ہو گیا۔ پاکستان کے وہ عناصر جو طالبان اور القاعدہ کے بہت قریب ہو چکے تھے کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آیا۔ القاعدہ اور طالبان کے خلاف لڑی جانے والی جنگ نے امریکہ اور مسلمانوں کی جنگ کا روپ دھار لیا۔ یارو سلاف ٹروفیموف کے بقول پاکستان نے 2004 میں افغان سرحد سے متصل قبائلی علاقوں میں امریکہ کے دباؤ میں آ کر قبائلیوں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کیا تھا۔ پاک فوج کے اس وقت سے لے کر (2004 سے 2014) اب تک 4000 جوانوں اور افسروں نے جام شہادت نوش کیا جبکہ 13000 سے زائد افسر اور جوان زخمی ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس افغانستان میں امریکی فوج کے 2001 سے 2013 تک صرف 2315 فوجی ہلاک اور جن میں سے 1800 کی ہلاکت جنگ کے دوران ہوئی۔ امریکہ نے پاک فوج کی قربانیوں کو نظر انداز کر دیا اور دہشت گردی کی جنگ میں پاکستانی کوششوں کو فراموش کر دیا گیا۔ اپنی ترجیحات میں تبدیلی کے تناظر میں پاکستان میں عوامی اور حکومتی سطح پر امریکہ ایک ناقابل اعتبار دوست بن گیا۔

پاکستان میں دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کے متعلق مختلف اداروں کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق 2003 سے 2013 تک ہلاک ہونے والوں کی تعداد 51608 ہے۔ ان میں 18707 سویلین، 27220 عسکریت پسند اور 5678 سیکورٹی اہلکار شامل ہیں۔

## پاکستان میں دہشت گردی اور ایف بی آئی

2004 میں سابق وزیر اعظم شوکت عزیز، سابق صدر پرویز مشرف اور کور کمانڈر کراچی پر ہوئے خود کش حملوں میں مجموعی طور پر 31 افراد مارے گئے۔ یہ اس سال کے بڑے حملے قرار دیے گئے۔ مشرف پر ہوئے قاتلانہ حملے کے سلسلے میں اسلام آباد پولیس کی اسپیشل برانچ کے محمد نعیم کو گرفتار کیا گیا جس کے موبائل فون پر بالاکوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک خود کش حملہ آور محمد جمیل کی فون کالز موصول ہوئی تھیں۔ محمد نعیم کی ڈیوٹی کنونشن سنٹر پر تھی جہاں پرویز مشرف ایک تقریب کی صدارت کر رہے تھے اور محمد نعیم نے حملہ آور کو صدر کے قافلے کی صحیح

جگہ سے آگاہ کیا تھا۔ دوسرا خودکش حملہ آور محمد سلطان بھی آزاد کشمیر کے علاقے پونچھ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ دونوں حملہ آور 11 ستمبر کے بعد افغانستان میں شمالی اتحاد کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے اور 2003 میں رہا ہو کر پاکستان آئے تھے۔ 25 دسمبر کو پرویز مشرف پر حملے سے قبل محمد جمیل نے اس خیال سے کہ خودکش حملے میں فون ضائع ہو جائے گا 108 کالیں کی تھیں۔ لیکن حملے میں ناکامی پر فون کی میموری کارڈ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ پاکستان میں ان دنوں عراق میں سعودی عرب کی تجویز پر اسلامی ممالک کی فوج بھیجنے کی بحث بھی جاری تھی۔ دونوں حملہ آوروں نے افغانستان میں طالبان اور گرفتار پاکستانیوں پر ہونے والے مظالم کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ عام تاثر بھی دیا گیا کہ یہ مسلمانوں کے خلاف امریکی پالیسیوں کا نتیجہ تھا جن پر حکومت عمل پیرا تھی۔ ان دنوں، پاکستان القاعدہ اور ان کے ہمدردوں کے خلاف ایف بی آئی اور آئی ایس آئی کے مشترکہ آپریشنز کا میدان بنا ہوا تھا۔ عراق میں دو پاکستانیوں کا قتل بھی اس سلسلے کی ہی ایک کڑی تھی۔ اس سے چند دن پہلے گجرات کے علاقے اسلام پورہ سے 24 گھنٹے کے طویل مقابلے کے بعد 13 افراد کو گرفتار کیا گیا جن میں تنزانیہ کا ایک باشندہ احمد خلفان بھی شامل تھا جس کے سر کی قیمت ایف بی آئی نے 50 لاکھ ڈالر رکھی ہوئی تھی۔ یہ ایف بی آئی کو اگست 1998 میں کینیا میں امریکی سفارت خانے پر ہوئے بم دھماکوں میں مطلوب تھا اور نیویارک کی عدالت اسے سزا سنا چکی تھی۔ گرفتار شدگان میں احمد خلافان کی ازبک بیوی، کینیا، سوڈان، جنوبی افریقہ کے باشندے، ایک افغان عورت، ایک بارہ سالہ سعودی بچی اور ایک پاکستانی بھی شامل تھے جس کا تعلق اوکاڑہ سے بتایا گیا۔ عین اسی وقت سندھ حکومت نے اعلان کیا کہ مختلف مساجد میں نماز جمعہ کے دوران دہشت گردی اور خودکش حملے کیے جائیں گے، کراچی کے امریکی قونصلیٹ کے تمام راستے بند کر دیے گئے، ہیلی کاپٹروں کی مذکورہ علاقے میں پروازیں شروع کر دی گئیں۔ ہائی الرٹ کے باوجود پاکستان میں عوامی حلقوں اور ارباب اختیار کے درمیان عراق میں فوج بھیجنے یا نہ بھیجنے پر بحث جاری تھی۔ مذکورہ بالا واقعات کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے مربوط ضرور تھے لیکن ان پر کسی دوسرے زاویے سے کسی نے توجہ نہ دی۔ عراق میں اسلامی فوج بھیجنے کی بحث اس وقت ختم ہوئی جب ایک ویب سائٹ پر جماعت الوحید عمر مختار بریگیڈ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ وہ ہر اس مسلم یا عرب

ملک کو اپنے حملوں کا نشانہ بنائیں گے جو عراق میں اپنی فوج بھیجنے پر آمادہ ہوں۔ عمر مختیار لیبیا کا وہ حریت پسند تھا جسے اطالوی قبضے کے خلاف لڑتے ہوئے 1931 میں پھانسی دیدی گئی تھی۔ اس دوران کراچی اور پنجاب سے کئی سرکاری اہلکاروں کو تحویل میں لے لیا گیا اور سرکاری و نجی تقریبات عارضی طور پر بند کر دی گئیں۔ پاکستان میں امن و امان کا مسئلہ ایف بی آئی کے پاکستان میں بڑھتے ہوئے آپریشنز سے شدت اختیار کرنے لگا، ہر طرف شک اور بے اعتمادی کا ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ یہی امریکہ اور بھارت کے لیے سازگار فضا تھی جب بلوچستان اور فاٹا میں سی آئی اے کے ایجنٹ بھرتی کیے گئے جو ڈالروں کے بدلے مقامی طالبان اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کی مخبری پر مامور ہوئے۔ اس کے ردعمل میں فاٹا میں طالبان کی تحریک وجود میں آئی جس نے سینکڑوں قبائلی وڈیروں اور خوانین و ملوک کو امریکی مخبری کے شبے میں قتل کیا۔ فاٹا، شمالی علاقہ جات اور خیبر پختونخوا میں بم دھماکوں اور دہشت گردی کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے ملک کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور ہر سال ہزاروں لوگ اس امپورٹڈ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھنے لگے۔

پاکستان میں ایف بی آئی کی موجودگی کو انتہائی خفیہ رکھا گیا، اس کے دفاتر رہائشی علاقوں میں قائم کیے گئے۔ 2004 میں پاکستان کے سابق وزیر داخلہ معین الدین حیدر نے ایف بی آئی کی پاکستان میں موجودگی کی طرف اشارہ کیا تو اس کے بعد کچھ معلومات سامنے آنے لگیں۔ ایف بی آئی کی خفیہ دستاویزات میں بھی اس ایجنسی نے اعتراف کیا ہے کہ 11 ستمبر 2001 سے پہلے اس نے پاکستان میں اپنے دفاتر قائم کر لیے تھے۔ 1995 میں کراچی کے عبداللہ ہارون روڈ پر امریکی قونصل خانے نے دس سالہ لیز پر وسیع و عریض بنگلے حاصل کیے۔ اس کے بعد ایف بی آئی کئی بار پاکستان آکر اپنی کارروائیاں کر چکی ہے۔ مارچ 1995 میں جب کراچی میں امریکی قونصلیٹ کی گاڑی پر فائرنگ کے نتیجے میں دو امریکی قتل ہوئے تو ایف بی آئی اپنے طبی ماہرین کے ہمراہ فوری طور پر پاکستان پہنچ گئی۔ انہوں نے خود ہی امریکیوں کا پوسٹ مارٹم کیا اور اپنی نگرانی میں تفتیش کرائی تھی۔ پھر نومبر 1995 میں اسلام آباد میں مصری سفارت خانے پر حملہ ہوا تو ایف بی آئی اسلام آباد پہنچ گئی۔ پاکستانیوں کی اکثریت کے لیے حیران کن امر تھا کہ مصری سفارت خانے میں ہوئے دھماکے سے ایف بی آئی

کا کیا تعلق تھا؟

1995 کے بعد ایف بی آئی کی سرگرمیاں عارضی بنیادوں پر تھیں اور مشن مکمل ہونے کے بعد اس کے کارندوں کو مستقل طور پر پاکستان میں تعینات نہیں کیا جاتا تھا۔ 2000 میں ایف بی آئی کے انویسٹی گیشن سروسز کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل جیمز ویبر نے وزارت قانون کی کمیٹی کے روبرو بیان دیا اور ان ممالک کے نام بتائے جن میں اسی سال ایف بی آئی نے دفاتر قائم کر کے اپنے ایجنٹس بھیجنے تھے۔ ان ممالک میں پاکستان کا نام بھی شامل تھا۔ لیکن اس سے بھی کئی سال قبل 1996ء میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ایف بی آئی کے ایجنٹس کو امریکی سفارت خانوں میں لیگل اتاشی ایجنٹس کے طور پر بھرتی کیا جائے گا۔ اس طرح امریکی سفارت خانوں میں 7 سینئر اسپیشل ایجنٹس کا تقرر کیا گیا تھا جن کے 23 ممالک میں 54 معاون اہلکار بھی بھرتی کیے گئے۔ ان ایجنٹس کی ذمہ داریاں ان ممالک کی متعلقہ اتھارٹیز کے تعاون سے جرائم کو کم کرنے کے علاوہ وہاں امریکیوں کے تحفظ کو یقینی بنانا بھی تھا۔

ایف بی آئی نے 27 جنوری 2003ء کو جاری ہونے والی ایک دستاویز میں ان ممالک کی فہرست جاری کی جہاں لیگل اتاشی اور ڈپٹی لیگل اتاشی کے سفارتی کوڈ کے تحت ایف بی آئی کے اسپیشل ایجنٹس کام کر رہے تھے۔ اس فہرست میں پاکستان بھی شامل تھا۔ اکتوبر 2002ء کے وسط میں امریکہ کے ایک سرکاری عہدے دار نے واشنگٹن میں ایک سپائیڈر گروپ کی تشکیل کا انکشاف بھی کیا تھا جس میں اکثریت چند ریٹائرڈ افسران کی تھی اور جن کی ذمہ داری قبائلی علاقہ جات اور پاک افغان سرحد پر طالبان اور القاعدہ کے اراکین کی تلاش میں ایف بی آئی کی مدد کرنا تھی۔ اس سپائیڈر گروپ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ طالبان کی سرگرمیاں بلاتعطل امریکہ کو پہنچتی رہیں۔ اس میں چند بریگیڈئر اور کرنل رینک کے ان افسران کی خدمات حاصل کی گئیں تھیں جو 80ء کی دہائی میں روس کے خلاف افغان جہاد کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ کو مدارس، مساجد اور مذہبی جماعتوں پر نظر رکھنے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اس سپائیڈر گروپ نے قبائلی علاقوں میں اپنا نیٹ ورک قائم کیا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ جلد ہی اس گروپ کی سرگرمیاں پاکستانی اداروں کے نوٹس میں آ گئیں جنہوں نے ان پر قابو پالیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ قبائلی علاقوں میں سیکورٹی فورسز نے ایف بی آئی کی مدد

کی پاداش میں کئی مخبروں کو قتل کر دیا تھا۔ ابتدا میں رسول نامی شخص جو کبھی طالبان کارکن تھا، ذی خیل قبیلے کے سید وزیر محمد، وانا کے محمد علی اور بہمل کے علاقے سے رسول دین کو ایف بی آئی کے لیے کام کرنے کے الزام میں مار دیا گیا۔ اس کے بعد قبائلی علاقوں میں ہزاروں افراد بم دھماکوں، فائرنگ اور ڈرون حملوں سے جاں بحق ہوئے۔

## پاک فوج فاٹا میں

یاد رہے کہ پاکستانی فوج قبائلی علاقے کی خیبر ایجنسی کے مقام وادی تیراہ میں پہلی مرتبہ جولائی 2002 میں داخل ہوئی تھی جسے قبائلیوں نے اپنی خود مختاری کے خلاف تصور کیا۔ پاک فوج بہت جلد شمالی وزیرستان کے علاقے شوال اور بعد ازاں جنوبی وزیرستان تک پھیل گئی۔ قبائلی علاقوں میں قبائلی اکابرین کے ساتھ طویل مذاکرات کے بعد پاک فوج کی تعیناتی ممکن ہوئی تھی جس میں مقامی سرداروں کو یقین دلایا گیا تھا کہ ان کے علاقے کو فنڈز دیے جائیں گے اور ترقیاتی کام بھی کیے جائیں گے۔ تاہم پھر بھی محض چند قبائل نے ہی جھجکتے ہوئے فوج کو وہاں رہنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن یہ صورتحال اس وقت جلد ہی تبدیل ہو گئی جب پاک فوج نے جنوبی وزیرستان میں آپریشن شروع کر دیا۔ قبائلیوں نے اس آپریشن کو اپنی خود مختاری پر حملہ تصور کیا۔ پاک فوج کے خلاف مقامی لوگوں میں اس وقت غصے کی لہر پیدا ہوئی جب اجتماعی سزا کے طور پر سیکورٹی فورسز نے ناراض قبائلیوں کے مکانات مسمار کر دیے اور صوبے میں دیگر جگہوں پر ان کی جائیدادوں کو بھی ضبط کر لیا گیا۔ یہی امریکہ چاہتا تھا جس کے متعلق کئی دانشوروں نے کئی سال پہلے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک دن امریکہ پاکستانی فوج اور عوام کو آپس میں لڑا دے گا۔ وانا جو کہ جنوبی وزیرستان کا انتظامی ہیڈ کوارٹر تھا، فوج نے گھیرے میں لے لیا اور فوج نے اردگرد کی پہاڑیوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دوسرے قبائلی علاقوں میں بھی جنگ کے خطرات منڈلانے لگے۔

شمالی اور جنوبی وزیرستان میں پشتونوں کے دو اہم قبائل وزیری اور محسود آباد ہیں۔ ان دونوں اور ان کے دیگر کئی ذیلی گروپ کا باہمی وجود دائی جنگ و جدل سے برقرار ہے لیکن بیرونی حملہ آوروں کے خلاف وہ ہمیشہ متحد رہے اور سکندر اعظم و چنگیز خان سے لے کر

انگریزوں تک کوئی فاتح بھی ان کو سرنگوں کر سکا اور نہ ہی وزیرستان پر کنٹرول حاصل کر سکا۔ بنجر زمین کی پٹی پر مشتمل یہ علاقہ 11ویں صدی تک مختلف سلطنتوں کے درمیان ایک بفر ریاست کا کام دیتی آئی ہے۔ ایک مربوط و مضبوط پہاڑوں میں گھرے ہوئے وزیریوں اور محسود قبائل نے برطانوی راج کے خلاف ایک تاریخی مزاحمت کی تھی۔ جب 1893 میں افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان ڈیورنڈ لائن قائم کی گئی تو وزیرستان برطانوی حکومت سے باہر ایک خود مختار علاقہ بن گیا۔ 1947 میں جب یہ پاکستان کا حصہ بنا تو حکومت پاکستان نے انگریز کی پیروی کرتے ہوئے قبائلی عمائدین کو رقوم کی ادائیگی کے ذریعے امن کی روایت کو قائم رکھا۔ وہاں پر پاکستان کے عمومی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ وفاقی حکومت کی طرف سے قبائلی ایجنٹ کے ذریعے وہاں کا انتظامی اور عدالتی نظام چلایا جاتا ہے۔ ڈیورنڈ لائن کی دونوں طرف پشتون آباد ہیں جو سرحد کو دو ملکوں کی بارڈر تسلیم نہیں کرتے۔ وزیرستان کا پہاڑی علاقہ گوریلہ جنگ کے لیے ایک مثالی علاقہ ہے۔ 1937 میں ان قبائلیوں نے ایک قبائلی رہنماء فقیر ایپی (ان کا اصل نام مرزا علی خان بھی لکھا گیا ہے) کی طرف سے دیے گئے جہاد کے حکم پر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کیا تھا۔ یہ شورش ایک پشتون جوان کے ایک ہندو لڑکی کو اغوا کر کے وزیرستان لانے پر شروع ہوئی جسے انگریزوں نے واپس کرنے کے لیے قبائلیوں پر دباؤ ڈالا تھا۔ اس ہندو لڑکی کو شادی سے پہلے اسلام قبول کرایا گیا اور اس کا نام اسلام بی بی رکھا گیا۔ اس بغاوت میں فریقین کے بے شمار لوگ مارے گئے جو دو عشروں تک جاری رہی اور قیام پاکستان کے بعد بھی پاکستان کے خلاف جاری رہی جسے فقیر ایپی ایک غیر اسلامی ریاست کہتے تھے۔ ان کی وفات 1960 میں ہوئی لیکن ان کا دیا ہوا سبق وزیریوں اور محسود قبائل کو ابھی تک یاد ہے۔ وزیریوں کی اکثریت نے اسامہ بن لادن اور فقیر ایپی میں کافی مماثلت محسوس کی۔ ان کے نزدیک دونوں کی جنگ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اور اسلام کے حق میں تھی۔

یہاں کی 90 فیصد مرد آبادی 80 کی دہائی کے ان مجاہدین یا ان کی اولادوں پر مشتمل ہے جو افغان جہاد میں اپنی جنگی مہارتیں آزما چکی ہے۔ انہوں نے اسی مہارت کو پاکستانی فوج کیخلاف مزاحمت میں استعمال کیا۔ یہاں کے لوگوں کا مجموعی مزاج اگرچہ مذہبی ہے لیکن 1950 اور 1960 کے درمیان پشتونستان کی تحریک ایک سیکولر تحریک تھی جس میں قبائلیوں نے

بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا تاہم 1980 میں وہ سخت گیر اسلام کی روایت پر کاربند ہو گئے۔ اس مختصر تعارف کا مقصد قارئین کو یہ بتانا مقصود ہے کہ پاکستان کی فوج کو شمالی وزیرستان میں جن مشکلات کا سامنا ہے اس میں وہاں کے جغرافیے اور پشتونوں کی جنگ مہارت اور اتحاد کا بڑا ہاتھ ہے ورنہ حکومتوں کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔

پاکستان کے فوجی دستے مارچ 2004 کے دوسرے ہفتے میں، غیر ملکی عسکریت پسندوں کی حوالگی کا مقررہ وقت گزرنے کے بعد، جارحانہ پیش قدمی کرتے ہوئے وزیرستان میں داخل ہوئے تو فوجی حکام نے اس توقع کا اظہار کیا کہ آپریشن چند دنوں میں مکمل کر دیا جائے گا لیکن غیر متوقع شدید مذاحمت نے فوجی کمانڈرز کو ششدر کر دیا۔ بارہ دنوں کی خونی جنگ میں فوج کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ 16 مارچ کو جب فوج غیر ملکیوں کے خفیہ ٹھکانوں کی طرف بڑھی تو اس کے 50 سپاہی جاں بحق اور مقامی قبائلیوں اور ان کے مہمانوں نے درجنوں گرفتار کر لیے۔ کلوشہ اور شن وارسک میں مہلک جنگ چھڑ گئی۔ اپنے آپ کو عسکریت پسندوں کے گھیرے میں پا کر پیرا ملٹری فورسز کے کئی دستوں نے ہتھیار ڈال دیے اور جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ عسکریت پسندوں کی فائرنگ کی زد میں آئے ہوئے پاک فوج کے جوانوں نے ایک مسجد میں چھپ کر جان بچائی۔ ان میں پاک فوج کے ایک کرنل بھی تھے جو جان کی امان پانے کے لیے مسجد سے اپنے سر پر قرآن رکھ کر باہر نکلے جس کی وردی قبائلیوں نے رکھ لی اور کرنل کو جانے دیا۔ فوج کو اس آپریشن میں کامیابی کے امکانات بہت کم نظر آ رہے تھے لیکن وہ آپریشن کو بھی ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے گن شپ ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بمباری کرنے کا فیصلہ کیا اور چند درجن عسکریت پسندوں کو اپنے ٹھکانوں میں بند ہونے پر مجبور کر دیا۔ فاٹا میں آپریشن کے دوران پاک فوج کے ہمراہ چند ایک امریکی تھے جو لڑنے کے بجائے مواصلات اور انٹیلی جنس تک محدود تھے۔ غیر ملکی عسکریت پسندوں میں ازبک اور چیچن مجاہدین تھے جن کی جنگی مہارت اور بہادری کا اعتراف افغانستان میں ملا عمر کی قیادت میں طالبان، پاک فوج اور شمالی اتحاد کے لڑاکا کر چکے تھے۔ یہ ازبک مجاہد طاہر یلدے شیف کی زیر کمان یہاں پناہ لیے ہوئے تھے جو قائدانہ صلاحیتوں اور اپنی اثر انگیز تقریروں سے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ طاہر یلدے شیف اس آپریشن میں زخمی

حالت میں کسی دوسری جگہ بھاگ گیا تھا۔ فاٹا میں جاری فوجی آپریشنز کی تفصیلات بہت طویل ہیں جن کا یہاں احاطہ ممکن نہیں۔ بحر کیف اس کے بعد قبائلیوں اور حکومت پاکستان کے درمیان دس سال کے عرصے میں فائر بندی اور امن کے کئی ایک معاہدے ہوئے جن کی فریقین کی طرف سے خلاف ورزی ہوتی رہی اور فاٹا میں جنگ کسی نہ کسی حالت میں ضرور جاری رہی جس میں ہزاروں قیمتی جانیں ضائع ہوئیں اور کروڑوں ڈالرز کا مالی نقصان بھی ہوا۔ اس میں حکومت کے امریکی ایماء پر پاکستان کے طالبان پر پالیسی پر یوٹرن نے اہم کردار ادا کیا۔

## پاکستان میں امریکی ڈرون حملے اور ملکی خودمختاری!

امریکہ کے سول و فوجی حکام کئی بار یہ بیان دے چکے ہیں کہ 'القاعدہ اور طالبان کا پیچھا کرتے ہوئے پاکستان کی سرحدوں کی خلاف ورزی کرنی پڑے تو وہ کریں گے اور پاکستان کے احتجاج کو خاطر میں نہیں لایا جائے گا'۔ پاکستان میں عوام ان حملوں کو پاکستان کی خودمختاری کے خلاف سمجھتے ہیں جس میں ہزاروں بے گناہ شہری جاں بحق ہوئے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ یہ امریکہ کی طرف سے ایک ایسی جنگی چال ہے جس کا پاکستان کے پاس کوئی توڑ نہیں۔ اسے دہشت گردی کے نام سے امریکہ دس برسوں سے جاری رکھے ہوئے ہے جو القاعدہ سے زمینی جنگ سے خوفزدہ ہے۔

نیک محمد وزیر وہ پہلا قبائلی عسکریت پسند تھا جسے ہلاک کرنے کے لئے امریکی سی آئی اے نے 18 جون 2004ء میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملوں کا آغاز کیا۔ یہ پاکستان کے اعلیٰ عسکری افسران سے ملاقات کے بعد ہوا۔ جنوبی وزیرستان میں ہونے والے اس اولین ڈرون حملے میں 7 افراد ہلاک ہوئے۔ سی آئی اے کے مطابق ہلاک شدگان میں پانچ شدت پسند (سی آئی اے کے اعداد و شمار کے مطابق کل 15 افراد جاں بحق ہوئے تھے) چھ عام شہری اور چار نامعلوم افراد ہلاک ہوئے۔ اسی طرح 2006ء میں ہونے والے چار ڈرون حملوں میں 51 شدت پسند اور 12 دیگر نامعلوم افراد ہلاک ہوئے۔ 2008ء میں جنرل پرویز مشرف کے نو سالہ اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور 18 فروری 2008ء کے انتخابات کے بعد ایک بار پھر پیپلز پارٹی اقتدار پر براجمان ہوئی، لیکن 2008ء سے 2013ء کے دوران اس کے

پانچ سالہ دور حکومت میں بھی ڈرون حملوں کا سلسلہ نہ رُک پایا۔ 2008ء میں 36 بار امریکی سی آئی اے نے پاکستانی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ڈرون داغے جس کے نتیجے میں 223 عسکریت پسند، 28 عام شہری اور 47 نا معلوم افراد ہلاک ہوئے۔ 2008ء میں ہلاک ہونے والے افراد کی کل تعداد 298 تھی۔

نومبر 2008ء کے امریکی انتخابات میں ری پبلیکن پارٹی صدارتی امیدوار جان میکن ڈیموکریٹ پارٹی کے سیاہ فام بارک حسین اوباما کے مقابلے میں اس لئے ناکام ہوئے کیونکہ امریکی عوام کا خیال تھا کہ ری پبلکن صدر جارج واکر بش کے دور میں شروع ہونے والی دہشت گردی کی جنگ کی بدولت خود امریکہ کا خاصا نقصان ہو چکا ہے، اس لئے انہیں اب ایسا صدر درکار ہے، جو انہیں اس دلدل سے نکال سکے۔ 2008ء کے انتخابات کے دوران امریکی صدر بارک حسین اوباما اس عزم کا اظہار کرتے دکھائی دیئے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ سے امریکہ کو جلد نکالنے کے خواہش مند ہیں، لیکن جنوری 2009ء میں قصر سفید کا مکین بننے کے بعد انہوں نے یہ موقف اپنایا کہ وہ شدت پسندوں کے خلاف فیصلہ کن معرکہ سرانجام دینے جارہے تھے جس کے بعد افغانستان اور عراق سے امریکی افواج کے انخلاء کا عمل شروع ہو جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ 2009ء میں پاکستان میں امریکی ڈرون حملوں میں شدت آ گئی۔ 2009ء میں ہونے والے 54 ڈرون حملوں سے متعلق امریکہ نے یہ دعویٰ کیا کہ ان میں 387 عسکریت پسند ہلاک ہوئے۔ ان حملوں میں (امریکی اعداد وشمار کے مطابق) 70 عام شہری اور 92 نامعلوم افراد بھی ہلاک ہوئے۔ اگرچہ بہت سے پاکستانی اور امریکی دفاعی تجزیہ کاروں کے مطابق پہلے جنرل پرویز مشرف اور بعد میں پیپلز پارٹی کی حکومت اور امریکہ کے درمیان ڈرون حملوں کے حوالے سے مفاہمت موجود تھی، جس کی بدولت ان کا سلسلہ جاری رہا۔ 2010ء کے اوائل میں وکی لیکس نے سابق وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی کے حوالے سے انکشاف کیا تھا کہ ان کا امریکیوں سے یہ کہنا تھا کہ آپ (امریکی) ڈرون حملوں کا سلسلے جاری رکھیں، ہم پارلیمنٹ میں رسمی احتجاج کرتے رہیں گے، لیکن اس کے باوجود عوام کی اکثریت نے ڈرون حملوں کو ملکی خود مختاری کے منافی سمجھتے ہوئے ان کے خلاف احتجاج جاری

رکھا۔ 2010ء میں ہونے والے 122 ڈرون حملوں میں ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد 849 تھی۔ 2 مئی 2011ء کو ایبٹ آباد آپریشن میں اسامہ بن لادن کی مبینہ وفات امریکہ کے لئے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک بڑی کامیابی ثابت ہوئی جس کے بعد اوبامہ انتظامیہ نے افغانستان سے انخلاء کے لئے 2014ء کی حتمی ڈیڈ لائن کا اعلان کر دیا۔ اسی سال نومبر کے مہینے میں امریکی افواج کا انخلاء عراق سے ممکن بنایا گیا۔ عراق سے امریکی افواج کے انخلاء کا جواز بتاتے ہوئے سابق امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کا کہنا تھا کہ عراق میں القاعدہ کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ پاکستان میں ہونے والے ڈرون حملوں میں عسکریت پسندوں کے علاوہ 270 ایسے افراد ہلاک ہو چکے ہیں، جن کی شناخت نہیں ہو سکی۔ نیو امریکی فاؤنڈیشن کے اعداد و شمار بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سی آئی اے کی جانب سے ڈرون حملوں میں ہلاک ہونے والے عام شہریوں کی تعداد ان کی اصل تعداد سے کہیں کم ظاہر کی گئی ہے۔ 2012ء امریکہ میں صدارتی انتخاب کا سال تھا اور سال کے آغاز ہی سے انتخابی گہما گہمی کا آغاز ہو چکا تھا۔ دوسری صدارتی مدت حاصل کرنے کے لئے بارک حسین اوباما کو مٹ رومنی کو شکست سے دوچار کرنا تھا جس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ 2012ء کا امریکی صدارتی انتخاب امریکی معیشت میں بہتری کو بنیاد بنا کر لڑا گیا، کیونکہ 2005ء سے 2010ء کا درمیانی عرصہ امریکی عوام کے لئے معاشی مشکلات سے بھرپور تھا جس میں بہتری کے لئے صدر اوباما نے کافی کوشش کی، لہٰذا وہ اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرتے رہے۔ (اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے) خارجہ پالیسی کے حوالے سے دونوں صدارتی امیدواروں کے درمیان ایک مباحثہ ہوا، لیکن اس میں بھی ڈرون حملوں کے حوالے سے زیادہ بات نہ ہوئی۔ خود ریپبلکن صدارتی امیدوار مٹ رومنی نے اس حوالے سے صدر اوباما سے زیادہ سخت رویہ اپنایا۔

مارچ 2008ء کے دوران قائم رہنے والی پیپلز پارٹی کی اتحادی حکومت پر اس وقت کی حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ (ن) (موجودہ حکمران جماعت) نے بارہا یہ الزام عائد کیا کہ وہ ڈرون حملے رکوانے میں سنجیدہ نہیں۔ مسلم لیگ (ن) کے علاوہ موجودہ حزب اختلاف کی بڑی جماعت پاکستان تحریک انصاف (جو اس وقت پالیمنٹ سے باہر تھی، لیکن اب خیبر پختونخوا میں اس کی حکومت ہے) نے بھی پیپلز پارٹی کی حکومت کو آڑے

ہاتھوں لیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اگر وہ (تحریک انصاف) اقتدار میں آئی تو امریکی ڈرون گرانے کے لئے پاک فضائیہ کو حکم جاری کرے گی۔ اگر چہ تحریک انصاف کے پاس مرکزی حکومت تو نہیں کہ وہ ڈرون گرانے کے حوالے سے کسی قسم کا حکم جاری کر سکتی۔ لیکن تحریک انصاف نے پاکستان کے راستے نیٹو سپلائی کے خلاف کئی دنوں تک دھرنا دیا اور یہ بات عالمی میڈیا کو ریکارڈ ضرور کرا دی کہ وہ امریکہ کے پاکستان کے خلاف اقدامات کے خلاف ہے۔ تاہم دوسری جانب خیبر پختونخواہ میں بڑھتی ہوئی زمینی دہشت گردی نے اس بات کو واضح کر دیا کہ صوبائی حکومت دہشت گردوں سے نمٹنے کے لئے کسی قسم کی بھی حکمت عملی بنانے میں ناکام تھی۔ وزیر خارجہ جان کیری نے امریکی موقف کی وضاحت کی کہ پاکستان کی قبائلی علاقوں میں عملداری ختم ہونے اور شدت پسندوں کے بارے میں کمزور پالیسی اپنانے پر امریکہ نے مجبور ہو کر پاکستانی علاقے میں ڈرون حملوں کا آغاز کیا تھا۔ مئی 2013ء کے انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی مسلم لیگ (ن) کی حکومت نے اگر چہ اپنی پیشرو حکومت کے برعکس اس حوالے سے نسبتاً سخت موقف اپنایا تھا اور امریکہ کو باور کرایا کہ یہ نہ صرف پاکستان کی خودمختاری پر حملے ہیں بلکہ اس سے دہشت گردی کی جنگ پر قابو پانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن پھر بھی یہ حملے نہ رکے، لیکن ان کی تعداد پہلے کی نسبت کم تھی۔ امریکہ نے پاکستانی موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد بھی چار افراد مارے گئے۔

ڈرون حملوں میں ہلاکتوں کے متعلق تحقیقی صحافت کے برطانوی ادارے The Bureau of Investigative Journalism نے پاکستانی علاقوں میں ہونے والے سی آئی اے کے اعداد و شمار کو مسترد کر دیا ہے۔ سی آئی اے کے مطابق جون 2004 عسکریت پسند، 286 عام شہری، 197 بچے اور دیگر 3549 افراد ہلاک ہوئے۔ مزید یہ کہ 1480 افراد ان حملوں کی بدولت دائمی معذوری کا شکار ہوئے۔ دوسری جانب پشاور ہائی کورٹ میں ڈرون حملوں سے متعلق پیش کی جانے والی رپورٹ کے مطابق ان حملوں میں 1500 عام شہری ہلاک ہوئے جبکہ ان میں عسکریت پسندوں کی تعداد صرف 47 تھی۔ یاد رہے کہ پشاور ہائی کورٹ نے ڈرون حملوں کو غیر قانونی، غیر انسانی اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ڈرون حملے نہ رکے تو اس سے جنگی جرائم میں اضافہ ہوگا۔

باوجود اس کے کہ امریکی ڈرون حملوں نے پاک امریکہ سٹریٹجک تعلقات کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ امریکی ڈرون حملوں کی حمایت ترک کرنے پر تیار نہیں دکھائی دیتے۔ 25 مارچ 2010ء کو امریکی محکمہ خارجہ کے مشیر ہاراولڈ کہ نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ہونے والے امریکی ڈرون حملوں کا قانونی جواز موجود ہے کیونکہ ہم (امریکی) یہ حملے ذاتی تحفظ کے حق کو استعمال کرتے ہوئے کررہے ہیں۔ ایک سابق سی آئی اے اہلکار نے امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کو بتایا کہ جس شخص کو ڈرون کے ذریعے نشانہ بنانا مقصود ہو اس کے لئے خاص میکانزم کو استعمال کیا جاتا ہے، جس کی بدولت غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اگرچہ دو سابق پاکستانی حکمرانوں جنرل پرویز مشرف اور یوسف رضا گیلانی نے امریکی ڈرون حملوں کو دہشت گردی کے خاتمے میں معاون قرار دیا، لیکن اس کے باوجود پاکستانیوں کی اکثریت ان ڈرون حملوں کو ملکی خودمختاری کے منافی سمجھتی ہے۔ 8 ستمبر 2008ء کو پاکستانی فوج کے ترجمان نے ڈرون حملوں کے ذریعے عام پاکستانیوں کی ہلاکتوں پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے دونوں ممالک کے باہمی تعلقات میں گہری خلیج پیدا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔

امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے حالیہ دورہ پاکستان کے دوران پاکستانی حکام سے دہشت گردی کے خلاف مشترکہ لائحہ عمل کو آگے بڑھانے کے لئے اس بات کی اہمیت پر زور دیا کہ پاکستان اپنی سرحد سے افغانستان میں ہونے والی عسکری کارروائیوں کا تدارک کرے۔ جس کے لئے اسے ملک کے قبائلی علاقوں میں عسکریت پسندوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کا آغاز کرنا ہوگا۔ امریکی دفاعی تجزیہ کار شان مارشل کے مطابق امریکہ کی خواہش ہے کہ پاکستان ایک بھرپور حکمت عملی کے تحت اپنے قبائلی علاقوں کو عسکریت پسندوں سے پاک کرے۔ دوسری جانب پاکستانی عسکری ادارے اور سیاسی قبائلی اس بات پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ ڈرون حملے رکوائے بغیر دونوں ملکوں کے درمیان نہ تو سٹریٹجک تعلقات بہتر ہوں گے اور نہ ہی امن کی فضا قائم ہوگی۔

# پاک امریکہ تعلقات کے نشیب فراز کی کہانی

امریکا 1923ء کے آغاز تک برصغیرِ ہند کے سیاسی مدوجزر اور مسلم قوم کے اندر اُبھرتی ہوئی جداگانہ وطن کی تحریک سے تقریباً نابلد تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس جو 1886ء میں قائم ہوئی تھی اور وہ ایک بڑی سیاسی جماعت اور مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے نظریے کے حوالے سے برطانیہ اور امریکا میں کسی قدر جانی پہچانی جاتی تھی، مگر مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیوں کا اُن کے اکابرین کو کچھ علم نہیں تھا۔ پہلی بار ایک برطانوی مصنف کلاوڈوین ٹائن نے اپنی کتاب میں لکھا کہ ''ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہر لحاظ سے ایک قوم ہیں اور حکومت کو اُنہیں ایک قوم ہی تصور کرنا چاہیے'' محمد علی جناح کا ایک لیڈر کی حیثیت سے مغرب میں اِس وقت تعارف ہوا جب اُنھوں نے 12 نومبر 1930ء میں لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور اِس کی رُوداد قائداعظم کی تصویر کے ساتھ روزنامہ ٹائمز لندن میں شائع ہوئی۔ اِس روزنامے نے اپنے تجزیے میں یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی اختلافات بہت گہرے ہیں۔ امریکی روزنامے نیویارک ٹائمز نے بابائے قوم کی پوری تقریر شائع کی جو امریکی تھنک ٹینکس میں گفتگو کا موضوع بنی۔ تقریباً دس سال بعد اِسی روزنامے نے 25 فروری 1940ء کی اشاعت میں تحریر کیا کہ مسلمان انڈین فوج کا بہترین حصہ ہیں چنانچہ برطانیہ اُن کو ناراض نہیں کر سکے گا اور اُسے اُن کے قومی جذبات کا احترام کرنا ہوگا۔ دوسال بعد اِسی روزنامے کے نمائندے بریڈٹ میتھوز نے ہندوستان کا تفصیلی دورہ کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''پاکستان کے نظریے نے مسلم لیگ کو اِس قدر مضبوط بنا دیا ہے کہ اب اگر جناح بھی چاہیں تو وہ اِس نظریے سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔'' اِن دنوں حالات غیر معمولی رفتار سے تبدیل ہو رہے تھے اور دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر برطانوی وزیراعظم چرچل اور امریکی صدر روزویلٹ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا کہ نوآبادیات کو جلد آزادی دی جائے گی۔ انگلستان میں جو انتخابات ہوئے، تو لیبر پارٹی کامیاب ہوئی اور مسٹر اٹیلی وزیراعظم چنے گئے جو چرچل کے مقابلے میں نوآبادیات کو بلاتاخیر آزادی دینے کے حق میں تھے۔

امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال مانیٹرنگ کرنا

شروع کردی تھی کہ اب برصغیر اُس کی دلچسپی کا مرکز بنتا جارہا تھا۔ اسی ضمن میں اہم امریکی سفارت کاروں نے مئی اور جولائی 1947ء کے درمیان بابائے قوم سے بڑی اہم اور دوررس اہمیت کی ملاقاتیں کیں جن کا تذکرہ مسز ایم۔ ایس کترا ومنی نے اپنی تصنیف ''پاکستان میں امریکی کردار'' میں کیا ہے۔ قائداعظم نے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے عہدے داروں کو یقین دلایا تھا کہ ایک آزاد اور خودمختار پاکستان امریکا کے مفاد میں ہوگا کیونکہ روسی جارحیت کا مسلمان متحد ہوکر مقابلہ کرسکیں گے۔ اِس بنیادی نکتے پر بھی وہ زور دیتے رہے کہ شرق اوسط کو ہندو سامراج سے محفوظ رکھنے کے لیے پاکستان کا قیام کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ انہی ملاقاتوں میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے خدوخال طے پائے۔ قائداعظم نے جولائی 1947ء کو دہلی میں پریس بریفنگ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں کہا: ''نئی ریاست تمام قوموں کی بہترین دوست ہوگی۔ ہم دنیا میں امن کے خواہاں ہیں اور اس ضمن میں ہم سے جو کچھ ہوسکا اپنا کردار ادا کریں گے۔'' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکا نئے وجود میں آنے والے پاکستان کے قریب آتا گیا۔ 7 اگست 1947ء کو پاکستان کے نامزد گورنر جنرل دہلی سے کراچی روانہ ہوئے تو انڈیا میں امریکی سفیر انہیں رخصت کرنے ائیرپورٹ پر موجود تھے۔ قائداعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے 15 اگست 1947ء کو حلف اُٹھایا تو امریکا پاکستان کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک تھا اور آزادی کی تقریبات میں شامل ہونے والا امریکی وفد سب سے بڑا تھا۔ اِس بڑھتی ہوئی قربت کے تناظر میں قائداعظم نے امریکا کی معروف صحافی مارگریٹ لورک وائٹ کو امریکا کے بارے میں جو بیان دیا تھا وہ آج بھی ایک بڑی حقیقت کا مظہر ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ''امریکا کو پاکستان کی نسبتاً زیادہ ضرورت ہے جتنی پاکستان کو امریکا کی ہے۔ پاکستان محلِ وقوع کے اعتبار سے دنیا کا محور ہے۔''

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر امریکا اور سوویت یونین سپر پاورز کے طور پر اُبھرے اور کچھ ہی عرصے بعد اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی دوڑ میں اِن کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ امریکا ''آزاد دنیا'' کے لیڈر کے طور پر پیش قدمی کر رہا تھا جبکہ روس کے گرد ایک ''آہنی پردہ'' تنا ہوا تھا اور اِس کی قیادت سوشلسٹ انقلابات کے ذریعے اشتراکی نظامِ زندگی کی ترویج کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے مشرقی یورپ کے بیشتر ممالک پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہی وہ

زمانہ تھا جب پاکستان کا قیام آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا اور بابائے قوم کو یہ بنیادی فیصلہ کرنا تھا کہ دونوں سپر طاقتوں کے درمیان ایک توازن کیسے قائم کیا جائے۔ قائداعظم صاف طور پر دیکھ رہے تھے کہ امریکا سے باہمی احترام اور انسانی آزادی کی بنیاد پر تعلقات استوار کیے جا سکتے ہیں اور نئی ریاست کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ستمبر 1946ء میں ابوالحسن اصفہانی اور بیگم ذکیہ شاہنواز کو اس مقصد سے امریکا روانہ کیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے اس زہریلے پروپیگنڈے کا موثر جواب دیں کہ مسلمان رجعت پسند ہیں اور اُن کی خواتین سیاسی عمل سے کٹی ہوئیں اور اپنے حقوق سے یکسر بے خبر ہیں۔ اُنہیں یہ ٹاسک بھی دیا گیا کہ وہ صراحت کے ساتھ یہ نکتہ بیان کریں کہ نئی ریاست میں تھیوروکریسی ہوگی نہ برداشت کا فقدان ہوگا بلکہ تمام شہریوں کو مکمل سیاسی اور مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ قائداعظم اس دوران مختلف امریکی صحافیوں سے تبادلہ خیال بھی کرتے رہے۔
انہی کوششوں کا ثمر تھا کہ جب قائداعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اُٹھایا تو امریکی صدر ٹرومین نے حسب ذیل تہنیتی پیغام دیا جو آیندہ کے تعلقات کی بنیاد بنا تھا: ٹرومین نے کہا ''میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان امریکا کی مضبوط دوستی اور خیر سگالی کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کرے گا۔ امریکی حکومت اور عوام آپ کے ملک سے طویل قریبی اور خوشگوار مراسم کی اُمید رکھتے ہیں۔ ہم آپ کی خوشی میں شامل ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ پاکستان اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے تیزی سے ترقی کرے گا۔ ہم اس امر کے منتظر ہیں کہ نیا ملک انسانی فلاح کے لیے عالمی امور میں تعمیری کردار ادا کرے گا۔''

اس پیغام کے جواب میں گورنر جنرل پاکستان نے یہ پیغام بھیجا: ''آپ نے امریکی عوام کی طرف سے دولتِ پاکستان کے نام نیک تمناؤں اور مبارک باد کا جو پُرجوش پیغام ارسال کیا ہے اس سے حکومتِ پاکستان عوام اور میں بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ ہم دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کی بہت قدر کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ امریکا اور پاکستان کے درمیان طویل قریبی اور خوشگوار تعلقات کا آغاز ہے۔''

قائداعظم نے اپنے دیرینہ قابلِ اعتماد ساتھی ابوالحسن اصفہانی کو امریکا میں سفیر نامزد کیا جنہوں نے اکتوبر 1947ء کو امریکی صدر ٹرومین کو کاغذاتِ نامزدگی پیش کیے اور پاکستان

کی معیشت کے استحکام، تعلیمی ترقی اور عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے پر زور دیا۔ اِس پر امریکی صدر نے مختلف شعبوں میں تعاون کی یقین دہانی کرائی۔نئی مملکت کے مالی حالات نہایت دگرگوں تھے۔ اِس کے پاس فوج اور سرکاری ملازمین کو تنخواہ دینے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ بھارت نے پاکستان کو ملنے والی بہت بڑی رقم روک لی تھی۔ ایسے میں نظام حیدر آباد دکن نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور جناب ابوالحسن اصفہانی نے بھی زبردست ایثار سے کام لیا۔ قائداعظم نے مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے حیدر آباد دکن کے مشہور صنعت کار میر لائق علی خاں کو اپنا خصوصی نمائندہ بنا کر امریکا روانہ کیا جنہوں نے پاکستان کی دفاعی اور انتظامی ضرورتوں کے لیے دو ارب امریکی ڈالر امداد کی باقاعدہ درخواست دی۔ وہ درخواست مسترد کر دی گئی اور محض ایک کروڑ ڈالر مہاجرین کی بحالی کے ضمن میں فراہم کیے گئے۔

اِس کے برعکس دوسری سپر پاور سوویت یونین کا طرزِ عمل شروع ہی سے مخاصمانہ تھا۔ روسی لیڈر قائداعظم کو برطانیہ کا حامی اور اپنا دشمن سیاست دان گردانتے رہے۔ روسیوں کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کا مقصد بھارت کو آزاد ہونے سے روکنا ہے۔ قیامِ پاکستان پر سوویت یونین نے نیک تمناؤں کا پیغام بھیجنے کے بجائے پاکستان کو ایک ''مصنوعی ریاست'' قرار دیا۔ اِس کے جواب میں قائداعظم نے روس کے رویے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان نے روس کی شہ پر پاکستان کے اقوامِ متحدہ کے رکن بننے کی مخالفت کی ہے۔ اُنہیں پوری طرح شرح صدر تھا کہ پاکستان جو ایک مسلمان ملک ہے اِس میں کمیونزم کی کوئی گنجائش نہیں۔ اِس یقین کے باوجود اُنہوں نے روس کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی روش اپنائی اور کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی جماعت قرار دینے سے اجتناب کیا۔ اُن کی ہدایت پر وزیرِ خارجہ سر ظفر اللہ خان اپریل 1948ء کو روس کے نائب وزیر برائے امورِ خارجہ سے ملے اور دونوں ملکوں میں سفیروں کی تعیناتی کا فیصلہ ہوا جو دیر تک تعطل کا شکار ہوتا رہا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ روس پشاور میں روسی سفارت خانے کا رابطہ دفتر کھولنے کا مطالبہ کرتا رہا تھا جو پختونستان کا ہوا کھڑا کر دینے کے باعث پاکستان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ قیامِ پاکستان کے تیرہ ماہ بعد پاکستان نے روس میں اپنا سفیر نامزد کر دیا اور تجارتی تعلقات بھی قائم کر لیے۔

روس کے معاندانہ رویوں کے باعث پاکستان کے لیے امریکا سے قریبی روابط قائم

کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ قائداعظم نے شرق اوسط میں پاکستان کا تعارف کرانے کے لیے ملک فیروز خاں نون کو مسلمان ملکوں کے دورے پر روانہ کیا۔ انہوں نے ترکی میں امریکی سفیر کو باور کرایا کہ پاکستان کے مسلمان کمیونزم کے مخالف ہیں جبکہ بھارت نے ماسکو میں وزیراعظم نہرو کی ہمشیرہ مسز پنڈت کو سفیر تعینات کر رکھا ہے۔ شدید نظریاتی اختلافات کے باعث پاکستان میں روس کا کوئی سفیر نہیں۔ اِس نہج میں پاکستان امریکا کی منڈی بن سکتا ہے اِس لیے اُس کے ساتھ مالی اور دفاعی تعاون بہت ضروری ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کی سلامتی کو روس اور بھارت کی طرف سے خطرات لاحق ہیں جنہوں نے آپس میں سیاسی گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔

امریکا اور پاکستان کے مابین چند سال بعد ایک دفاعی معاہدہ طے پایا اور کمیونزم کی یلغار کی روک تھام کے لیے سینٹو اور سیٹو کے معاہدے معرضِ وجود میں آئے جن میں پاکستان کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ بعدازاں بہت سارے نازک مرحلے بھی آئے اور پاک امریکی تعلقات میں زلزلے بھی آتے رہے جن کی جھٹکے آج بھی بڑی شدت سے محسوس ہو رہے ہیں۔ ہمیں اِن تعلقات کی ماہیت کا اگر صحیح ادراک ہو جائے تو پاکستان امریکی روابط مضبوط بنیادوں پر فروغ پا سکتے ہیں۔ جب پاکستان تشکیل کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا تو امریکا کے لیے سب سے زیادہ کشش پاکستان کی فوج میں تھی جو کمیونزم کے آگے ڈٹ جانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھی۔ اُسے پورا یقین تھا کہ پاکستان کے مسلمان اور اِس کی فوج ''آزاد دنیا'' کے بہت بڑے حلیف ثابت ہو سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے تاریخ ساز الہ آباد کے خطبے میں کہا تھا کہ ہندوستان کے اندر مسلم ریاست کے قیام سے کمیونزم کا راستہ روکا جا سکے گا۔ اِس تجزیے کی اساس پر ہم کہہ سکتے ہیں، پاکستان میں اوّلین امریکی ترجیح ہماری مسلح افواج ہیں۔ پہلے انہیں کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس کیا جاتا رہا اور اب وہ عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک نہایت اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ اِس سے بھی اہم بات یہ کہ افغانستان سے اتحادی فوجوں کے محفوظ انخلا کے لیے اُن کا تعاون کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں امریکا کی دوسری ترجیح ایٹمی عدم پھیلاؤ کو یقینی بنانا ہے۔ اُسے خطرہ ہے کہ دہشت گردوں کی رسائی جوہری ہتھیاروں تک ہو جانے کی صورت میں بہت بڑی تباہی پھیل سکتی ہے

اِس لیے پاکستان کی مسلح افواج کو اِس کام کی خصوصی تربیت دی جارہی ہے اور جنرل قدوائی گزشتہ تیرہ برسوں سے کمانڈ اینڈ کنٹرول کے انچارج چلے آرہے ہیں۔ اِس کی تیسری ترجیح شمالی وزیرستان سے اُٹھنے والی انتہاپسندی کا خاتمہ ہے۔ اِس مقصد کے لیے سی آئی اے نے اپنا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کرلیا ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ عہدے داروں نے بتایا ہے کہ صدر زرداری کے زمانے میں چار سو امریکیوں کو انٹیلی جنس کلیئرنس کے بغیر ویزے جاری ہوئے تھے جن میں ریمنڈ ڈیوس بھی شامل تھا۔ انتہاپسندی کے خاتمے کے لیے امریکا پاکستان کا نصاب تبدیل کردینا اور امریکی کلچر کو فروغ دینا ہے۔ اِس ہدف تک پہنچنے کے لیے شعبہ تعلیم اور میڈیا میں سرمایہ کاری کی جارہی ہے۔ اِس کی سب سے اہم ترجیح اِس وقت افغانستان ہے جہاں وہ بارہ سال سے شورشوں میں گھرا ہوا ہے اور ہر سال بیس ارب ڈالر سے زائد اخراجات اُٹھ رہے ہیں۔ اِس دوران جو دفاعی ڈھانچا قائم ہوا ہے، وہ ناپائیدار معلوم ہوتا ہے۔ تاہم وہاں سے اتحادی افواج کا انخلا 2014ء کے وسط سے شروع ہوجائے گا اور یہ واپسی پاکستان کی سرزمین سے ہوگی۔ فطری طور پر امریکا کی کوشش یہ ہوگی کہ پاکستان امریکی افواج کے محفوظ انخلا اور اِس کے بعد افغانستان میں امن قائم رکھنے میں بھرپور تعاون کرے۔ اِس کی پانچویں ترجیح یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں بھارت کو قائدانہ کردار سونپا جائے اور اُسے افغانستان کے معاملات میں بھی دخیل بنادیا جائے۔ نواز شریف اوباما ملاقات کا جو اعلامیہ جاری ہوا ہے، ان میں انہی ترجیحات کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔

پاکستان کے عوام امریکا کی بنیادی ترجیحات میں غالباً شامل نہیں، البتہ عالمی سطح پر یہ احساس بڑھتا جارہا ہے کہ جہالت، بھوک، افلاس، بے روزگاری اور بیماری عالمی امن کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اُن کے سدِباب کے لیے موثر عملی اقدامات کی رفتار تیز کرنا ضروری ہے، چنانچہ اقوامِ متحدہ کے مختلف ادارے انسانی فلاح و بہبود کے بہت سارے کام کررہے ہیں اور امریکا بھی اپنے طور پر کم پس ماندہ ممالک میں سماجی اور تعلیمی ترقی پر اربوں ڈالر خرچ کررہا ہے۔ کئی عشروں کے بعد اُسے احساس ہوا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں جس قدر فوج اہم ہے، اِسی قدر عوام بھی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُسے بڑی حیرت ہے کہ وہ جس ملک میں ڈالر خرچ کرتا ہے، وہاں کے عوام اُس کے خلاف ہوجاتے ہیں۔ اِس احساس کے تحت اُس نے

پاکستان کے لیے 2009ء میں کیری لوگر ایکٹ منظور کیا جس میں پہلی بار عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے فوجی امداد کے مساوی اقتصادی امداد منظور کی گئی۔ اقتصادی امداد کو این جی اوز کے ذریعے بروئے کار لانے سے ایک اور فساد برپا ہوا کہ یہ رقم پچاس فی صد سروس چارجز پر خرچ ہو گئی اور عوام کے حصے میں بہت کم آیا۔ اِس نے امریکی مخالف جذبات کو ہوا دی اور امریکی اسٹیبلشمنٹ نے بعض ایسے اقدامات کیے جن سے پاک امریکی تعلقات میں شگاف پڑتے گئے اور اُن پر نزع کا عالم طاری ہونے لگا۔ سب سے پہلے 2009ء میں دونوں ملکوں کے درمیان انٹیلی جنس شیئرنگ کا سلسلہ ٹوٹا، پھر آئی ایس آئی اور سی آئی اے میں ٹھن گئی۔ اِس کے بعد امریکی اسٹیبلشمنٹ کے ایبٹ آباد آپریشن نے پورے پاکستان میں امریکی مخالف جذبات کا ایک طوفان اُٹھا دیا تھا اور سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی فوجیوں کے حملے نے مشترکہ مفادات کی جیومیٹری نذرِ آتش کر ڈالی۔ دو سال سے پاک امریکی تعلقات غیر معمولی کشیدگی کا شکار چلے آ رہے تھے اور قطع تعلق کا ایک ہولناک سناٹا تھا۔

پاکستان کے وزیرِاعظم فقط واشنگٹن تعلقات کے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنے گئے تھے اس لیے اُنھوں نے گہرے غور و خوض کے بعد مذاکرات کا قومی ایجنڈا ترتیب دیا نہ تازہ دم ٹیم تیار کی۔ وہ تو امریکا میں سفیر نامزد کرنے میں بھی غیر ضروری لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ اُن کی سفارتی ٹیم اِس قدر کمزور ثابت ہوئی کہ جب وزیرِاعظم اقوامِ متحدہ سے خطاب کرنے نیویارک گئے تو وہ امریکی صدر سے ملاقات کا اہتمام نہ کر سکی جبکہ بھارتی وزیرِاعظم اِسی دورے میں صدر اوباما سے ملے تھے۔ ہماری وزارتِ خارجہ کی نااہلی سے جناب وزیرِاعظم کو آٹھ دس روز بعد لاکھوں ڈالرز خرچ کر کے دوبارہ امریکا جانا پڑا جبکہ ملاقات کی تاریخ بھی پہلے سے طے نہیں تھی۔ 23 اکتوبر کی دوپہر جناب نواز شریف امریکی صدر سے ملے تو یہ تاریخ دراصل برازیلی صدر کے لیے معین تھی مگر باعزت خاتون صدر نے ملاقات کے لیے آنے سے اِس لیے انکار کر دیا تھا کہ امریکا نے اُن کے فون ٹیپ کیے تھے۔ تب یہ تاریخ آخری وقت میں پاکستانی وزیرِاعظم کے لیے مقرر ہوئی۔ اس ملاقات میں ڈرون حملوں کے بارے میں صاف جواب مل گیا کہ وہ بند نہیں کیے جا سکتے کیونکہ وہ دہشت گردی کے خلاف ایک محفوظ ہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کے تنازع میں ثالثی سے بھی معذرت کر لی گئی۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی

رہائی کے جواب میں شکیل آفریدی کا مسئلہ اُٹھایا گیا جو امریکا کے نزدیک ایک ہیرو کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اِس کے علاوہ مطالبہ کیا گیا کہ ممبئی دہشت گردی میں ملوث جماعت الدعوۃ پر پابندی لگائی جائے اور جناب حافظ محمد سعید گرفتار کیے جائیں۔

وزیراعظم کے امریکی دورے سے یہ تاثر ملا کہ اوباما انتظامیہ پاکستان پر بھارت کا نقطہ نظر ٹھونسنا چاہتی ہے۔ ممبئی میں دہشت گردی سرحدوں کے پار عسکریت پسندی، جناب حافظ محمد سعید کی گرفتاری اور جماعت الدعوۃ پر پابندی یہ وہ مطالبات ہیں جو بھارت سالہا سال سے کرتا آیا ہے اور بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے صدر اوباما سے ملاقات کے دوران بھی دہرائے تھے۔ دراصل امریکا کے لیے پاکستان کی غیر معمولی اہمیت کے باوجود اُس نے نئی ریاست کی شدید مشکلات کے ابتدائی مرحلے میں بھی دستگیری کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ وزیرِ خزانہ ملک غلام محمد نے دفاعی اور انتظامی ضرورتوں کے لیے جب دو ارب ڈالر امداد کے لیے باقاعدہ درخواست دی تو وہ مسترد کردی گئی اور صرف دس ملین ڈالر مہاجرین کی بحالی کے لیے فراہم کیے گئے جبکہ ساٹھ ستر لاکھ کے لگ بھگ لٹے پٹے خاندان قافلوں کی صورت میں آرہے تھے اور پاکستان کی معیشت ڈگمگا رہی تھی۔ 1948ء میں کشمیر کے مسئلے پر بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ بھڑک اُٹھی، تو پاکستان کی طرف سے امریکی حمایت حاصل کرنے کی کوشش ہوئی لیکن اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اُس پر کئی پابندیاں عائد کردی گئی تھیں۔

ایک بڑا ملک ہونے کی حیثیت سے بھارت امریکی خارجہ پالیسی میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ 1962ء میں چین اور بھارت کے مابین جنگ ہوئی تو امریکا نے بھارت میں اسلحے کے انبار لگا دیے۔ صدر ایوب خاں نے اِس امر پر شدید احتجاج کیا اور امریکا پر الزام لگایا کہ اُس نے خطے میں طاقت کا توازن بگاڑ دیا ہے۔ اِسی حساس مسئلے پر اُن کے امریکا سے تعلقات بگڑنا شروع ہوئے پھر 1965ء کی جنگ نے معاملہ اور زیادہ بگاڑ دیا۔ امریکا نے پاکستانی فوج کو اسلحہ کمیونزم کے خلاف لڑنے کے لیے دیا تھا اور جب وہ بھارت کے خلاف استعمال ہوا تو وہ بہت سیخ پا ہوا۔ اُس نے گھمسان کی جنگ کے دوران پاکستان کو اسلحے کی سپلائی بند کردی اور اُسے فائر بندی قبول کرنا پڑی۔ جنگ کے خاتمے پر صدر ایوب خاں واشنگٹن گئے تو امریکی صدر نے اُن سے بڑی بے دلی سے دو انگلیاں ملائیں اور سارا معاملہ روس کے سپرد

دیا۔ 1971ء میں وہ مشرقی پاکستان میں داخلی بغاوت کے باعث پاکستان کے کام نہ آسکا لیکن سقوط مشرقی پاکستان کے بعد اندرا گاندھی مغربی پاکستان کو بھی زیر کرلینا چاہتی تھی، تب صدر نکسن نے روس کے ذریعے بھارت کو یہ پیغام پہنچایا کہ امریکا پاکستان کو پورا تحفظ فراہم کرے گا اس دھمکی کے بعد سیز فائر کا اعلان ہوا۔ نوے کی دہائی تک امریکا بھارت پر پاکستان کو ترجیح دیتا رہا لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بل کلنٹن نے بھارت میں چھ روز اور اسلام آباد میں صرف چھ گھنٹے قیام کیا۔ صدر اوباما نے دونوں ملکوں کو برابر کی اہمیت دینے کی روایت کو بری طرح پامال کرتے ہوئے بھارت کا دورہ کیا مگر پاکستان کو وعدہ فردا پر ٹرخا دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ امریکا جو انسانی آزادیوں اور جمہوری قدروں کا محافظ تھا اب ایک استعماری طاقت کے طور پر دنیا بھر کی تنقید کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اس کی خارجہ پالیسی سے توازن اور گہرائی کے بجائے فریب دہی، خونخواری اور شہنشاہیت کی بو آرہی ہے۔

## پاکستان کا تعلیمی نظام، نصاب میں تبدیلی کی امریکی کوششیں

ذیل میں دیے گئے مختصر پس منظر کے بعد ہم نے پاکستان میں رائج نظام تعلیم کی فعالیت اور ان عوامل کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جو پاکستان میں شرح تعلیم میں اضافے کی راہ میں رکاوٹ تصور کیے جاتے ہیں۔ نیز مغرب کی ہمارے تعلیمی نصاب میں دلچسپی کی وجوہات کیا ہیں؟۔ پاکستان میں کیا پڑھایا جاتا ہے اور کیسے پڑھایا جاتا ہے؟ اس کا بھی مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ ان موضوعات کے حوالے سے پاکستان اور امریکی نظام تعلیم کا مختصر اجمالی جائزہ بھی لیا گیا۔ نیز سٹیفن فلپ کوہن کے پاکستانی نظام تعلیم اور ڈاکٹر شاہد مسعود کے امریکی نظام تعلیم پر مختصر تبصروں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے کہ امریکہ پاکستان میں تعلیمی اداروں سے کس قسم کے گریجوایٹس کا خواہاں ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جس کا تشخص اسلامی ہے۔ اس کی تاریخ کئی صدیاں پرانی ہے۔ کسی نظریے کے تحت وجود میں آنے والی ریاست ایک مخصوص نظام العمل کی حامل ہوتی ہے اور اسے بقاء کے لیے اپنے شہریوں کو ایک خاص سانچے میں ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے جو جذبہ حب الوطنی پر مبنی ہوتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے الگ وطن کے

لیے جس سیاسی جماعت کو تشکیل دیا بانی پاکستان اگرچہ اس میں قیام کے سات سال بعد 1913 میں شامل ہوئے لیکن اسے ایک موثر اور مسلمانوں کی ترجمان جماعت بنانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ میں ان کے بولے ہوئے ایک مشہور جملے "پاکستان اسی دن معرض وجود میں آگیا تھا جس دن پہلا مسلمان برصغیر میں داخل ہوا تھا" سے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک الگ وطن کی جدوجہد کیلئے نئی روح پھونک دی تھی۔

برصغیر کے مسلمانوں میں الگ وطن کا خیال ابھی عام نہیں ہوا تھا جب 1916 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر قائداعظم کو چن لیا گیا تھا۔ پاکستان میں سرکاری اور عوامی سطح پر تصور پاکستان کا خالق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو تسلیم کیا جاتا ہے جن کا تعلق پاکستان کے مردم خیز خطے سیالکوٹ سے تھا۔ باقی حوالے زیادہ معتبر تصور نہیں کیے جاتے کیوں کہ ان کے خالق غیر معروف افراد تھے۔ پاکستان 1947 کو معرض وجود میں آیا تو اس وقت اسے بے شمار مسائل کا سامنا تھا جن کا ذکر کتاب کے ابتدائی حصے میں کیا گیا ہے۔ اس باب میں ہمارا موضوع پاکستان میں تعلیمی نصاب میں تبدیلی کی امریکی کوششوں پر روشنی ڈالنا ہے اور تھوڑی حد تک پاکستان کے انحطاط پذیر ہوتے ہوئے نظام تعلیم کی خامیوں کی نشاندہی کرنا ہے جن کو قیام پاکستان کے فوری بعد ختم کردینا چاہیے تھا۔ یہ درست ہے کہ پاکستان کو ان پڑھ طبقے سے نہیں بلکہ پڑھے لکھے طبقے سے زیادہ خطرہ ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ پاکستان کو پڑھے لکھے لوگوں نے زیادہ نقصان پہنچایا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس کی ترقی تعلیم یافتہ افرد کے ہی مرہون منت ہے۔ قیام پاکستان کے پہلے عشرے میں بائیں بازو کے ترقی پسندوں نے ملکی سیاست میں کافی ہلچل پیدا کی جبکہ مذہبی طبقہ 1953 کے احمدی مخالف تحریک کے نتیجے میں ہنگاموں کے بعد حکومت کے زیرعتاب تھا۔ پاکستان کے ترقی پسند خصوصاً پاکستان کیمونسٹ پارٹی کی قیادت کو پابند سلاسل کرنے کے بعد ملک پر فوجی اسٹیبلشمنٹ ایک بالادست قوت کے طور پر چھا چکی تو ماضی کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے امن وامان اور ملکی سلامتی کے نام پر ایسے امتیازی قوانین بنائے گئے جو ایوبی حکومت کے اقتدار کو طول دینے میں ممد ومعاون تو ثابت ہوئے لیکن وفاقی اکائیوں کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوگئی جو علیحدگی پسندی کے جذبات میں اضافے کا باعث بنے۔

# پاکستان کا نظام تعلیم

پاکستان کا تعلیمی نظام اس حد تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے کہ اس کی مرمت تقریباً ناممکن ہو چکی ہے۔ وسائل کی کمی یا فراوانی تو بعد کی بات ہے، کوئی ان مسائل کے حل کی طرف مائل نظر نہیں آتا۔ 1947 میں پاکستان کی پہلی تعلیمی کانفرنس میں سفارش پیش کی گئی کہ پرائمری تعلیم کو ملک گیر سطح پر عام کیا جائے اور اس کا معیار بہتر بنایا جائے۔ لیکن اس وقت مواصلات، ریلوے، پانی و بجلی اور دفاع جیسے مسائل پر وسائل خرچ کرنے کو زیادہ اہم تصور کیا گیا۔ تعلیم اور صحت پر کم توجہ دی گئی حتیٰ کہ نصف صدی تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ لیکن سرکاری سطح پر جو اعداد و شمار دیے گئے ان کے مطابق بعد ازاں تعلیمی اخراجات میں سے 32 فیصد کے بجائے 52 فیصد پرائمری اور اس سے نیچے کی سطح پر خرچ کرنے کے لیے مختص کیے گئے جبکہ یہ حکومتی دعویٰ حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ 1990 کی دہائی میں جو سکول قائم کیے گئے ان میں سے اکثر ''بھوت سکول'' ثابت ہوئے۔ عمارت، اساتذہ اور طلبہ و طالبات کا وجود تک نہ تھا۔ 'آکس فیم' کی ایک رپورٹ کے مطابق 1995 میں جنوبی ایشیا کے ان بچوں کے 27 فیصد کا تعلق پاکستان سے تھا جنہوں نے سکول کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔ اس وقت یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ چند برسوں میں یہ تعداد 40 فیصد ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں کسی کو فکر نہ تھی کہ زوال پذیر تعلیمی نظام مقابلے کی عالمی فضا میں پاکستان کی کمزوری کا باعث بن رہا تھا۔

2002/3 میں حکومت نے تعلیم کے لیے مختص کی جانے والی رقم میں 80 فیصد اضافہ کر دیا اور یہ رقم 3 ارب 10 کروڑ روپے تھی۔ اس کا مقصد سکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد بڑھانا اور خوراک کے امدادی پروگرام کے معیار کو بہتر بنانا تھا۔ اس کا ہدف غربت زدہ اضلاع میں 5300 پرائمری سکول قائم کرنا تھا جہاں 5 لاکھ بچیاں تعلیم حاصل کر سکیں۔ معلوم نہیں اس منصوبے کا کیا بنا تھا۔ کیونکہ پاکستان میں اس طرح کے منصوبے عموماً انتظامی بد دیانتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں کم از کم چار قسم کے پرائمری اور ثانوی تعلیمی ادارے پائے جاتے ہیں جو مختلف النوع کے گریجوایٹس پیدا کر رہے ہیں۔ ان میں روایتی دینی مدارس جن میں سے کئی ایک کی بنیاد کئی سو سال پرانی ہے۔ دوسرے چند مشنری اور نجی سکول جو نو آبادیاتی دور میں

کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائی فرقوں نے قائم کیے۔ ان کو ذوالفقار علی بھٹو نے 1972 قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ کچھ کو نواز شریف کی دوسری حکومت میں نجی شعبے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس قسم میں قابل رشک شہرت کے حامل ادارے بھی موجود ہیں جن میں ایچیسن، لارنس، فارمین کرسچین اور کینرڈ کالج جو خواتین کا قابل ذکر ادارہ ہے شامل کیے جا سکتے ہیں۔ کچھ ایسے ادارے بھی بنائے گئے جو قبائلیوں کے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لیے قائم تھے۔ بنیادی طور پر یہ اسٹیبلشمنٹ کے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔

پاکستان میں 85,000 سے زائد سرکاری سکول بھی پائے جاتے ہیں جن کو مختلف صوبائی محکمے چلاتے ہیں۔ ان میں 65,000 دیہی سکول ہیں جن میں 1,86,000 اساتذہ ملازمت کرتے ہیں۔ ان اساتذہ کی، تربیتی ادارے ہونے کے باوجود، تقریباً ایک چوتھائی تعداد تربیت یافتہ نہیں ہے ان کو بہت کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ پاکستان کے ایک معروف دانشور کا یہ قول غلط نہیں کہ "پاکستان کے پرائمری اور دیہی سکول ان لوگوں کی آخری پناہ گاہ ہیں جن کو کوئی دوسری ملازمت نہیں ملتی"۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں پائے جانے والے دیہی اور شہری علاقوں کے پبلک سکولوں میں بھی اہم فرق موجود پایا گیا۔ بلوچستان میں بچیوں کا اندراج 18 فیصد ہے جبکہ پنجاب میں لڑکوں کے اندراج کا تناسب 81 فیصد ہے۔

پاکستان کے مختلف تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے مختلف مزاج کے مالک ہیں جو معاشرے کی تقسیم کا سبب بن رہے ہیں۔ مدارس کے گریجوایٹس اور پرومغرب اشرافیہ کی سوچ میں پائی جانے والی خلیج سے محسوس ہوتا ہے کہ دونوں مختلف دو دنیاؤں کے باسی ہیں۔ انگریزی میڈیم اداروں سے تعلیم مکمل کرنے والے اپنی ثقافت سے کٹ جاتے ہیں۔ وہ اردو میڈیم تعلیمی اداروں اور مدارس سے پڑھنے والے اپنے ہم وطنوں کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ایک اور بات جو زیادہ معقول نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کا تعلیمی نظام نسل در نسل ایسے جوان پیدا کر رہا ہے جن کی تربیت ناقص ہے اور جنہیں بمشکل پڑھا لکھا کہا جا سکتا ہے۔ تعلیمی اداروں سے نکل کر وہ قصبوں اور شہروں کا رخ کرتے ہیں جہاں انہیں ایک وسعت پزیر اور ترغیبی عوامی ثقافت تو مل جاتی ہے لیکن نوکری نہیں ملتی۔ یہی حال ان لاکھوں جوان لڑکیوں کا ہے جو سنجیدہ تعلیم کے حصول میں ناکام اور رسمی افرادی قوت سے منہا ہونے کے بعد شادی کے

بندھن میں بندھ جاتی ہیں۔ پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں ایسے تعلیمی نظام کے ساتھ عورتوں کے کردار کے حوالے سے ایک روایتی سوچ وابستہ ہے۔ یہ اسی نظام کا اثر ہے کہ پاکستان کی 25 فیصد سے بھی کم افرادی قوت خواندہ ہے جو صنعت کاروں اور غیر ملکی کمپنیوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے جو پاکستان کے اندر سرمایہ کاری سے کتراتی ہیں۔

پاکستان کے زمیندار دولت مند طبقے کو عامتہ الناس کی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اسی لیے پسماندہ کھیت مزدوروں کی تعداد میں اضافہ روز افزوں ہے جو زمیندار کو سستی لیبر کی دستیابی کا باعث بنتے ہیں۔ نہ ہی مذہبی شخصیات نے عوام کی تعلیم کو فائدہ مند سمجھا۔ ان کی توجہ مدارس تک محدود رہی جنہوں نے علماء پیدا کیے۔ ان مدارس کو ریاضی، سائنس اور دیگر علوم کی معیاری تعلیم کے حوالے سے قابل قدر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پاکستان کے کاروباری طبقے نے بھی تعلیم یافتہ افرادی قوت کی ضرورت محسوس نہ کی جو اپنے آپ کو تغیر پذیر پیداواری ضروریات کے مطابق ڈھال سکتی ہو، کیونکہ کمپنیاں اپنے لیے کوئی ویژن ہی نہیں رکھتی تھیں۔ ویسے بھی افرادی قوت اگر تعلیم یافتہ ہو تو اپنے حقوق سے آگاہ رہتی ہے۔ اس طرح لیبر کے انتظامی مسائل ابھرتے ہیں۔ فوج نے اپنی یہ ضرورت ''آرمی ایجوکیشن کور'' بنا کر پوری کر لی۔ زیادہ تر سیاستدان جاگیردارانہ پس منظر کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ عوامی تعلیم پر پانی تک رسائی، زرعی اجناس کے نرخوں، نسلی و لسانی مطالبات اور (ماضی قریب سے) فرقہ وارانہ تنازعات کو ترجیح دیتے ہیں۔

جن اداروں میں میٹرک کے بعد داخلہ لیا جاتا ہے، یعنی کالجز وہاں طلباء کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ جبکہ ایران کی کل آبادی پاکستان کی آبادی کا نصف ہے۔ اس سطح پر ایرانی طلباء کی تعداد 7000,000 ہے۔ بنگلہ دیش کے کالجوں میں: 878,537 ترکی میں 607,388 اور بھارت کے کالجوں میں 9,404,460 طلباء و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ پاکستان میں طلباء کالجوں میں جعلی اسناد دکھا کر داخلہ حاصل کر لیتے ہیں۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ مطالعہ پاکستان کے 30 میں سے 18 طالب علموں کی اسناد جعلی ثابت ہوئیں۔

1980ء کی دہائی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی وزارت کی ایک سکیم کے تحت انہیں

سائنسی اور تکنیکی میدانوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے بیرون ملک بھیجنے کا پروگرام بنایا گیا۔ نامزد کردہ طلباء میں سے کئی پہلے ہی پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے جونیئر سٹاف میں شامل تھے لیکن وہ دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے مغربی سکولوں میں بھی داخلہ حاصل نہ کر سکے۔ امریکہ بھیجنے کے لئے 171 طلباء کو نامزد کیا گیا تھا۔ جبکہ ان میں سے صرف 21 ڈگریاں حاصل کر سکے۔ ان 21 میں سے بھی 7 ایسے تھے جنہوں نے مقررہ مدت یعنی 4 سال میں ڈگری حاصل کی۔ بالآخر یہ سکیم منسوخ کر دی گئی۔ مختصر رپورٹس اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یونیورسٹی کی بنیادی تعلیم کا معیار شدید انحطاط کا شکار ہے اور پاکستان کے اندر ادب، انگریزی اور معاشرتی سائنسز کے اساتذہ کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ٹیلنٹ تیزی سے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ جس نے پاکستان کو دیگر مسلمان ملکوں کے مقابلے میں ممتاز اور منفرد بنا رکھا تھا۔

تعلیمی اخراجات کا 76 فیصد بیرونی ممالک برداشت کرتے ہیں، پھر بھی تعلیم کے تناظر میں پاکستان 15 بدترین ملکوں میں شامل ہے۔ اشرافیہ کے لئے تعلیم کا حصول کوئی مسئلہ نہیں۔ اشرافیہ کے ارکان ان اداروں کا انتخاب کر سکتے ہیں جو صرف امراء کو دستیاب ہیں۔ ان کے پاس دوسرا متبادل غیر ملکی تعلیم ہے۔ جہاں تک پُرعزیمت نچلے متوسط طبقوں کا تعلق ہے، انہیں فوجی سکول، تیز رفتاری سے وسعت پذیر نیم فوجی فورسز اور پولیس تعلیم اور کیریئر بنانے کے لئے راستہ مہیا کرتی ہیں۔

''چاہئے تو یہ تھا کہ لوگوں کو ایسے ہنر سکھائے جاتے جو انہیں اپنی بقاء اور زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی کے حصول کے لئے درکار تھے۔ یا جو انہیں تقدیر پرشاکر رہنے اور ضعیف الاعتقاد ہو جانے سے باز رکھنے میں ممد ثابت ہو سکتے لیکن انہیں کیا دیا گیا۔؟ ان کے ہاتھ میں کیا تھمایا گیا۔؟ وہ تھیں غیر معیاری ڈگریاں جنہیں وصول کرنے کے بعد وہ شہروں میں درمیانے درجے کی ملازمتوں کے متلاشی بن گئے۔ اگر آپ پاکستان کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ریاستی ایجنڈا کیا تھا۔ مطالعہ پاکستان اردو زبان کی نصابی کتب کے توسط سے ایک ایسا وطن پرست پاکستانی تخلیق کرتا ہے جو گروہی شناخت کی مخالفت کرے۔ مذہبی لابی کا اپنا ایک الگ ایجنڈا ہے۔ وہ مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے مدرسوں کو آپریٹ کرتے وقت وہ مقصد اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ مغرب سے حد درجہ متاثر اشرافیہ کے

ارکان انگریزی زبان میں مغرب کے نصاب پڑھنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ دیگر پاکستانیوں پر حقارت کی نظر ڈال سکیں اور یا پھر اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائیں"۔ بحرکیف قیام پاکستان کے بعد جناح اور اقبال کے ان بیانات کو قومی داخلہ اور خارجہ پالیسی کا مرکزی محور تصور کیا گیا جو اسلامی اصولوں سے ماخوذ تھے اور قومی وحدت کی تشکیل میں بنیادی تصورات سے مماثلت رکھتے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی اخراجات کا 76 فیصد بیرونی ممالک برداشت کرتے ہیں۔ ان میں امریکہ کی طرف سے دی جانے والی امداد کا ''امریکی امداد کے بغیر پاکستان کی بقاء ممکن ہے'' کے باب میں تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہم جائزہ لیں گے کہ وہ کون سی چیز ہے جو ہم بچوں کو پڑھاتے ہیں اور مغرب اسے تبدیل کرنا چاہتا ہے۔

## پاک و ہند کی مبہم نصابی کتب اور تاریخ

ہمارے سکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب میں ایسا کیا غلط ہے جسے تبدیل کیا جانا ضروری ہے اور اس کے مضمرات کیا ہوتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ادارے اور روایات حالات و ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور وقت کے تقاضوں کے تحت یہ بدلتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے تاریخ ان لوگوں کے لئے ایک خطرناک چیلنج بن جاتی ہے جو کہ صاحب اقتدار ہوتے ہیں اور مستحکم اداروں کے ذریعے اپنی مراعات اور پوزیشنوں کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہر حکمران ہمیشہ تاریخ کو نظریات کے ایسے فریم ورک میں رکھتا ہے جہاں انہیں چیلنج کیا جا سکے اور ایک ایسے ماضی کی تشکیل چاہتا ہے جو کہ اس کے حق میں ہو۔ یہ بات طے ہے کہ تاریخ کو جب بھی کسی نظریاتی ڈھانچے میں لکھا جاتا ہے، واقعات کی جوڑ توڑ اور تاریخ کی غلط تعبیر و تفصیل لازمی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ہندتو انظریے کا بانی پی ڈی سرداکر جو کہ 1966ء میں فوت ہوا لکھتا ہے کہ ایک ہندو وہ ہے جو کہ بھارت ورش کی سرزمین کو جو کہ دریائے سندھ سے لے کر مشرق تک پھیلی ہوئی ہے اپنا وطن سمجھے۔ ساتھ ہی ہندو ہونے کے لئے یہ سرزمین مقدس بھی ہونی چاہئے۔ اس کے لئے جس میں اس کی مذہبی پرورش بھی ہو اور اسے پروان چڑھائے۔

چنانچہ ہندوتو انظریہ کے مطابق ہندو صرف وہ ہوا جس کے لئے ہندوستان وطنی بھومی ہو یعنی آباؤ اجداد کی سرزمین ہو۔ اس نظریے کے مطابق مسلمانوں اور عیسائی سرزمین ہندوستان سے لا تعلق ہو جاتے ہیں اور یہ ہندوستان سے وفادار نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی مقدس سرزمین ہندوستان کی سرحدوں سے باہر ہے۔ اس نظریے میں کمزوری اس وقت آئی جب یہ نقطہ اٹھایا گیا کہ ہندوؤں کی اکثریت کا تعلق جن آریاؤں سے تھا وہ بھی تو مقامی نہیں تھے اور ہجرت کر کے یا حملہ آور ہو کر یہاں آئے تھے تو ہندوتو انظریے کے مورخین نے یہ دلیل پیش کی کہ درحقیقت آریا بیرونی حملہ آور نہیں تھے بلکہ یہاں کے مقامی باشندے تھے جو یہاں سے ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں چلے گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آریاؤں کی تاریخ جس کا ذکر ہم اور وہ سنتے ہیں وہ انگریز نے 19ویں صدی میں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے شروع کی تا کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کو الگ الگ رکھ کر آریاؤں اور دراوڑوں میں اختلافات پیدا کئے جا سکیں۔ چنانچہ ہندوتوا کے اس نظریے کے تحت اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمان ہندوستانی نہیں تو منطقی طور پر ان کے ادوار حکومت غیر ملکی تسلط بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ جو بھی ثقافتی یا مذہبی ورثہ وہاں چھوڑ آئے وہ ہندوستان کے لئے باعث فخر نہیں باعث شرم ہو گا۔ چنانچہ یا تو انہیں مسمار کر دینا چاہئے جیسا کہ بابری مسجد کے ساتھ ہوا اور دوسری صورت یہ ہے کہ انہیں مندر بنا لیا جائے جیسا کہ تاج محل کے سلسلے میں بھی ایک طبقے کا یہ خیال ہے کہ یہ شاہ جہان کے دورے سے بہت پہلے کا ایک مندر تھا۔

ہندوستان میں تاریخ اور نصابی کتب کے سلسلے میں کئی بار اس وقت کوشش کی گئی تھی جب جنتا دل کی حکومت آئی تھی۔ اس وقت پرکاش نارائن وزیر اعظم بنے تھے اور اس کے بعد اب بی جے پی نے اپنے دور حکومت میں نصاب تعلیم میں بڑی حد تک ہندوتوا کے تحت بدلنے کی کوشش کی اور وہاں کے حکمرانوں کا موقف یہ ہے کہ اب تک کی تاریخ جو وہاں لکھی گئی اس پر دائیں بازوں کے مورخین کی اجارہ داری تھی جنہوں نے تاریخ نویسی کو اپنے کنٹرول میں لے رکھا تھا۔ بی جے پی کے جوشی منوہر لال نے ان مورخین کو دہشت گرد قرار دیتے ہوئے نوجوان کے ذہنوں کے بگاڑ کا سبب قرار دیا۔ ہندوستان میں تاریخ کو دوبارہ لکھنے میں جو مسائل بحث کا باعث بنے ان میں سے ایک یہ تھا کہ کیا قدیم ہندوستان کے لوگ گائے کا گوشت کھاتے

تھے؟۔لبرل مورخین کا کہنا ہے کہ ابتدائی دور میں آریا جو خانہ بدوش قبائل تھے مویشی پالتے تھے اور چراگاہوں کی تلاش میں جگہ جگہ گھوما کرتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں وہ گائے کا گوشت کھاتے تھے۔لیکن بعد میں جب وہ زراعتی معاشرے میں تبدیل ہوئے تو گائے ان کے لئے اہم ہوگئی اور انہوں نے اس کا تحفظ شروع کردیا چنانچہ ارتقائی تاریخی عمل میں مذہبی رسم ورواج یہاں پر جنم لیتے ہیں۔

بی جے پی کے موقف کے مطابق نصاب میں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ کبھی ہندوستان کے باشندے گائے گوشت کھایا کرتے تھے۔اس سے موجودہ دور کے لوگوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔ پھر ہندوستان کی نصابی کتابوں میں ان تاریخی واقعات کا تذکرہ بھی بحث کا سبب بنا رہا جو کہ مختلف گروہوں کے درمیان جذبات کے اشتعال کا باعث تھے۔مثلاً سکھوں کے گرو دیو بہادر جنہیں پارسی ماخذوں میں لیٹرا اور ڈاکو کہا گیا ہے اور اس کی بنیاد پر اور نگزیب عالم گیر کے ہاتھوں اس کا قتل درست تھا، کے بارے میں سکھوں کی روایت ہے کہ ان کے قتل کے پیچھے ان کے اپنے خاندان کے سازش تھی جو انہیں گرو کے منصب پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔اسی طرح جاٹوں کا مسئلہ ہے جنہوں نے خاص طور پر 18 ویں صدی میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔اب جاٹوں کو وہاں ہرگز یہ بات قابل قبول نہیں کہ تاریخ میں یا کتابوں میں ان کے منفی کردار کو ابھارا جائے۔ چنانچہ یہ ہماری بھی نصابی کتابوں سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔

دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر کرشن کمار نے تحریک آزادی کے واقعات پر کافی بحث کی کہ کس طرح پاکستان اور ہندوستان کی نصاب کی کتابوں میں مختلف نقطہ ہائے نظر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کرشن کمار اپنی کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ایک طالب علم کے لئے اس کا خاندان ہوتا ہے جہاں وہ بڑوں سے کہانیاں سنتا ہے۔ جس سے اس کے ذہن میں ماضی کا تصور بنتا ہے۔ کرشن کمار اس عمل کو خاموش علم کہتے ہیں۔اس علم کے ذریعے بچے کو رسومات شخصیات اور ان کے کارناموں اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں بتا یا جاتا ہے جو کہ اس کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں پھر ایک سرکاری علم ہوتا ہے جو بچے کو نصابی کتب سے ملتا ہے۔ یہ علم سرکاری نقطہ نظر رکھتے ہوئے اس

کتاب کی تخلیق کرتا ہے کہ طالب علم کا تصادم ہوتا ہے تو طالب کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس سچائی کو تسلیم کرے۔ تاہم انہیں سرکاری علم کے آگے ہتھیار ڈالنے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں امتحان پاس کرنا ہوتا ہے، ڈگری لینی ہوتی ہے، جو سوال پوچھا جائے ان کا جواب نصابی کتابوں کے مفہوم میں ہی دینا ضروری ہوتا ہے، اس سلسلے میں قطعاً اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ کوئی یہ لکھ سکے کہ نصاب کے مواد سے اختلاف ہے یا وہ باہر کے آزاد ذرائع کے نقطہ نظر کو جواب میں شامل کر سکے۔

پاکستان اور ہندوستان دونوں کی نصابی کتب میں 1857ء کی جنگ آزادی، سرسید احمد خان اور ان کے سیاسی خیالات، 1905ء کی تقسیم بنگال اور قیام مسلم لیگ سمیت دیگر اہم نقاط پر متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی کتابوں میں یہ کہیں موجود نہیں کہ مسلمانوں کو آخر ایک علیحدہ قوم ہونے کا احساس کیوں پیدا ہوا اور پاکستان کی نصابی کتب قوم پرست مسلمانوں کے بارے میں خاموشی ہے۔ کرشن کمار نئی دہلی میں لکھتے ہیں کہ بحیثیت استاد انہیں عجیب صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً وہ جب اپنے طلباء کو یہ بتاتے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے تو طلباء ان سے پوچھتے کہ ہندوستان کو ایک ہندو ریاست کیوں نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جب طلباء کو بتایا جاتا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے جہاں پر ایک کلچر نہیں بلکہ کئی کلچرز ہیں تو ان کا سوال یہ ہوتا کہ پھر تقسیم کیونکر ہوئی؟۔ کیا ہم اپنی تاریخ، اپنے نظریات کے مطابق بچوں کو بیان کرنے کا حق نہیں رکھتے اور کیا دنیا کے ہر ملک کی نصابی کتب اسی اصول کے تحت نہیں لکھی جاتیں۔ کیا تاریخ کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ یہ سوال پاکستان میں بھی دبے لفظوں پوچھا جاتا ہے کہ اگر پاکستان کے قیام کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست تھا جہاں وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزار سکیں تو بھارت میں اتنے ہی مسلمان پیچھے کیوں رہ گئے تھے جو ہندوستان میں ایک ہندو اکثریت کے زیر عتاب مظلوم اقلیت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

## ہمارا تعلیمی نصاب تبدیل کرنے والوں کے نصاب کی کہانی

پاکستان میں اول جماعت سے انٹر تک پڑھایا جانے والے تعلیمی نصاب پر ماضی

میں ایک غیر سرکاری تنظیم ایک متنازعہ رپورٹ منظر عام پر لائی جس کا جائزہ لینے کے لیے وزارت تعلیم نے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی۔ رپورٹ کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ پاکستانی سکولوں میں رائج نصاب اور درسی کتب سے جہاد اور دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دنیا کی محبوب قوموں یعنی اسرائیل، بھارت اور برطانیہ پر وہ کچھ لکھا گیا جس سے عالمی امن کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اسلامیات کی تدریس کے ذریعے اقلیتوں کے حقوق غصب کرنے کا بھی اس رپورٹ میں ذکر تھا۔

اسی دوران ایک اخباری اطلاع کے مطابق اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں نصب تعلیم سے جہاد، مینار پاکستان، 1971ء یا 1965ء کی جنگوں کے شہداء کے تذکرے، بھارت سے ممکنہ نفرت پیدا کرنے والے مضامین، اثاثوں کی تقسیم، مسلمانوں کے قتل عام سمیت پاکستان سے متعلق تمام موضوعات کو ختم کرنے کی سفارش کی اور اسی دوران نصاب سے منسلک تمام تعلیمی اداروں کو فاؤنڈیشن سے منسلک کرنے کا بھی اعلان کیا گیا۔ لیکن پاکستان کے عوام کی اکثریت نے اس رپورٹ اور اس کے نتیجے میں اٹھائے جانے والے اقدامات کو مسترد کر دیا۔ اس رپورٹ کی تیاری میں دانشوروں کا وہ نام نہاد طبقہ پیش پیش تھا جن کے فکر و دانش کی جڑیں کسی زمانے میں ماسکو میں پیوست تھیں اور پاکستان کے مسائل کا "نسخہ کیمیا" یہ حضرات وہیں سے امپورٹ کرتے تھے۔ آج وہی آزاد خیال لبرل طبقہ امریکہ کو اس لبرل ازم کا نمونہ قرار دیتا ہے جس کی مخالفت سے ان کا روزگار چلتا تھا۔ لیکن ایسے دانشوروں نے خود امریکی نصاب تعلیم پر کبھی تنقید نہیں کی۔

خود امریکہ کی نصابی کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو سب زیادہ جو چیز متاثر کرتی ہے وہ پرانی اور نئی دنیا کا فرق ہے۔ وہ اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پرانی دنیا زوال پذیر فرسودہ اور گناہوں سے آلودہ ہو چکی تھی جبکہ نئی دنیا پاک وصاف شفاف اور نئی امیدوں کے ساتھ ابھری ہے۔ چنانچہ امریکہ کے سکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں میں یہ بات ثابت کی جاتی ہے کہ امریکہ امیدوں اور توقعات کی سرزمین ہے اور خوابوں کی وہ تعبیر ہے جسے دنیا ایک عرصے سے دیکھ رہی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں بادشاہت نہیں تھی، امراء کا اقتدار نہیں تھا اور یہاں افراد کا تاریخی کردار ہے جنہوں نے اپنی محنت اور مشقت سے اپنی دنیا تعمیر کی۔

چنانچہ یہ تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے مختلف ہے اور اسی طرح حب الوطنی اور قوم پرستی کے وہ گہرے جذبات پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے کہ امریکی خود کو باقی اقوام سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ جب بھی کسی شخص کو ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے تو سب سے پہلے اسے عام لوگوں سے مختلف ثابت کیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہیرو میں انسانی کمزوریاں نہیں ہوتیں۔ مثلاً مشہور نابینا خاتون ہیلن کیلر کا ذکر اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ایک اندھی، بہری اور گونگی خاتون تھیں جنہوں نے جسمانی نقائص کے باوجود تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں بھرپور مقام حاصل کیا۔ ہیلن کیلر کی زندگی کے اس حصے کو مکمل طور پر چھپا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک مکمل انقلابی سوشلسٹ تھی جو 1909ء میں سوشلسٹ پارٹی سے منسلک ہو چکی تھی چنانچہ اس نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ جسمانی نقائص کی اہم ترین وجہ غربت اور غذا کی کمی ہوتی ہے اور ان بیماریوں کی وجوہات معاشرے کے طبقاتی نظام میں موجود ہیں۔ ہیلن کیلر کو اس کے دور کے مشہور اخبارات نے غدار قرار دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا کہ ایک اپاہج عورت جو خود اس قابل نہیں کہ اپنے نظریات تشکیل دے سکے، کس طرح اقوام کو کوئی نظریہ دے سکتی ہے۔

اسی طرح امریکی نصاب میں کولمبس کا تذکرہ بطور ایک ہیرو کے آتا ہے جس نے اس نئے براعظم کو دریافت کیا۔ لیکن اس نے یہ سفر کیوں کیا تھا اس کی وضاحت پیش نہیں کی جاتی۔ کولمبس کہتا تھا کہ سونے سے بہتر اور قیمتی کوئی دوسری شے نہیں۔ جس کے پاس سونا ہے وہ اس کے ذریعے اپنی روح کو جنت میں بھی لے جا سکتا ہے۔ کولمبس کا مقصد سونے کی تلاش تھی۔ اس نے دولت حاصل کرنے کیلئے بڑے جتن کئے لیکن اس کی موت غربت اور گمنامی میں ہوئی۔ امریکی نصابی کتابوں کے برخلاف کہ وہ امیرانہ ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی گزارتا رہا۔ ایسا نہیں ہوا۔ امریکہ کی دریافت اور وہاں یورپین کے آنے کے بعد کیا ہوا؟ یہ جگہ یورپین کیلئے تو باعث رحمت بنی کہ وہاں ان کی زائد آبادی بس گئی، انہیں وہ ذرائع مل گئے جو استعمال کر کے انہوں نے معاشی طور پر ترقی کی لیکن خود امریکہ کے اصل باشندوں کے ساتھ کیا ہوا اس کی جھلک مشہور مورخ بلو کی کتاب 1492ء میں یوں نظر آتی ہے کہ مقامی لوگوں کو جمع کر کے ہسپانوی زبان میں فرمان سنایا جاتا تھا کہ تم سب لوگ چرچ کو کورٹ کے نام پر تسلیم کر لو اور

بادشاہ کو اس سرزمین کا حکمران جان کر اس کے ساتھ وفاداری کرو ورنہ تمہاری عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے گا۔ موت اور زخم تم جس سے بھی دوچار ہو گے وہ سب تمہاری ہی خطا ہو گی۔ اس طرح ہتھیاروں اور گھوڑوں کی برتری میں آنے والے لوگوں کو فاتح بنادیا گیا۔

1493ء عیسوی میں مقامی آبادی کے ہر ایک قبیلے کو کچلنے کیلئے کولمبس نے دوسو سپاہی گھڑسوار اور بیس شکاری کتے بھیجے جنہیں مقامی لوگوں کو نوچنے کیلئے ان پر چھوڑ دیا گیا۔ امریکی نصابی کتابوں میں یہ سب کچھ موجود نہیں ہے کہ وہاں کے مقامی باشندے کس طرح قتل عام کا شکار ہوئے اور ان کتابوں میں کولمبس صرف ایک ہیرو ہے جس نے بہادری، ہمت اور حوصلے کے ساتھ ایک نئی دنیا دریافت کی تھی۔ ایک اور نصابی کتاب جس کا عنوان امریکی روایات ہے، اس میں لکھا ہے کہ 1620ء عیسوی میں زائرین نے بندرگاہ پر اس کے اردگرد اپنی آبادی قائم کرلی تھی۔ بدقسمتی سے وہ دسمبر کے مہینے میں یہاں آئے تھے۔ وہ یہاں کی سردی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ مقامی انڈین نے دوستانہ طور پر ان کی مدد کی، انہیں کھانے کی اشیاء دیں اور یہ بتایا کہ اناج کیسے کاشت کریں۔ جب گرمی کا موسم آیا تو آنے والے آبا کاروں نے کاشت کاری کی اور جب ان کی پہلی فصل کٹی تو انہوں نے اس خوشی میں انڈین دوستوں کے ہمراہ جو جشن منایا وہیں سے ایک تہوار نے امریکہ میں جنم لیا لیکن نصابی کتب میں یہ درج نہیں ہے کہ جب یہ واقعہ ہوا تو 96 فیصد مقامی آبادی یورپی آبادکاروں کے ہمراہ آنے والی بیماریوں بشمول طاعون اور خسرے سے مرگئی تھی۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے تھے اور ایک انگریز آبادکار نے اس دور میں اپنے دوست کو لندن میں خط لکھا کہ مقامی لوگوں کے علاقوں میں خسرے کی بیماری ان کا تعاقب کررہی ہے اور خدا کی مہربانی سے ان کی اکثریت موت کا شکار ہو رہی ہے اور ہم ان کی خالی زمینوں کے مالک بن گئے ہیں۔

چنانچہ امریکی نصابی کتابوں میں جہاں مقامی باشندوں یا ریڈ انڈینز کا ذکر بہت کم ہے وہاں انہیں تہذیب کے افتتاحی دور کے معاشرے کا باشندہ قرار دے کر یہ تعصب دیا جاتا ہے کہ یورپی تہذیب و تمدن سے دور تھے۔ اس فرق کا یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ تہذیب یافتہ قوم کا غیر مہذب قوموں پر حکومت کرنا جائز ہوتا ہے۔ مکابر کو تہس نہس کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ انہیں غیر انسانی قرار دے دیا جائے چنانچہ ریڈ انڈین کو غیر مہذب، غیر

متمدن اور وحشی قرار دیتے ہوئے امریکی نصاب کی کتابوں میں انسانیت سے دور رکھا جاتا ہے جیسا کہ جنرل فلپ شرین ڈین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "ریڈ انڈین ایک مردار کی طرح ہوتا ہے"۔ 1813ء تک امریکی لفظ کی اصطلاح مقامی انڈین کے لئے استعمال ہوتی تھی لیکن اس کے بعد یہ لفظ یورپی آباد کاروں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ امریکہ کا ایک مشہور مورخ لکھتا ہے کہ ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہٹلر کو ہمارے سکول کے طالب علموں سے زیادہ معلوم تھا کہ ہم نے مقامی باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ ہم نے ریڈ انڈین کے لئے وہ کیمپس بنائے تھے اور ہٹلر نے ان اقدامات کی تعریف کی جو ہم نے مقامی لوگوں کے خاتمے کے لئے اختیار کئے تھے۔ مثلاً پابندیاں لگا کر انہیں بھوک سے مارنا اور ان کے خلاف جنگ کرنا وغیرہ۔ امریکی نصاب کی کتابوں میں وہاں غلاموں کی موجودگی اور ان کی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ابراہم لنکن کی وہ تقریر جس میں اس نے ساؤتھ ابنائی کی ریاست میں یہ کہا تھا کہ میں قطعاً اس بات کی حمایت نہیں کروں گا کہ سماجی یا سیاسی طور پر کالوں کو برابر نصاب دیا جائے۔ یا کسی کالے کو ووٹ کا حق دیا جائے یا سرکاری طور پر اس کو کوئی عہدہ دیا جائے۔ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ سیاسی سرپرستی میں ایسے گروپ یا جماعتیں امریکی تاریخ میں منظم ہوتے رہے جو سیاہ فاموں کے گھر جلاتے رہے اور سر عام انہیں پھانسی چڑھاتے رہے۔ ان لوگوں کے عوامی مقامات پر آنے پر طویل عرصے تک پابندی رہی اور یہ سب کچھ آج امریکی سکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب سے غائب ہے۔

یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں ریاست اور معاشرے کے نسلی اور مذہبی گروہوں میں ہمیشہ نصاب تعلیم کے معاملے پر تصادم رہا ہے اور شاید بہت کچھ ایسا بھی کتابوں میں موجود ہے جو کہ حقیقت سے دور ہے۔ لیکن خود مختار قومیں اپنے مسائل خود طے کرتی ہیں۔ ہم دوسری قوم کے تجربات سے سبق تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن کسی بیرونی ملک یا ادارے کو قطعی طور پر مداخلت کی کھلی چھٹی نہیں دے سکتے۔

## تعلیمی نصاب میں تبدیلی ضرورت یا امریکی خواہش

پاکستان میں بچوں کے حقوق اور آبادی کے مسائل پر کام کرنے والے قومی اور عالمی

اداروں کے مطابق 1 تا 18 سال کی عمر کے بچے کل آبادی کا تقریباً 48 فیصد ہیں جو ساڑھے 8 کروڑ سے زائد بنتے ہیں۔ ان میں سے پانچ اور نو سال کی درمیانی عمر کے بچوں کی تعداد ایک کروڑ 80 لاکھ بنتی ہے۔ ان بچوں میں سے ایک کروڑ 11 لاکھ کسی نہ کسی مرحلے پر کسی سکول میں داخلہ لے لیتے ہیں لیکن صرف 60 لاکھ بچے پانچویں کلاس سے آگے تعلیم حاصل کر پاتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ ایک کروڑ بیس لاکھ ان پڑھوں کا اضافہ ہر پانچ سال بعد ملک میں ہوتا ہے۔ پاکستان کی آبادی 2.05 فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ تعلیم سے محروم ان بچوں کی تعداد بھی اسی تناسب سے آگے جا رہی ہے۔ پاکستان کے ایک معروف دانشور صحافی اور مورخ کے بقول ان بچوں کے لیے ایک ایسا جدید نصاب تعلیم تیار کیا گیا ہے جو ان بچوں کو مہذب دنیا میں زندگی گزارنے کے اصول بتا سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک خاص طبقہ تو وہم میں مبتلا ہو چکا ہے، لیکن یہاں کا ایک عام شخص اب بھی اپنے مذہبی اور قومی نظریات پر جان دینے کو تیار ہے لیکن مغربی ذرائع ابلاغ میں درسی کتب اور ٹیکسٹ بک بورڈز کے خلاف ایک پروپیگنڈہ شروع کیا گیا اور پاکستان میں مغربی جدت پسندوں کی آمد معمول بن گئی جن کو مقامی ماڈریٹس نے خوش آمدید کہا۔ یہ ماڈریٹس یا لبرل جو سیکولر تعلیمی اداروں سے وابستہ ہو کر غیر ملکی نصاب پڑھانے کے دعویدار ہیں، اربوں روپیہ سالانہ کمانے کے علاوہ ماہرین تعلیم کا خود ساختہ اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ پاکستان کے حکمران طبقے کے بچوں کو ان کے اداروں میں تعلیم دی جاتی ہے اس لیے یہ اپنے غیر ملکی ڈونرز کے مشوروں کو حکومتی سطح پر زیر بحث لانے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔

پرویز مشرف کے دور میں ''ماہرین تعلیم'' کا ایک ایسا گروپ بھی سامنے آیا جس نے وہ بحث چھیڑی جس میں نصاب کے معنی اور تاریخ یکسر نظر انداز کر کے فکری نصب العین، تہذیب یا نظریہ روایت کو ترک کر کے قوم کی فکری پٹری پر اپنی سفارشات کا بم اس طرح رکھ دیا کہ متعین وقت پر مطلوب دھماکے ہو سکیں۔ اس رپورٹ میں سکولوں میں پڑھائے جانے والے عمرانی علوم یعنی اردو، انگلش، مطالعہ پاکستان کے نصابات اور درسی کتب کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اس میں موجودہ رائج نصاب کے تحت پروان چڑھنے والی نسل جہاد اور شہادت کا درس لے کر جوان ہو گی تو ملک میں رواداری، برداشت اور تحمل کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی، جو

ہندوستان سے دوستی کے لئے درکار ہے۔اس طرح نصاب کے ان ابواب کو موردالزام ٹھہرایا گیا جن سے پاکستانیت اور حب الوطنی کا جذبہ گہرا ہونے کا شبہ تھا، ان میں نشان زدہ 'نقائص' پر مبنی رپورٹ کے تخلیق کاروں نے پاکستان کے نظریے اور مذہب پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ بجائے اس کے کہ درسی کتب میں موجود زبان کو معیاری کرتے یا پھر دیگر مندرجات کو اپ ٹو ڈیٹ کرتے، خصوصاً سائنسی اور فنی شعبہ جات کو بہتر بناتے، انہوں نے اس رپورٹ میں سائنسی اور فنی تعلیم کو چھیڑا ہی نہیں اور صرف مذہب اور معاشرتی علوم پر نظر رکھی۔ یہ رپورٹ انہوں نے دینی مدارس نہیں بلکہ عام سکولوں کیلئے تیار کی تھی جس کو میڈیا میں مجموعی طور پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

اس وقت کے وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی نے حکم جاری کیا کہ اقدار کے منافی کچھ بھی درسی کتب میں شامل نہیں ہوگا۔اس بیان کے ساتھ ہی مارکیٹ میں لاکھوں کی تعداد میں وہ کتابیں چھپ کر آ گئیں جن پر یقیناً کئی سالوں سے کام ہو رہا ہوگا اور ماڈریٹ ترقی پسند دانشور جن کتابوں کے ایک ایک لفظ، جملے، تحریر، آیت یا حدیث کو مہذب دنیا کی عینک سے پڑھ چکے ہو نگے۔ میڈیا میں جب اس سازش کے خلاف آواز بلند ہوئی تو اسلام آباد کے ایوانوں میں بھی احتجاج شروع ہو گیا۔ حکمران جماعت اس وقت مسلم لیگ (ق) تھی جو نظریہ پاکستان کی محافظ ہونے کی دعویدار ہے۔ چوہدری شجاعت حسین نے عوامی ردعمل کو دیکھتے ہوئے کہا کہ اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کے حوالے سے شائع کی گئی متنازعہ کتابوں کی اصلاح کی بجائے انہیں نذر آتش کر دیا جائے، خواہ اس مقصد کیلئے کروڑوں روپے کا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے بعد پنجاب کی حکومت کی طرف سے نامناسب مواد کی حامل تمام درسی کتب کی تقسیم روک دینے کا حکم جاری ہوا۔ اس 'حرکت' کی تحقیقات کے لیے جب ایک کمیٹی کے تشکیل دیے جانے کی خبر باہر آئی تو پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے وفاقی حکومت پر اس کی ذمہ داری ڈال دی لیکن اس وقت کی وفاقی وزیر تعلیم زبیدہ جلال نے اس سے انکار کر دیا۔ بحث ابھی جاری تھی کہ امریکی سینٹ کے 9/11 کمشن کے سامنے کونڈا لیزا رائس نے اچانک پاکستانی وزیر تعلیم زبیدہ جلال کو خراج تحسین پیش کر کے پاکستانیوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس سے قبل زبیدہ جلال کو کولن پاول، لارا بش اور امریکی نائب سیکرٹری دفاع بھی تعریفی کلمات سے نواز چکے تھے۔ یہ سب کچھ ان امریکیوں کی طرف سے کہا گیا جو فری لنچ پر یقین نہیں رکھتے۔ پاکستان

میں تبدیلیوں، خصوصاً تعلیم کے میدان میں، امریکی کوششوں کو عام طور پر اس مالی امداد سے منسلک کر کے دیکھا جاتا ہے جو پاکستان کی اس میدان میں حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے پاکستان میں مختلف پروگرامز کے تحت پاکستان کو جو امداد دی جاتی ہے اس کا 'صلہ' شائد ملک کے بنیادی تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلیاں کر کے ادا کرنا پڑے۔ پاکستان میں اقوام متحدہ کے ادارے USEFP کے علاوہ امریکی ادارہ یو ایس ایڈ بھی کام کر رہا ہے۔ اس امریکی ادارے کی طرف سے گذشتہ تین سالوں میں 600 پاکستانی طلبہ امریکہ میں تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ یو ایس ایڈز پروگرام کے تحت 2018 تک 21,000 پاکستانی طلبہ کو سکالرشپس دی جائے گی جو اس ادارے کے اخراجات پر دنیا کے مختلف ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ یاد رہے کہ یہ ادارہ پہلے ہی 10,000 طلبہ کو سکالرشپس دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں 600 سکولوں کی مرمت بھی کی گئی۔ 2009 تک اس پروگرام کے تحت 15,000 اساتذہ کو تربیتی کورس بھی کرائے گئے۔ پاکستان کے 79 کالجوں اور 23 یونیورسٹیوں میں دو سالہ ایسوسی ایٹ ڈگری اور چار سالہ بیچلر ڈگری پروگرام بھی اسی ادارے کے سپانسرڈ شدہ ہیں جو 6000 طلبہ حاصل کر رہے ہیں۔ یہ پروگرام دنیا میں گذشتہ 60 برسوں سے جاری ہے۔ 2009 تک کیری لوگر بل کے تحت پاکستان کو سول امداد کی مد میں 3.5 بلین ڈالر دیے جا چکے تھے۔ اس کی تفصیل ذیل میں دی گئی ہے۔

## پاکستان کی بقا امریکی امداد کے بغیر ممکن ہے؟

کئی ایک مغربی پالیسی ساز، سیاستدان اور سماجی رہنماؤں کو شاید اب یقین ہو چکا ہے کہ پاکستان کی معاشی بقاء کا انحصار امریکی اعلامیوں کی مرہون منت ہو چکی ہے۔ امریکی قانون سازوں کی اکثریت پاکستان کی طرف امریکی ڈالروں کی خیرات کو رضامندی سے قبول کرنے اور بدلے میں امریکی مطالبات پورے نہ کرنے پر اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ صرف مغربی لوگ ہی نہیں کئی دوسرے ممالک بھی اس بات کو حقیقی خیال کرتے ہیں۔ ان میں کینیڈا اور فرانس پیش پیش ہیں جو اپنے نشری پروگراموں میں ایٹمی قوت پاکستان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ امریکہ نے روز اول سے پاکستان کو خیرات پر زندہ رکھا ہوا ہے۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان

کو دی جانے والی فوجی اور معاشی امداد کی ایک طویل تاریخ ہے جو کئی عشروں پر محیط ہے۔ اس دوران مختلف امریکی حکومتوں نے کئی ارب ڈالر پاکستان کو دیئے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے اس بات کا تعین کیا جائے کہ امریکہ پاکستان کو امداد کیوں دیتا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ اس رقم کو کس مقصد کے لئے دیا جاتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کا بھی تعین کیا جائے کہ کیا واقعی پاکستان کی بقاء امریکی امداد سے مشروط ہے؟

اس سلسلے میں برطانوی اخبار گارڈین نے 6 عشروں سے پاکستان کو دی جانے والی امریکی امداد کی ایک دستاویز شائع کی۔ جسے واشنگٹن ڈی سی میں "Center for Global Development" کے ورین الپی نے مرتب کیا۔ اس دستاویز کے اعداد و شمار کے مطابق 1948 سے پاکستان کو دی جانے والی امریکی امداد کا زیادہ تر حصہ عوام کی فلاح کے لئے مختص تھا۔ 1948ء سے 2010ء تک دی گئی 61.7 بلین امریکی ڈالر کی امداد میں سے 40.4 بلین معیشت کی بہتری یا بحالی اور 21.3 بلین ڈالر فوجی امداد کی مد میں دی گئی۔ معیشت کی بہتری کے لئے مہیا کی گئی امریکی امداد 60 کے عشرے میں اپنے عروج پر تھی جب پاکستان کو سالانہ 2 بلین امریکی ڈالر دیئے جانے لگے۔

1982ء میں امریکہ نے فوجی امداد کی مد میں 17 بلین ڈالر دیئے جبکہ معیشت کے حوالے سے 13.5 بلین دیئے گئے۔ یہ دراصل 1979ء میں سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کی وجہ سے فوجی امداد میں اضافہ کیا گیا حالانکہ ان دنوں مارشل لاء کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کمزور تھی۔ لیکن اس امداد (فوجی اور سول) میں 1992 سے 2001 کے دوران کمی واقع ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ نے 9/11 کے بعد پاکستان کی امداد میں اضافہ کرتے ہوئے 2002ء میں دو دفعہ معاشی اور فوجی امداد دی جس کی رقم 13 بلین ڈالر پر مشتمل تھی۔ ماضی قریب میں (2008-10) پاکستان کی فوجی امداد میں ڈرامائی اضافے نے پاکستان کے جمہوری اور سول اداروں کو کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس سے پاکستان کے سیاسی و سماجی شعبوں میں فوج کی گرفت مضبوط ہوئی۔ فوجی امداد کو پاکستان کے مفاد میں نہیں سمجھا جاتا۔ دراصل امریکی فوجی امداد پاکستان میں سول حکومتوں کے خلاف مسلح افواج نے اپنی مرضی ٹھونسنے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کی۔

اس کی دو مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ 1980ء میں جنرل ضیاء اور 2002ء میں جنرل مشرف کو دی گئی امریکی امداد نے پاکستان میں سویلین حکومتوں کے برعکس فوجی آمروں کو مضبوط کیا۔ 90ء کی دہائی میں جب امریکہ نے ہاتھ کھینچ لیا تو پاکستان میں یکے بعد دیگرے جمہوری حکومتیں ہی برسراقتدار رہیں۔ اگرچہ ان کا دورانیہ بہت قلیل تھا۔ 2010ء میں یہ امداد 1.8 بلین ڈالر کے مساوی تھی۔ جو کہ ایک بڑی رقم تھی تاہم فی کس آمدنی کے تناسب سے یہ 18 کروڑ عوام کو 10.3 امریکی ڈالر فی کس کے حساب سے ہر پاکستانی پر تقسیم ہو سکتی تھی۔ اس تفصیل کے تناظر میں ہمیں کیا یقین کر لینا چاہئے کہ امریکہ کی طرف سے دی جانے والی 10.3 ڈالر فی کس کی سول امداد پر پاکستان کی بقاء کا انحصار ہے۔

اس حوالے سے ہمیں کچھ حقائق کا جائزہ لینا ہوگا۔ پاکستانی معیشت کا حجم 175 بلین ڈالر ہے۔ 2002 سے امریکہ نے پاکستان کو معاشی شعبے کی مد میں ہر سال 825 ملین ڈالر مہیا کئے ہیں۔ دوسری طرف تارکین وطن پاکستانیوں نے 2011ء کے دوران ہر ماہ 10 بلین ڈالر ملک میں بھیجے۔ باہر سے آنے والی اس رقم کا حجم امریکی امداد کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ یعنی پاکستان کی معیشت امریکی امداد کی بجائے سمندر پار پاکستانیوں کی طرف سے بھیجی جانے والی غیر ملکی کرنسی اور زرمبادلہ پر منحصر ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق افغانستان میں اکتوبر 2001ء سے نیٹو افواج کی جاری جنگ سے پاکستان کو براہ راست اور بالواسطہ طور پر 68 بلین یو ایس ڈالر کا نقصان ہوا۔ پاکستان کا یہ معاشی نقصان پاکستان کو دی گئی امریکی فوجی و اقتصادی امداد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں ان 49 ہزار پاکستانیوں کا ذمہ دار کون ہے جو افغان جنگ (امریکی حملے کے بعد) کے دوران گزشتہ 12 سالوں میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ پاکستان نے امریکہ سے اس کی تلافی کا مطالبہ بھی کیا ہے جو امریکہ اقوام متحدہ کے ذریعے پاکستان کے دعوؤں کی تصدیق کرا چکا ہے اور ثابت شدہ دعوؤں کے لئے اسے پاکستان کو ادائیگی کر دینی چاہئے۔

اس بڑھتے ہوئے امدادی کاروبار کی نوعیت یہ ہے کہ پاکستان کو دی گئی امداد میں سے بھاری رقوم مشیروں اور مینوفیکچررز کو معاہداتی ادائیگیوں کی شکل میں ان ممالک کو واپس دے دی جاتی ہے جو عطیات کی جمع شدہ رقم پاکستان کو دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ورلڈ بنک کے

ایک سابق صدر جیمز ولفن سوہن کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے واشنگٹن ڈی سی میں 2004ء میں ''معاشی ترقی کی 16ویں سالانہ بنک کانفرنس'' سے خطاب کرتے دیا۔ اس نے اپنے خیالات کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈونرز ترقیاتی امداد کا غلط استعمال کرتے ہیں''۔ 4-2003 کے دوران ترقیاتی امداد کا حجم 58 بلین ڈالر تھا جس میں سے 14 بلین ڈالر صرف کنسلٹنٹس (مشیروں) کی جیبوں میں چلے گئے۔ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کا یہ ضابطہ ہے کہ وہ قرض یا امداد دیتے وقت کل رقم کا 35 فیصد بطور ''مشاورتی فیس'' کی مد میں کاٹ لیتا ہے۔ لیکن قرض پر سود پوری رقم کا وصول کیا جاتا ہے۔

## پاکستان کو دی جانے والی غیر ملکی امداد

پاکستان مختلف ممالک اور بین الاقوامی تنظیموں سے بیرونی امداد حاصل کرتا ہے، افغانستان میں جنگ شروع ہوئی تو اس کے بعد اس امداد کا ایک بڑا حصہ امریکہ سے آنے لگا۔ امریکی امداد کا زیادہ تر حصہ ''کولیشن سپورٹ فنڈ'' سے دیا جاتا ہے جو پاکستان کی طرف سے اٹھنے والے اخراجات کے حوالے سے اور اتحادی افواج کو بہم پہنچائی گئی سہولیات کے عوض اسے دیا جاتا ہے۔ ان سہولتوں میں شمسی ایئربیس اور دالبندین ایئربس اتحادی فورسز کے حوالے کرنا شامل تھا۔ اس کے علاوہ کولیشن سپورٹ فنڈ میں پاکستانی سیکیورٹی فورسز کو امریکی فوج اور کنٹریکٹرز کی طرف سے تربیت دینے اور دیگر سروسز کے لئے 4 بلین ڈالر بھی رکھے گئے۔

پاکستان میں انتخابی طریقہ کار میں مدد دینے والی سب سے بڑی تنظیم ''الیکشن سپورٹ گروپ'' ہے۔ یہ انتخابی طریقہ کار کو شفاف بنانے کے لئے دلچسپی لینے والی جماعتوں پر مشتمل اس بین الاقوامی تنظیم نے 16 عالمی تنظیموں کی فراہم کردہ سفارشات کی روشنی میں پاکستان الیکشن کمیشن کو 32 تجاویز کی سفارش کی۔ کمیشن کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے کے لئے اکتوبر 2009ء میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ کمیشن نے درپیش مسائل کے حل کے لئے ''الیکشن سپورٹ گروپ'' سفارشات مرتب کرنے کو کہا۔

2006ء میں ایک دوسرے بین الاقوامی ادارے ''انٹرنیشنل فاؤنڈیشن برائے انتخابی نظام'' نے یو ایس ایڈ کے ذریعے 9 ملین ڈالر کا ایک معاہدہ کیا تاکہ پاکستانی حکومت کے

لئے کمپیوٹرائزڈ انتخابی فہرست کا نظام تیار کیا جا سکے۔ یو ایس ایڈ، آئی ایف ای ایس، یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ پروگرام اور قومی جمہوری ادارہ برائے بین الاقوامی امور نے بھی پاکستان میں انتخابات پر مامور عملے کو تربیت دینے کے لئے کئی اقدامات میں معاونت کی۔ ''فیڈرل الیکشن اکیڈمی'' اور پاکستان الیکشن کمیشن کی سہولت کے لئے ایک لائبریری کا قیام بھی اس عمل کا ایک حصہ تھا۔

افغان جنگ کے دوران امریکہ نے پاکستان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لیں۔ اگرچہ ان توقعات کا ایک بڑا حصہ جنرل پرویز مشرف نے پورا بھی کر دیا تھا لیکن اس کے بعد آنے والی جمہوری حکومتوں سے ''ڈو مور'' کا امریکی تقاضا کئی بار دہرایا گیا۔ دوسری طرف فوج نے بھی اپنی ضروریات کے پیش نظر سول حکومتوں کے انسداد دہشت گردی کے لئے درکار آپریشنز کے حکومتی احکامات کے خلاف کبھی انکار نہ کیا۔ دہشت گردی کی اس جنگ میں پاکستان دن بدن آگے بڑھتا گیا۔ پاکستان میں سابق امریکی سفارت کار این ڈبلیو پیٹرسن نے اسلام آباد میں نیشنل مینجمنٹ کالج میں اعلیٰ بیوروکریٹس سے خطاب میں کہا کہ امریکہ پاکستان کی نئی جمہوری حکومت کی ترقی، استحکام اور سلامتی کے شعبوں میں امداد فراہم کرے گا۔ پاکستان میں کام کرنے والی بین الاقوامی امریکی ایجنسی یو ایس ایڈ نے بھی سرکاری طور پر 8.4 ملین ڈالر کے ایک معاہدے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستان کو خوراک کے بحران سے نکالنے کے لئے امداد دے گی۔

امریکہ نے اس موقع پر امید ظاہر کی کہ وہ نواز شریف حکومت کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ افغان جنگ کے بعد زیادہ تر امداد امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی گئی۔ 2002ء سے 2010ء تک امریکی کانگریس نے پاکستان کے لئے 18 بلین ڈالر کی فوجی واقتصادی امداد کی منظوری دی۔ تاہم پاکستان کی وزارت خزانہ نے اس میں سے براہ راست مالی ادائیگی کی شکل میں 8.649 بلین ڈالر ہی وصول کئے۔ اس حوالے سے مغربی حکام کا موقف تھا کہ فوجی امداد کا 70 فیصد (تقریباً 3.4 بلین ڈالر) فوج کو دیا گیا جو 2002-07 کے دوران غلط طور پر استعمال ہوا۔ اسے سویلین حکومت کا خسارہ پورا کرنے کے لئے استعمال کر لیا گیا۔ جبکہ پاکستان کا موقف تھا کہ دہشت گردی کی جنگ کے باعث ان کی

ملکی معیشت کمزور ہوئی، لہٰذا مذکورہ بالا رقم خسارہ پورا کرنے کے لئے خرچ کی گئی۔

تاہم پاک امریکہ تعلقات سودے بازی کی بنیاد پر چلے آرہے ہیں اور پاکستان کو دی گئی امریکی فوجی امداد کی شرائط کئی سالوں سے لے کر اب تک خفیہ طریقے سے درپردہ رکھی گئیں۔ مزید برآں پاکستان کی اقتصادی امریکی امداد کا ایک بڑا حصہ پیچھے سے امریکہ میں ختم کردیا گیا کیونکہ اب فنڈز بڑے بڑے امریکی رابطہ کاروں کے ذریعے دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ ایک امریکی قانون ساز نے یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ امریکی اقتصادی امداد کا بڑا حصہ پاکستان نے مشاورتی فیسوں کی مد میں اور زائد اخراجات پر خرچ کردیا۔ اب امریکہ کے پاس اسے دینے کے لئے کچھ نہیں بچا۔ پاکستان نے بھی موقف اختیار کیا کہ اس نے 2001ء سے لے کر 2011ء تک دہشت گردی کی جنگ میں 68 بلین امریکی ڈالر خرچ کیے ہیں۔

پاکستان میں 2008ء میں ہوئے جمہوری انتخابات کے بعد 2009ء میں پاکستان کی سالانہ امداد کے لئے 1.5 بلین ڈالر دینے کی تجویز دی گئی جس کے لئے کیری لوگر بل منظور کیا گیا۔ لیکن دو طرفہ تعلاقت میں اختلافات اور مسائل پیدا ہونے کے موجب، جس میں ڈرونز حملے، بھارت، ریمنڈ ڈیوس جیسے ایشوز شامل تھے، پاکستان کو پوری رقم منتقل نہ کی گئی۔ جبکہ امریکہ نے پاکستان سے 2014ء تک ہر سال 1.5 بلین امریکی ڈالر کی امداد دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن اگلے سال ہی مقرر کردہ رقم فراہم نہ کی گئی۔

چنانچہ 1.5 بلین ڈالر کی رقم میں سے صرف 179.5 ملین ہی دیئے گئے۔ پاکستان کی اقتصادی امداد دراصل 2010ء کے مالی سال میں ادا کی گئی۔ پاکستان نے جو رقم (179.5 ملین ڈالر) 2010ء میں حاصل کی اس میں سے امریکی امداد کے 75 ملین ڈالر (7 ارب 50 کروڑ پاکستانی روپے) بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام میں ڈال دیئے۔ 45 ملین ڈالر حکومت نے ہائر ایجوکیشن کمیشن کو پاکستانی یونیورسٹیز میں ''کارکردگی مراکز'' کو اپ گریڈ کرنے کے لئے دیئے۔ 19.5 ملین ڈالر ''پاکستان فل برائٹ سکالرشپ'' میں چلے گئے اور 23.3 ملین سیلاب زدگان کو ریلیف دینے پر خرچ کیے گئے۔ برطانیہ نے بھی پاکستان کو 2009ء سے 2013ء کے دوران 665 ملین پاؤنڈ کی امداد دی۔ پاکستان کی طرف سے ہمیشہ فری ٹریڈ کی بات کی گئی، خاص طور پر یورپ اور امریکہ سے فری تجارت کے لئے مذاکرات پر زور دیا لیکن 2014ء میں

اسے یورپی یونین میں جی ایس پلس کا درجہ دے دیا گیا۔ پاکستان چاہتا ہے کہ اسے دہشت گردی کی جنگ میں اتحادی ہونے کی حیثیت سے امداد دینے کی بجائے فری تجارت کی اجازت دی جائے۔ اس پالیسی کو گلوبل ڈویلپمنٹ سنٹر کے تھنک ٹینک نے بھی سراہا۔ بیرونی قرضے بھی پاکستان کے لئے وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان کو ہر سال ان قرضوں کی اقساط میں 3 بلین امریکی ڈالر ادا کرنا پڑتے ہیں۔ پاکستان نے بیرونی قرضوں کے خاتمے کی کئی بار کوشش کی لیکن کامیابی نہ مل سکی۔

## پاکستان میں امریکیوں کی مشکوک سرگرمیاں

آج پاکستان دہشت گردی اور بدامنی کی جس صورتحال سے دوچار ہے، ستر فی صد پاکستانی اُسے امریکہ، بھارت اور اسرائیل کی مشترکہ سازشوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ رپورٹس عالمی خبر رساں اداروں میں تواتر سے شائع ہوتی رہتی ہیں کہ اسرائیل اور امریکہ کے کمانڈوز کسی بھی ہنگامی صورتحال میں پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر قبضے کے لئے مشترکہ مشقیں کرتے چلے آرہے ہیں۔ امریکی میڈیا میں جان بوجھ کر یہ گمراہ کن پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیار کسی بھی وقت دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب سوات میں پاکستانی افواج طالبان کے خلاف برسرپیکار تھیں تو عالمی ذرائع ابلاغ میں یہ خبریں مسلسل دی جارہی تھیں کہ دہشت گرد اسلام آباد سے کتنے کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئے ہیں۔ دراصل یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا۔ جس کا مقصد پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر قبضہ کرنا تھا۔

امریکی تھنک ٹینکوں نے ایک عرصہ قبل ہی یہ منصوبہ پیش کردیا تھا کہ پاکستان خدانخواستہ 2010ء تک مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ دراصل امریکیوں کی سوچ اور خواہش ہے جس پر عمل درآمد کے لیے وہ سرتوڑ کوششیں کررہے ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی طاقت ہونے کے سبب وہ اگرچہ براہ راست پاکستان سے ٹکرانے کا رسک نہیں لینا چاہتے مگر حقیقت میں انہوں نے سابق سوویت یونین کی طرح پاکستان کو بھی مسلح گروپوں سے جنگ میں الجھا کر کمزور کرنا شروع کردیا ہے۔ اس بات میں اب کوئی شک باقی نہیں رہا کہ ان مسلح گروپوں کو غیر

ملکی قوتوں کی طرف سے اسلحہ، رقم اور منصوبہ بندی کے ضمن میں مدد فراہم کی جارہی ہے.........اور غالباً یہ قوت امریکہ ہی ہے۔اس بات کے کچھ شواہد ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔

2009 میں ہوئے سوات آپریشن کے دوران چند مقامی صحافیوں نے جو وہاں کے مقامی گروپوں سے بھی بخوبی واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے کیا عزائم ہیں، یہ پتہ چلا لیا تھا کہ کن مسلح گروپوں کو امریکہ کی طرح سے فنڈز فراہم کیے جارہے ہیں۔ان گروپوں کے امریکہ سے رابطوں کے انکشاف پر مبنی رپورٹوں اور دشمن عناصر کی کڑی نگرانی کے سبب جانباز صحافیوں کو امریکی آلہ کاروں نے شہید کردیا۔اس بارے میں تفصیلی رپورٹس اس وقت شائع بھی کی گئیں۔اسلام آباد کے مشہور زمانہ میریٹ ہوٹل میں ہونے والے دھماکوں کے بعد ایک خبر نے عوامی حلقوں میں ہلچل مچادی تھی، جسے حکومتی ارباب اختیار نے امریکی دباؤ پر مسترد اور غائب کردیا تھا۔وہ رپورٹ یہ تھی کہ دھماکوں سے ایک روز قبل امریکی فوجی میریٹ ہوٹل کے ایک فلور پر مشکوک سرگرمیوں میں ملوث تھے۔وہ رات بھر کچھ باکس بھر بھر کر لاتے رہے۔بعد کی تحقیقات میں یہ انکشاف سامنے آیا کہ میریٹ کے تمام فلورز پر اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ دراصل انہی مشکوک "باکس" کا "کارنامہ" تھی۔

امریکہ کی اس حوالے سے مشکوک اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کا ایک اور ثبوت پاکستان کے مختلف علاقوں میں اسلحہ اور ممنوعہ اشیاء لے کر جاتے ہوئے پکڑے جانے والے امریکی ہیں، خاص طور پر اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے ملازمین کی ایسی مشکوک سرگرمیاں کافی عرصہ سے زیر گردش رہی ہیں بلکہ دو سے زیادہ دفعہ ایسے واقعات میں ملوث امریکیوں کو گرفتار بھی کرلیا گیا، جنہیں بعد میں اعلیٰ سطح کے دباؤ کی وجہ سے رہا کرنا پڑا۔

سرگودھا کے ایک قصبے سے پانچ مشکوک امریکیوں کی گرفتاری بھی ایک اہم ثبوت ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ امریکہ کسی نہ کسی طرح پاکستان میں دہشت گردی کی وارداتوں میں ملوث ہے۔یہ پانچوں امریکی شہری اسلحہ بارود اور دہشت گردی میں استعمال ہونیوالے مواد سمیت گرفتار ہوئے اور ان کے قبضے سے ایسی اشیاء برآمد ہوئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ پاکستان میں دہشت گردی کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔اس ضمن میں سب سے پہلا سوال

یہ سامنے آتا ہے کہ ایسے حالات میں جب امریکہ کے تمام سکیورٹی نافذ کرنے والے ادارے انتہائی محتاط ہیں، مشہور زمانہ شخصیات اور سربراہان مملکت تک کو کپڑے اتروا کر جامہ تلاشی کے بعد ملک کے اندر یا باہر جانے کی اجازت دیتے ہیں یہ پانچ امریکی اسلحہ بارود سمیت پاکستان میں کیسے پہنچ گئے۔ مزید یہ کہ ان کی گرفتاری کے بعد امریکی ایف بی آئی کی ٹیم پاکستان دوڑی آئی اور انہیں اپنے ساتھ تفتیش کے بہانے امریکہ لے جانا چاہا، تاہم لاہور ہائیکوٹ نے اس ضمن میں حکام کو پابند کر دیا کہ ان امریکیوں کو ملک سے باہر نہ بھیجا جائے۔

2010 میں لاہور کے حساس ترین علاقے کینٹ میں بھی امریکیوں کی مشکوک سرگرمیاں دیکھی گئیں اور دو واقعات میں تو امریکیوں کی ایسی گاڑیوں کو سکیورٹی حکام نے پکڑ بھی لیا تھا۔ ایک بار تو امریکیوں کی گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی جعلی نکلی اور گاڑی میں سوار امریکیوں میں سے ایک خاتون حساس علاقے کی ویڈیو فلم بناتے ہوئے پکڑی گئی۔ ایک مرتبہ تو امریکیوں نے سکیورٹی کے ذمہ دار پاکستانی اہلکاروں کے روکنے پر انتہائی بدتمیزی کی اور تلاشی دینے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ اگر زبردستی تلاشی لینے کی کوشش کی گئی تو وہ سکیورٹی پر معمور عملے پر فائر کھول دینگے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ لوگ تلاشی نہ دینے پر کیوں بضد تھے۔ لیکن ان امریکی شہریوں کو بھی امریکی سفارت خانے کے دباؤ پر چھوڑ دیا گیا۔

امریکیوں کی مشکوک سرگرمیوں کی وجہ سے ہی پاکستان نے امریکی شہریوں کے لیے ویزوں کا اجراء ان دنوں روک دیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان آنیوالے امریکی کچھ ایسی سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے جن کی وجہ سے حکومت پاکستان کو یہ قدم اٹھانا پڑا۔ پاکستان کے اس اقدام سے امریکی انتظامیہ میں بے حد اشتعال پایا گیا کیونکہ اس سے ان کے منصوبوں کی راہ میں تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ ماہرین کا یہ بھی کہنا تھا کہ امریکہ پاکستانی اداروں کے اس عمل سے ناراض ہو گیا اس لیے امریکی انتظامیہ نے پاکستان کی امداد روک دی۔ یہ وہ شواہد ہیں جو منظر عام پر آچکے ہیں جبکہ امریکیوں کی پس پردہ سرگرمیاں ابھی تک جاری ہیں۔

بلیک واٹر کی پاکستان میں موجودگی ہر طرح سے ثابت شدہ ہے، امریکہ نے خود عالمی سطح پر تسلیم کیا ہے کہ اس نے پاکستان کیلئے بلیک واٹر کی خدمات حاصل کی ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کا موقف ہے کہ بلیک واٹر پاکستان میں موجود نہیں۔ برطانوی اخبار ''گارڈین'' نے

بھی تصدیق کی ہے کہ بلیک واٹراب بھی پاکستان میں موجود ہے اورڈرون حملوں کیلئے استعمال کیے جانیوالے خفیہ امریکی ائیر بیس پر کام کررہی ہے۔بلیک واٹر آپریشن کی براہ راست معلومات رکھنے والے سابق امریکی افسر کے حوالے سے اخبار ''گارڈین'' نے کہا کہ'بلیک واٹر جس کا نیا نام ''سروسز'' ہے، 2011 میں بلوچستان میں شمسی ائیر بیس کے اردگرد خفیہ مشن پر تعینات تھی'۔اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ امریکہ ہی اسرائیل اور بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کو تباہی کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔بلیک واٹراوراسکی پاکستان میں سرگرمیوں کے متعلق کتاب میں ایک الگ مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔

## حساس مقامات کے قریب زمین کن لوگوں نے خریدی؟

اسلام آباداور دیگر حساس مقامات پر غیرملکی سکیورٹی ایجنسیوں کی مشکوک سرگرمیوں کے بعد حساس مقامات پر بعض مشکوک لوگوں کی طرف سے جائیدادیں خریدنے کا سلسلہ بھی تیز ہوگیا ہے۔یہ جائیدادزیادہ تر فتح جنگ اور سیدن شاہ کے علاقہ میں خریدی گئیں۔بعض سرکاری ادارے اس امر کی تحقیقات میں مصروف ہیں کہ ان مقامات کی زمینیں یکدم کیوں اور کس نے بیچی ہیں؟ میڈیا میں اس کے متعلق خبریں بھی سامنے آتی رہی ہیں کہ فتح جنگ، حسن ابدال اور سیدن شاہ کے علاقوں میں بظاہر قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے ایسے افراد نے زمینیں خریدیں جن کے مشکوک لوگوں سے رابطے تھے۔ان سودوں کومشکوک بنانے والی ایک چیز ان کی قیمت بھی ہے،خریداروں نے زمین کے مالکان کومنہ مانگی قیمت دی۔اس طرح کا ایک سودا دسمبر 2009 میں اسلام آباد کے نواحی گاؤں مل پور میں بھی ہوا جہاں غیرملکی این جی اوز فاٹا سیکرٹریٹ سپورٹ پروگرام سے مل کرکام کرنے والی سکیورٹی ایجنسی حارث انٹر پرائزز کے ایک ذمہ دارنے 18 لاکھ روپے کی مالیت سے ایک کنال جگہ خریدی جبکہ یہاں زمین کی قیمت 5 سے 6 لاکھ روپے فی کنال تھی۔

ترقی کاموں اور زندگی کی سہولتوں سے محروم علاقے میں منہ مہنگے دام پر جگہ خریدنا معنی خیز بات ہے اور پھر ایک ایسی سکیورٹی ایجنسی جس کی امریکیوں سے تعلقات کی داستانیں

زبان زد عام ہوں۔ مزید یہ کہ اس ایجنسی کے 2 مکانات نیلور فیکٹری کے قریب واقع ہیں۔ دیگر مشکوک خریداریوں میں ایک ڈیل حسن ابدال کے گاؤں جالو میں ہوئی جہاں ایک شخص شیر علی مینگل ولد سکندر مینگل نے 18 ستمبر 2009ء کو 36 کنال 5 مرلہ زمین بے آباد علاقہ میں خریدی۔ اس ڈیل کا ٹرانسفر آرڈ نمبر 501-493 اور 636-631 ہے۔ اس ڈیل کا مشکوک پہلو یہ ہے کہ شیر علی مینگل کے شناختی کارڈ پر ان کا ایڈریس پاراچنار اور وزیرستان لکھا ہوا ہے جبکہ یہ بات بہت نمایاں ہے کہ پاراچنار اور وزیرستان کے درمیان طویل فاصلہ ہے اور اس علاقہ میں مینگل قبیلہ آباد نہیں۔ شیر علی مینگل کے حوالے سے معلوم ہوا کہ وہ (2010) کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ اس طرح کی ایک اور مشکوک خریداری فتح جنگ کے علاقہ صد کال میں ہوئی جس میں 20 کنال کی زمین 60 لاکھ روپے کے عوض خریدی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خریداری کے لیے جو شناختی کارڈ پیش کیا گیا وہ درست نہیں۔ محکمہ مال کے ریکارڈ کے مطابق خریدار کے پتہ پر اورکزئی اور وزیرستان کے الگ الگ مقامات کے نام درج ہیں۔ یہ خریدار چنگیز خان ولد شیر علی خان قوم مینگل بھی کراچی کے علاقہ اعظم ٹاؤن میں رہائش پذیر تھا اور کراچی میں مشکوک سرگرمیاں کے الزام میں گرفتار بھی ہوا۔ اسے یہ زمین ٹرانسفر نمبر 3114 کے تحت منتقل کی گئی۔

اطلاعات کے مطابق اس جگہ پر مینگل ہاؤس کے نام سے تعمیرات بھی شروع ہو چکی ہیں جبکہ یہ جگہ فتح جنگ اٹک روڈ سے 2 کلومیٹر دور بیابان میں ہے اور کالا چٹا پہاڑ سے اس کا فاصلہ 7 سے 8 کلومیٹر ہے۔ چنگیز خان کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے 15 کنال رقبہ خندہ کمار افتح جنگ کوہاٹ روڈ پر بھی خریدا اور کالا چٹا کے قریب رہتے ہوئے مزید زمینوں کی خریداری بھی کرنے لگا سرکاری اداروں نے اس غیر آباد جگہ پر زمین کی خریداری کو مشکوک تصور کرتے ہوئے اس کو مستقبل کے حوالے سے ایک خطرہ قرار دیا۔

14 اپریل 2009 کو محمد طارق اور نصیر اللہ ولد صبر بادشاہ نے بھی 16 کنال اور ساڑھے 6 مرلہ زمین نمبر 1209/18 اور 203/20 گاؤں لعل سیدوں فتح جنگ میں 62 لاکھ

روپے میں خریدی۔ زمینوں کی خریداری میں شامل محمد طارق ولد سید بادشاہ کے خلاف 15 جون 2009ء کو انسداد دہشت گردی اور دھماکہ خیز مواد کے مقدمات بھی قائم ہوئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خریداروں نے بھی اپنا پتہ اورکزئی وزیرستان لکھوایا تھا اور پوسٹ آفس کلچو درج تھا۔ کوہیلا حسن ابدال کے علاقہ میں 52 کنال 9 مرلہ اراضی ٹرانسفر نمبر 18662 ستمبر 2009ء کو سید رحمان ولد رسول خان قوم مینگل نے خریدی۔ اس خریدار کا پتہ بھی تری مینگل پاراچنار وزیرستان لکھا ہوا ہے۔ ایک اور خریداری 4 بھائیوں عبدالحکیم احمد جان، وحید جان ولد نور علی شاہ نے 14 اپریل 2009ء کو کی۔ 29 کنال اراضی ایک کروڑ 47 لاکھ 32 ہزار کے عوض سیدوں اور فتح جنگ میں خریدی گئی۔ اس کا نمبر 147/311 ہے اور ٹرانسفر نمبر 2332 کے تحت یہ رقبہ چار بھائیوں کے نام منتقل کیا گیا۔ ان کا پتہ عزیز خیال پوسٹ آفس کلچو اورکزئی ایجنسی لکھا ہوا ہے جسے جعلی قرار دیا گیا۔ دریں اثنا سیدن شاہ میں بھی کروڑوں روپے مالیت کی زمینیں اس طرح سے خریدی گئیں۔ فتح جنگ میں زمینوں کی مشکوک خریداری کے سلسلہ میں فتح جنگ کے محکمہ مال کے اہل کاروں کا کہنا تھا کہ چونکہ ان لوگوں کے پاس نادرا کے جاری کردہ شناختی کارڈ موجود تھے لہذا انہیں زمین خریدنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ ریونیو حکام کے بقول ایک موقع پر جب انہوں نے ایک قطعہ اراضی کی خریداری میں رکاوٹ ڈالی تو خریدار سپریم کورٹ چلے گئے اور سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ پاکستانی شہریوں کو پاکستان میں کسی بھی جگہ زمین کی خریداری سے نہیں روکا جاسکتا۔ تاہم ریونیو حکام نے خریداریوں خریداروں کی بھاری تعداد پر اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا۔ جبکہ ذرائع سرکاری کے اعداوشمار بتاتے ہیں کہ ایسے لوگ جن کے پاس وزیرستان یا اورکزئی کے شناختی کارڈ ہیں انہوں نے خوشاب میں بھی حساس تنصیبات کے قریب اراضی خریدی ہے۔ کچھ سرکاری ادارے ان تمام امور پر تفتیش کر رہے ہیں۔ ان کو خدشہ ہے کہ ملکی سلامتی سے متعلق حساس مقامات کے قریب مشکوک لوگوں کا زمین خریدنا تشویش ناک بات ہے کیونکہ جو زمین خریدی جارہی ہے وہ آبادی سے باہر ہے اور بڑی سڑک سے ہٹ کر واقع اس زمین پر زرعی اراضی، پھول دار درخت یا

باغات بھی نہیں ہیں۔ سیکورٹی ذرائع کو شک ہے کہ یہ تمام اراضی امریکی پیسے سے خریدی گئی ہے۔ کیونکہ خریداری کرنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ شامل ہیں جن کی سرگرمیاں مشکوک ہیں اور وہ لوگ امریکی پروگرام فاٹا سیکرٹریٹ سپورٹ پروگرام کے ایونٹس اور اجلاسوں میں آتے جاتے ہیں۔ ان کے امریکیوں سے گہرے تعلقات ہیں۔

## لاہور میں امریکیوں کے پاکستانی محافظ

اسلام آباد اور پشاور میں مسلح اور مشکوک امریکیوں کی بلیک واٹر اور دوسرے ناموں سے سرگرمیوں کے بعد لاہور اور ملتان میں بھی پراسرار امریکی تنظیموں نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں جس کی ملکی سلامتی کے ادارے نگرانی کرنے لگے۔ لاہور میں بھی امریکیوں نے ''سکیورٹی'' کے لیے سابق فوجی کمانڈوز کو پہلے بالواسطہ ''ہائر'' کیا بعدازاں انہیں براہ راست فرمز (FIRMS) نامی ادارے میں بھرتی کر لیا۔ ان امریکیوں کی سرگرمیوں کا دائرہ لاہور سے شروع ہو کر ملتان، بھیرہ اور اسلام آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ ملکی سلامتی سے متعلق اداروں کو شبہ ہے کہ لاہور میں ''مسٹر مائیک'' نامی ایک غیر ملکی جو خود کو برطانوی شہری بتاتا ہے مبینہ طور پر بلیک واٹر کے فرنٹ مین کے طور پر کام کرتا ہے اور پراسرار مغربی باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری اس مسٹر مائیک نے اپنے ذمہ لی ہوئی ہے جو مقامی نجی سکیورٹی کمپنیوں کے لیے رابطہ کار ہے۔ ملکی سلامتی کے اداروں کا دعویٰ ہے کہ ''فرمز'' نامی ادارے نے لاہور میں پہلے اپنا دفتر مقامی ہوٹل میں بنائے رکھا۔ مسٹر مائیک نے لاہور میں بھی اسلام آباد کی طرز پر ہی اخبارات میں اشتہار دے کر سابق فوجی کمانڈوز کو بھرتی کرنے کے لیے بلایا۔ یہ اشتہاری سلسلہ مئی کے وسط میں شروع کیا گیا جس کے بعد انٹیلی جنس ادارے اس طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں ایک نہیں متعدد بار اس نوعیت کے اشتہارات شائع کرنا پڑے کیونکہ لاہور میں سابق کمانڈوز بھرتی کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ اشتہارات مختلف سکیورٹی کمپنیوں کی جانب سے دیئے گئے۔ مسٹر مائیک نے انہی سکیورٹی کمپنیوں کے ذریعے لاہور کے سول اور چھاؤنی کے علاقوں میں 2009 میں مختلف

جگہوں پر رہائش گاہیں کرائے پر لے لیں تھیں۔ ان میں سے ایک لاہور کے ''پوش'' علاقے گلبرک میں ایم ایم عالم روڈ سے متصل ہے جہاں سیکورٹی کے غیر معمولی انتظامات بھی کیے گئے۔ اردگرد کے لوگ اسے امریکی قونصل جنرل کی رہائش قرار دیتے ہیں۔ لاہور کے ایم ایم عالم روڈ پر امریکیوں نے ایک نیا گھر بھی حاصل کیا اور اس کے اندرنئی تعمیر بھی کی۔ یہ گھر ایک مقامی سکیورٹی ایجنسی نے کرائے پر حاصل کیا تھا جسے نئے سرے سے سیکورٹی نقطہ نظر سے تعمیر کیا گیا۔ تعمیر کے بعد مقامی ہوٹل سے ''فرمز'' کے دفاتر اس عمارت میں منتقل کر دیئے گئے۔ فرمز نامی تنظیم کے لیے کرائے پر حاصل کردہ مکان کو مضبوط بنانے کے لیے تقریباً تین کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ پاروییسٹ سیکورٹی کمپنی جو دانیال نوید نامی شخص کی سربراہی میں کام کر رہی ہے کے توسط سے مسٹر مائیک نے لاہور میں پچاس سے زائد سیکورٹی گارڈ ہائر کیے جو تمام سابق کمانڈوز تھے۔ ان کو ایک غیر ملکی ادارے ''آر ایس ایم'' کے پیٹرن پر مزید تربیت دینے کا اہتمام کیا گیا۔

مسٹر مائیک نے سکیورٹی ایجنسیوں سے پراسرار امریکی شہریوں کے ملتان، بھیرہ اور اسلام آباد کے سفر کے لیے ایک مقامی ایجنسی کے نام پر ایک کروڑ مالیت کی گاڑیاں بھی حاصل کیں۔ یہ پراسرار غیر ملکی لاہور سے بھیرہ جاتے اور وہاں سے انہیں اسلام آباد سے آنے والی گاڑیاں فراہم کردی جاتی تھیں۔ پارہ یسٹ اسلام آباد سے وابستہ کرنل (ر) عمار یا سر 2010 میں اپنے انہی پراسرار مہمانوں کے لیے ملتان میں محفوظ ہوٹل دیکھنے گئے تو انہیں ملکی سلامتی سے متعلق اداروں نے گرفتار کرلیا۔ کئی گھنٹے تک کرنل (ر) عمار کو مقامی پولیس کی تحویل میں رہنا پڑا تاہم بعدازاں کسی بڑی سفارش پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس صورتحال میں کرنل (ر) عمار کا دورہ ملتان نہ ہو سکا۔ انہیں بدمزگی کے ماحول میں واپس اسلام آباد جانا پڑا۔ پاکستان میں مشتبہ برطانوی شہری مسٹر مائیک کسی ایک سیکورٹی کمپنی پر یقین نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ بیک وقت مختلف سکیورٹی کمپنیوں سے خدمات لیتا تھا۔ بعدازاں ان نجی اداروں کے توسط سے حاصل کیے گئے سکیورٹی گارڈز اور ڈرائیورز کو براہ راست ''فرمز'' سے وابستہ کرلیتا۔ ''فرمز'' (Firms)

کے لیے کام کرنے والوں کو بھاری تنخواہیں دی جاتی ہیں۔

یہ تنظیم بظاہر تو پانی کے مسائل پر کام کرنے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن اس کی سرگرمیوں میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ جس طرح کا جدید ترین دفتر و نظام اور مہنگی اور پراسرار ''محفوظ رہائش گاہیں'' ''فرمز'' کے اہلکار استعمال کر رہے ہیں وہ کسی این جی اوز کا انداز بحر حال نہیں ہوسکتا۔ اس چیز نے دفاعی اداروں کو چوکنا کر رکھا ہے۔ ادھر گلبرک کے ایم ایم عالم روڈ سے متعلقہ اس مشتبہ مرکز کے قریبی رہائشی، مسلح گارڈز، گاڑیوں کی بڑی تعداد اور غیر معمولی سکیورٹی انتظامات کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

O

باب نمبر 3
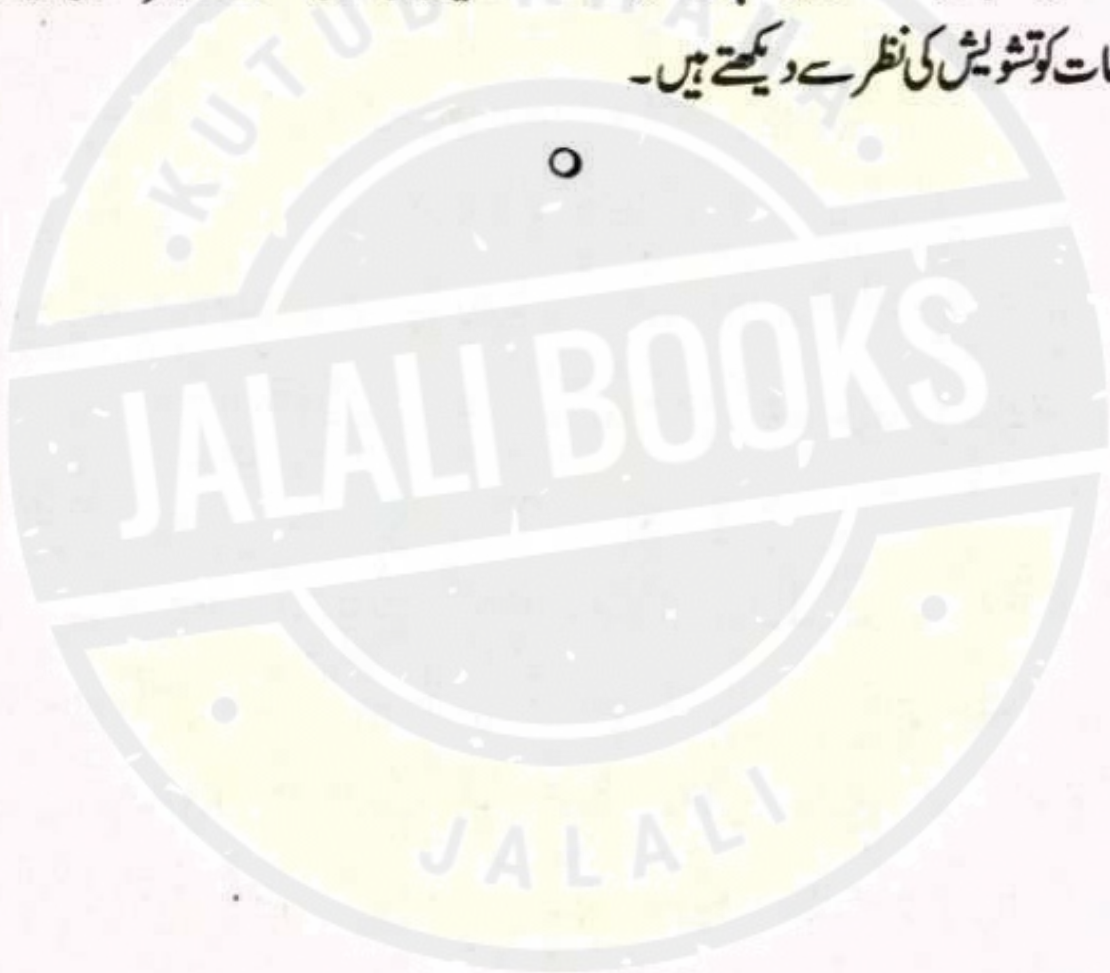
# پاکستان اور افغانستان

## مختصر تاریخ اور تعارف

سرکاری طور پر افغانستان کا نام 'اسلامی ریپبلک آف افغانستان' ہے جو چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا وسطی اور جنوبی ایشیا میں واقع ہے اور یہ عظیم مشرق وسطیٰ کا حصہ بھی ہے۔اس کی تین کروڑ آبادی 657,000 مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔اس کے جنوب میں پاکستان اور مشرق میں ایران ہیں جبکہ مغرب میں ترکمانستان، ازبکستان اور شمال میں تاکستان جبکہ چین اس کے شمال مشرق میں واقع ہیں۔افغانستان زمانہ قدیم سے شاہراہ ریشم اور انسانی ہجرت کا مرکزی نکتہ نگاہ بنا ہوا ہے۔ ماہرین ارضیات کی یہاں سے حاصل کردہ شہادتوں کے مطابق اس کی آبادی وسطی علاقوں جتنی ہی قدیم ہے۔افغانستان میں شہری تہذیب دو سے تین ہزار سال قبل مسیح سے چلی آرہی ہے۔یہ زمین کے ایک ایسے خطے پر واقع ہے جو مشرق وسطیٰ کی ثقافت کو ایشیا اور وسطی ایشیائی علاقوں سے ملاتا ہے۔افغانستان مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کا مسکن رہا ہے۔یہ مختلف عسکری مہمات کا بھی شاہد ہے۔جس میں سکندر اعظم ،عرب حملہ آور، چنگیز خان اور جدید دور میں مغربی افواج کی یلغار شامل ہیں۔غزنوی، غوری، مغل ،درانی اور دیگر کئی جنگجو سپہ سالار یہاں سے ہی اٹھے تھے جنہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔جدید افغان ریاست سے پہلے افغانستان کی تاریخ کا زیادہ تر حصہ فارس کے شہنشاہوں کی فرمانروائی سے عبارت ہے۔ افغانستان کی جدید سیاسی تاریخ کا آغاز 1709 میں پشتونوں کے منظر پر آنے سے ہوتا ہے جو تاریخ میں ''افغانوں'' کے نام سے معروف ہوئے۔لیکن یہ قندھار میں ہوتکی سلطنت کی قیام کے بعد 1747 میں درانی حکومت

قائم ہونے پر ہوا۔ 19 ویں صدی کے آخر میں 'گریٹ گیم' کے دوران افغانستان روس اور برطانوی ہند کے درمیان ایک بفر سٹیٹ بن گیا۔ 1919 میں اینگلو افغان جنگ کے بعد بادشاہ امان اللہ نے ملک کو یورپی طرز کی جدت پر ڈالنا چاہا تو کٹر بنیاد پرستوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ 1947 میں پڑوسی ملک ہندوستان سے انگریزوں کی دست برداری کے بعد سرد جنگ کے دوران سوویت یونین اور امریکہ نے افغانستان میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ یہ کھیل 1979 میں مجاہدین کی امریکی پشت پناہی اور افغان فوجوں کی روسی مدد سے لڑی جانے والی جنگ پر منتج ہوا جس میں دس لاکھ افراد مارے گئے۔ اس کے بعد 1990 کی خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں طالبان کے عروج زوال اور موجودہ جنگ کی داستان رقم ہوئی۔ دسمبر 2001 میں اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے 'انٹرنیشنل سیکورٹی اسسٹینس فورسز' کی افغانستان میں سلامتی اور کرزئی انتظامیہ کی مدد کے لیے تشکیل دی۔

تین دہائیوں سے زائد عرصے سے جاری جنگ نے افغانستان کو دنیا کے خطرناک ترین ممالک میں شامل کر دیا ہے۔ اس میں کرپشن اور معاشی، سیاسی اور سماجی ابتری نے اس کے باشندوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ عالمی طاقتوں کے بنے ہوئے اکھاڑے افغانستان سے لوگوں کی ہمسائے ممالک میں ہجرت نے ان کے لیے بھی کئی مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک پاکستان ہے، جہاں پاک افغان سرحد (ڈیورنڈ لائن) عبور کر کے لاکھوں افغانی اور مسلم دنیا کے ہزاروں جنگجو، جو روس کے خلاف لڑنے کے بعد طالبان کے لشکروں میں شامل ہو گئے تھے، پاکستان کے قبائلی علاقوں میں داخل ہوئے۔ پاکستان نے مہاجرین کو نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ کئی ایک نے یہاں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ پاکستان کو یہ حق ہمسائیگی اور اسلامی بھائی چارہ تکلیف دہ حد تک مہنگا پڑا۔ حتیٰ کہ پاکستان کی سلامتی کو لاحق خطرات بھی اسی میزبانی کے نتائج قرار دیے جاتے ہیں۔

## افغانستان میں اسلام اور مسلم حکمران

افغانستان میں اسلام کا پیغام 642 عیسوی میں سب سے پہلے ہرات اور نارانج میں پہنچا اور مشرق کی طرف پھیلتا گیا۔ کچھ مقامی باشندے اس کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے قبول کر لیا جبکہ دیگر نے بغاوت کر دی۔ افغانستان ایک کثیر المذاہب ملک تھا

جس میں پارسی، بدھ مت کے ماننے والے، سورج کی پوجا کرنے والے، آتش پرست، عیسائی، ہندو، یہودی اور دیگر عقائد کے لوگ شامل تھے۔ 870 میں کابل شاہی اور زنبل کی زرنج کے مسلمانوں سے شکست کے بعد اور غزنویوں کے ظہور میں آنے سے پہلے جب اسلام ہندوکش کی طرف پھیل رہا تھا تو کابل میں مسلمان اور غیر مسلم اکٹھے ہی رہتے تھے۔ افغانستان اسلام کے سنہری دور میں مسلم دنیا کا ایک اہم مرکز بن کر ابھرا۔

11ویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی نے ماسوائے 'کافرستان' کے علاقے کے باقی تمام افغان علاقوں میں اسلامائزیشن کر دی۔ غزنویوں کے بعد غوریوں نے اس ملک کو وسعت دی جو دنیا کے بڑے اور وسیع ممالک میں شامل ہو گیا۔ 1219 میں چنگیز خان کی منگول فوجوں نے اس پر چڑھائی کر دی اور خراسانی شہروں ہرات، بامیان اور بلخ کو تاراج کر دیا۔ منگولوں کی تباہی کے بعد بڑے شہروں کو دوبارہ آباد کیا گیا اور مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو دیہی زرعی معاشرے کی طرف واپس جانے پر مجبور کیا۔ منگول حکومت اخوانوں کے ساتھ شمال مغربی حصوں پر قائم رہی جبکہ ہندوکش کے جنوب میں افغان قبائلی علاقوں پر خلجیوں کا کنٹرول تھا جو 1370 میں امیر تیمور کے حملے تک قائم رہا۔ غزنوی، غوری اور تیموری دور میں افغانستان میں کئی یادگاریں بنائی گئیں جو مسلم فن تعمیر کی شاہکار کہی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح سائنسی اور ادبی میدان میں بھی کئی قابل ذکر کام کیے گئے۔

آگے چل کر تیمور اور چنگیز خان کی اولادوں میں سے ایک، ظہیر الدین بابر تھا جس نے فرغانہ سے آ کر ارغون سلطنت پر حملہ کیا اور کابل پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں اس نے وسطی اور مشرقی علاقوں کی جانب پیش قدمی کی اور 1526 میں دہلی پر قبضہ کے لیے افغان بادشاہ ابراہیم لودھی سے پانی پت کے میدان میں ایک خونی جنگ میں اسے شکست دی۔ دہلی پر مغل سلطنت کا پرچم گاڑ دیا جو 1857 تک لہراتا رہا اور اس دوران بہت کم وقت کے لیے سرنگوں ہوا۔ 16ویں سے 18ویں صدی کے آغاز تک افغانستان بیک وقت تین علاقائی حکومتوں کے ماتحت حصوں پر مشتمل تھا۔ شمال میں بخارا کے اخوان، مغرب میں صفوی شیعہ اور بقیہ ملک پر مغلوں کی حکومت تھی۔

## احمد شاہ درانی سے حامد کرزئی تک (1700 سے 2009 تک)

میر ویس ہوتک کو افغانستان کا جارج واشنگٹن کہا جاتا ہے، جس نے 1709 میں فارسی صفیوں کے خلاف ایک کامیاب بغاوت کی اور گرجن خان کو قتل کر کے افغانستان کو فارس حکمرانوں سے نجات دلائی۔ 17013 میں میر ویس نے خسرو خان اور رستم خان کی قیادت میں لڑنے والی دو بڑی فارسی افواج کو فیصلہ کن شکست سے دو چار کیا جن کو اصفہان (موجودہ ایران) کے سلطان حسین نے افغانستان کا دوبارہ قبضہ حاصل کرنے لیے بھیجا تھا۔ 1715 میں میر ویس طبعی موت مر گیا تو اس کے بھائی عبدالعزیز نے حکومت سنبھال لی جسے ایک مبینہ بغاوت کے شبے میں میر ویس کے بیٹے محمود نے قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ 1722 میں محمود نے افغان فوج کی قیادت کرتے ہوئے فارس کے دارالخلافہ اصفہان پر چڑھائی کی۔ گلن آباد کی لڑائی کے بعد شہر کو لوٹ لیا اور خود کو فارس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اہل فارس نے افغان حکمرانوں سے بے وفائی کی اور ہزاروں مذہبی علماء، سرداروں اور صفوی خاندان کے افراد کی قتل و غارت اور 1229 کی جنگ دمغان کے بعد فارس سے ہوتکی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ 1738 میں نادر شاہ نے حسین ہوتکی سے قندھار چھین لیا اور اس موقع پر 16 سالہ احمد شاہ درانی کو قید سے رہا کر دیا گیا جو نادر کی طرف سے 4000 ابدالی افغانوں کی فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ قندھار سے وہ غزنی، کابل پشاور، اور لاہور کے راستے ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے اور بالآخر دہلی کو کرنا تک کی لڑائی کے بعد لوٹ لیا۔ نادر شاہ کی فوج نے دہلی کو خالی کر دیا لیکن بہت بڑا خزانہ، جس میں کوہ نور اور دریائے نور ہیرے بھی شامل تھے، لے کر واپس آ گیا۔ قیام پاکستان سے ٹھیک دو سو سال پہلے 1747 میں نادر شاہ کا انتقال ہو گیا تو افغانوں نے متفقہ طور پر احمد شاہ درانی کو افغانستان کا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اسے جدید افغانستان کا بانی کہا جاتا ہے۔

افغان فوج نے احمد شاہ درانی کی قیادت میں موجودہ افغانستان، پاکستان، ایران کے صوبوں خراسان اور کوہستان سمیت ہندوستان کے دہلی کو فتح کیا۔ اس نے ہندوستان کی مرہٹہ حکومت کو شکست دی۔ سب سے بڑی کامیابی 1761 کی پانی پت کی جنگ میں حاصل

کی۔ 1772 میں احمد شاہ درانی 50 سال کی عمر میں طبعی موت مر گیا جسے قندھار میں خلعتوں ( خلافت کا لباس ) کے مزار سے ملحقہ قبر میں دفن کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا جس نے 1776 میں افغانستان کا دارالخلافہ قندھار سے کابل منتقل کر دیا۔ 1793 میں تیمور شاہ کہ وفات کے بعد درانی حکومت اس کے بیٹے زمان شاہ، شجاع شاہ اور پھر ان کی اولادوں میں منتقل ہوتی رہی۔

19 صدی کے اوائل میں افغان سلطنت، مغرب میں فارس اور مشرق میں برطانوی حمایت یافتہ سکھوں کی طرف سے خطرے میں تھی۔ 1800 میں خراسان اور کوہستان کے مغربی صوبوں پر فارسیوں نے قبضہ کر لیا۔ برکزئی قبیلے کے رہنما فتح خان نے حکومت کے دوور جن کے قریب اہم عہدوں پر اپنے بھائیوں کو تعینات کر دیا. اس کی موت کے بعد انہوں نے بغاوت کر دی اور صوبوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس ہنگامہ خیز دور میں افغانستان میں کئی ایک حکمران منظر پر آئے لیکن سب عارضی ثابت ہوئے، تاہم دوست محمد خان نے 1826 میں امیر ہونے کا اعلان کر دیا۔ پنجاب کے علاقے پر رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا اور 1834 میں خیبر پختونخواہ کو فتح کر کے پشاور شہر کو بھی اپنے ماتحت کر لیا۔ 1837 میں درہ خیبر کے قریب لڑی جانے والی جمرود کی جنگ میں اکبر خان اور افغان فوج نے سکھ سپہ سالار ہری سنگھ نلوہ کو ہلاک کر دیا۔ اس وقت تک برطانوی مشرق کی طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے، عظیم کھیل کا آغاز کر چکے تھے۔

برطانوی ہندوستان کی افواج کی، افغانوں کے ہاتھوں 1842 میں شکست کے بعد، برطانیہ نے افغان حکومت کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لیے اور وہاں سے تمام فورسز کو واپس لے لیا۔ وہ دوسری اینگلو افغان جنگ کے دوران 1870 کے عشرے کے آخر میں دو سالا فوجی آپریشن کے بعد واپس آئے تھے برطانیہ نے اس کے بعد اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے ریاست کی خارجہ پالیسی کو کنٹرول کر لیا۔ 1893 میں مورٹائمر ڈیورنڈ نے امیر عبدالرحمٰن خان کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جس کے مطابق پشتون اور بلوچ علاقوں کو ڈیورنڈ لائن کے ذریعے تقسیم کر دیا گیا۔ آج کی پاک افغان سرحد جسے 1893 میں کھینچا گیا اسی مناسبت سے اسے ڈیورنڈ لائن بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر آگے تفصیل کے ساتھ آ رہا ہے۔ دراصل یہ

برطانیہ کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کا اظہار تھا۔ خاص طور پر بعد میں بننے والی نئی ریاست پاکستان کے ساتھ افغانستان کے کشیدہ تعلقات کی وجہ یہ لائن بنی ہوئی ہے۔ لیکن آج پاکستان اس سے دست بردار ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں کیونکہ یہ بین الاقوامی قانون کے تحت اب ایک مستقل سرحد بن چکی ہے۔

تیسری اینگلو افغان جنگ اور 1919ء میں راولپنڈی معاہدے پر دستخط کے بعد، بادشاہ امان اللہ خان نے اعلان کیا کہ افغانستان ایک آزاد اور مکمل طور پر خود مختار ریاست ہے۔ اس نے افغانستان کو روایتی تنہائی سے نکالنے کی غرض سے بین الاقوامی برادری کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے۔ یورپ اور ترکی کے 1927 کے دورے کے بعد، اپنی قوم کو جدید بنانے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں کئی اصلاحات متعارف کرائیں۔ ان اصلاحات کے پیچھے ایک کلیدی متحرک قوت، محمود ترزی کی تھی جو خواتین کی تعلیم کا ایک کٹر حامی تھا۔ انہوں نے افغانستان کے 1923 کے آئین کے آرٹیکل 68 کے لئے بہت جدوجہد کی جو ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیتا ہے۔ 1923 میں غلامی کے ادارے کو ختم کر دیا گیا۔ اس طرح خواتین کے روایتی برقعہ کے خاتمے اور مخلوط تعلیم کے سکولوں کی ایک بڑی تعداد کے کھلنے سے کئی اصلاحات کا اطلاق کر دیا گیا جس سے کئی قبائلی اور مذہبی رہنما ناراض ہوئے۔ ان کوششوں کو مسلح مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ حبیب اللہ خان کلکانی کی قیادت میں کابل میں بغاوت شروع ہو گئی اور امان اللہ خان سے، اقتدار سے دست برداری کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا جس نے 23 جنوری 1929 کو مجبوراً حکومت چھوڑ دی۔ پرنس محمد نادر شاہ جو امان اللہ کا کزن تھا نے کلکانی کو شکست دی اور نومبر 1929 میں اسے ہلاک کر کے خود بادشاہ نادر شاہ کے نام سے اقتدار پر قابض ہو گیا۔ اس نے امان اللہ خان کی اصلاحات کو ترک کرتے ہوئے جدت پسندی کی طرف اپنے نقطہ نظر کو بتدریج فروغ دینا شروع کیا۔ ان کو 1933 میں ہزارہ برادری کے ایک سکول کے طالب علم عبدالخالق نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد افغانستان کے تخت پر ایک ایسا شخص بیٹھا جس نے اس ملک کی تاریخ میں سب سے زیادہ عرصے تک حکومت کی۔ اس کا نام محمد ظاہر شاہ تھا جس نے 19 برس کی عمر میں اپنے باپ نادر شاہ کے قتل کے بعد 1933 میں اقتدار حاصل کیا تھا۔

1946 تک ظاہر شاہ نے اپنے چچا کی مدد سے حکومت چلائی جو وزیر اعظم کے

عہدے پر فائز تھا اور وہ امان اللہ کی پالیسیاں اپنائے ہوئے تھا۔ ظاہر شاہ کے ایک دوسرے چچا شاہ محمود خان تھے جو 1946 میں وزیر اعظم بنے اور انہوں نے زیادہ سیاسی آزادی کی اجازت دینے کا تجربہ شروع کر دیا۔ لیکن جب وہ توقع سے آگے بڑھنے لگے تو پالیسی الٹ گئی۔ ظاہر شاہ نے وزیر اعظم شاہ محمود خان کو تبدیل کر کے اپنے ایک کزن اور بہنوئی داود خان کو اس عہدے پر نامزد کر دیا۔ داؤد خان سوویت یونین سے قریبی تعلقات کا خواہاں تھا جبکہ پاکستان سے اس نے دوری کی پالیسی اپنائی۔ افغانستان دوسری جنگ عظیم میں شریک نہ ہوا اور نہ ہی اس نے سرد جنگ میں کسی طاقت ور بلاک کے ساتھ منسلک رہا۔ تاہم اس نے سوویت یونین اور امریکہ دونوں کی طرف سے افغانستان کی مرکزی ہائی ویز، ہوائی اڈے اور دیگر اہم بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کی آڑ میں اثر ورسوخ پیدا کرنے کے دوران فوائد ضرور حاصل کیے۔ بادشاہ ظاہر شاہ 1973 میں بیرون ملک دورے پر تھے کہ داود خان نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر بغاوت کی اور افغانستان کے پہلے صدر بن گئے۔

## مارکسی انقلاب اور سوویت یونین کے خلاف جنگ (1978-1992)

(27 اپریل 1978 کو دنیا کے ذرائع ابلاغ نے اس خبر کو نمایاں کر کے شائع کیا کہ کابل، صدر داود خان کو ان کے پورے خاندان کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔) اپریل 1978 میں، افغانستان کی کمیونسٹ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی اے) نے ثور انقلاب کے نتیجے میں افغانستان میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ چند ماہ کے اندر اندر کمیونسٹ حکومت کے مخالفین نے فوری طور پر سرکاری فورسز کے خلاف گوریلا مجاہدین کی مدد سے مشرقی افغانستان میں ایک بغاوت شروع کی تو پورے ملک کو خانہ جنگ نے لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت (1978 میں) پاکستان میں مارشل لاء نافذ تھا اور فوج کی مرضی کے بغیر کسی سیاسی، سماجی یا مذہبی سرگرمی کا سوچنا موت یا کم از کم قید کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ مارشل لاء لگانے والے جس حکومت کو ختم کر کے اقتدار میں آئے تھے پاکستان کی مذہبی جماعتیں بھی اس کے خلاف تھیں۔ یہ قول ان دنوں پاکستانی سیاست پر صادق آتا تھا کہ ''دشمن کا دشمن بھی تمہارا دوست ہوتا ہے''۔ 1970 کی دہائی کے آخری سال ملک کے لیے انتہائی اہم تھے کیونکہ افغانستان میں روس داخل ہوا، پاکستان میں

ایک منتخب وزیراعظم کو ایک ایسے جرم پھانسی دی گئی جس کی اس سے پہلے نظیر نہیں ملتی، ایران میں حکومت کا تختہ الٹ کرنئی اسلامی حکومت قائم ہوئی، مسلمانوں کے مقدس ترین مقام خانے کعبے کا محاصرہ کیا گیا تھا۔ مسلم دنیا کے حالات میں کافی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ پاکستان میں ان دنوں مذہبی جماعتوں کے اکابرین پالیسی ساز جرنیلوں کے اتالیق بنے ہوئے تھے۔ پاکستان اور افغانستان کے سیاسی حالات میں بائیں بازو کے سوشلزم ایجنڈے کے خلاف مماثلت پائی جاتی تھی۔

سوویت یونین نے پی ڈی پی اے کی افغان حکومت کی مدد کے لیے ہزاروں فوجی مشیروں کو افغانستان بھیجا جبکہ پاکستانی حکومت نے خفیہ تربیتی مراکز میں مجاہدین کو ٹریننگ دینا شروع کر دی۔ اسی اثناء میں پی ڈی پی اے کے اندرونی دھڑوں کے درمیان عداوت پیدا ہوگئی۔ پی ڈی پی اے میں غالب خلق پارٹی تھی جبکہ پرچم پارٹی کی کابینہ میں اکثریت تھی جو زیادہ اعتدال پسند تھی۔ کابینہ کو ختم کر کے پرچم پارٹی کے حمایت یافتہ فوجی افسران کو گرفتار کر لیا گیا۔ 1979 میں امریکہ نے مجاہدین کی مدد کرنا شروع کر دی تھی۔ اس دوران نور محمد ترہ کئی کو قتل کر دیا گیا جس میں امین کی اعانت شامل تھی۔ امین بعد میں خلق پارٹی کے صدر بن گئے۔ سوویت یونین کے نزدیک امین کوئی قابل بھروسہ شخص نہیں تھے جن کو دسمبر 1979 میں روسی دستوں نے قتل کر دیا اور ان کی جگہ ببرل کارمل نے لے لی۔ ان کے دور میں 'افغانستان کے استحکام' کے نام سے روسی دستوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ سوویت یونین نے افغانستان کی اندرونی سیاسی جنگ میں براہ راست شمولیت کر کے اپنے حامی ( کیمونسٹ عناصر ) گروپوں کو تقویت دینے کے لیے اسلام پرست مخالفین کو کچلنا شروع کر دیا۔ اس وقت کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سوویت یونین مشرق وسطی میں اپنے قدم جمانے کے لیے جنوب کی طرف اپنی سرحدوں کو بڑھا رہا ہے۔ سوویت یونین کی تحریک جنوب مغرب میں ایران اور مشرق میں پاکستان کی طرف مزید توسیع کے لئے تھی۔ امریکی سیاستدانوں، ریپبلکن اور ڈیموکریٹس دونوں کو خدشہ تھا کہ سوویت یونین مشرق وسطی کے تیل پر قبضے کے لئے اپنی پوزیشن مضبوط کر رہا ہے۔ جبکہ سوویت یونین نے اسے دوسرے زاویہ سے دیکھا کہ ایران میں اسلامی انقلاب، افغانستان میں اسلام پسندوں کی جمعیت سے سوویت یونین کے لاکھوں مسلمانوں میں اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا

ہے۔ پی ڈی پی اے نے سود کی ممانعت، عورتوں کے حقوق اور جنسی مساوات کا اعلان کر دیا اور عورتوں کی سیاسی سرگرمیوں کو متعارف کرایا۔

افغانستان پر حملے کے بعد، صدر جمی کارٹر نے اعلان کیا، جو کارٹر اصول کے طور پر جانا جاتا ہے کہ امریکہ کسی بھی دوسری قوت کو خلیج فارس کا کنٹرول حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ 1980 میں امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ تجارت اور گندم کی ڈیل منسوخ کر دی جو اس کے بقول، سرد جنگ کی کشیدگی کو کم کرنے کے ارادے سے شروع کی گئی تھی۔ اس سے امریکی کسانوں کے مسائل میں شدید اضافہ ہوا۔ ماسکو میں 1980 میں منعقد ہونے والی اولمپکس میں حصہ لینے سے امریکی کھلاڑیوں کو روک دیا گیا۔ سوویت یونین کے حملے کے بعد، امریکہ نے سوویت یونین کے افغانستان سے نکلنے کی سفارتی کوششوں کی حمایت کی۔

## غیر ملکی مداخلت اور جنگ

1992ء میں نجیب اللہ کی حکومت کے زوال کے بعد، افغان سیاسی جماعتیں امن اور شراکت اقتدار کے ایک معاہدے (پشاور معاہدے) پر متفق ہوئیں۔ معاہدے کے مطابق افغانستان ایک اسلامی ریاست قرار دی گئی۔ عارضی طور پر عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اقتدار اعلیٰ رسمی طور پر افغانستان کی اسلامی ریاست کو تفویض کیا گیا جس نے 1992 میں روسی حمایت یافتہ نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد ایک شناخت قائم کر لی۔ اس حکومت کو حکمت یار کی حزب اسلامی نے قبول نہ کیا جس سے افغانستان میں کلی طور پر امن قائم نہ ہو سکا۔ کابل پر دوبارہ گولہ باری شروع ہو گئی۔ اس کے بعد سعودی عرب، ایران اور پاکستان نے اپنے اپنے گروپوں کی عسکری قوت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ ایران نے شیعہ ہزارہ کی حزب وحدت جس کا سربراہ عبدل علی مظری تھے کی پشت پناہی شروع کر دی جبکہ سعودی عرب نے عبدل رسول سیاف کی اتحاد اسلامی کی طاقت اور اثر و رسوخ میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور وہابی مسلمانوں کی مدد کی۔ پاکستان نے، ابتدا میں گلبدین حکمت یار کی حمایت کی لیکن طالبان کے ظہور کے بعد حمایت کا رخ ان کی طرف کر دیا گیا۔ جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے شائع

ہونے والی ایک کتاب کے مطابق ''جونہی بیرونی طاقتوں نے دیکھا کہ افغانستان عدم استحکام کا شکار ہے تو انہوں نے اپنا سیاسی ایجنڈا وہاں ٹھونسنے کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ جس پر دو مسلح گروپوں میں جلد ہی تصادم شروع ہوا جو ایک مکمل جنگ میں بدل گیا۔ اس اچانک شروع ہوئی جنگ سے نئی تشکیل شدہ حکومت کے تمام شعبے اپنی فعالیت کھو بیٹھے۔ مختلف مسلح گروپوں کے جنگجوؤں کی سفاکیت سے کابل میں لاقانونیت نے ڈیرے ڈال لیے۔ اس افراتفری میں جہادی رہنماؤں کا اپنے کمانڈروں پر برائے نام کنٹرول رہ گیا تھا۔ جبری آبروریزی، قتل اور تشدد سے عوام میں عدم تحفظ پایا جانے لگا۔ ایک اندازے کے مطابق، جنبش ملی اور حزب اسلامی کی باہمی لڑائی میں 25000 افراد لقمہ اجل بنے۔ دراصل حکمت یار چاہتے تھے کہ ماسکو ساختہ فوجی حکومت کے خاتمے سے ہی افغان بحران حل ہو گا اس لیے ربانی، مسعود اور ماسکو رابطے جب تک ختم نہیں ہوں گے اس وقت تک خانہ جنگی ختم نہیں ہو گی۔ احمد شاہ مسعود کا حکومت میں اثر ورسوخ بڑھنے سے بھی حالات زیادہ خراب ہوئے جو عوام پر ظلم کرتے تھے۔ ہیومن رائٹ واچ کے مطابق 5 لاکھ سے زائد لوگ افغانستان چھوڑ کر ایران اور پاکستان میں جا بسے۔

1994 میں افغانستان اور پاکستان میں جمعیت علمائے اسلام کے مدارس اور روس مخالف جہاد میں حصہ لینے والوں کی بدولت جے یو آئی کا بھی افغانستان میں کافی اثر و رسوخ پایا جاتا تھا۔ اس دوران یہ ایک سیاسی اور مذہبی قوت بن چکی تھی۔ 1994 میں قندھار پر قبضہ کے بعد پاکستان کی طرف سے کئی مقامی پشتون کمانڈروں کے طالبان کے حق میں سرنڈر ہونے کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ اسی سال یہ جنوبی اور وسطی افغانستان کے کئی صوبوں پر قابض ہو گئے۔

1994 کے آخر میں کابل پر قبضے کی کوشش کے دوران کافی تباہی ہوئی اور احمد شاہ مسعود کے ہاتھوں حزب وحدت، جنبش ملی اور حزب اسلامی کو شکست ہوئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کابل پر بمباری رک گئی اور حکومتی شعبے دوبارہ کام کرنے لگے۔ لیکن طالبان سمیت کئی مسلح گروپوں نے سیاسی عمل میں حصہ لے کر افغانستان کا امن بحال کرنے میں تعاون نہ کیا۔ 1996 میں طالبان نے ایک طویل اور خونی جنگ کے بعد، جس میں انہیں عرب مجاہدین اور پاکستانی عسکری اداروں کی مدد حاصل تھی، کابل پر قبضہ کر لیا جس کے ساتھ ہی سعودی عرب، یو اے ای اور پاکستان نے ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اگلے تین سال تک طالبان نے اپنے ہم وطنوں کا

تعاقب کیا اور افغانستان میں خون کی ندیاں بہا دیں۔9 ستمبر 2001 کو اپنے آخری ''دشمن'' احمد شاہ مسعود کو ایک بم دھماکے میں قتل کرنے کے بعد وہ تمام ملک کے مالک بن گئے۔

## پاک افغان تعلقات

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے دو اہم ستون ہیں جن میں ایک مسلم اور دوسرا پڑوسی ممالک سے قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم کرنا شامل ہے۔قریبی ممالک میں افغانستان ایک ایسا ملک ہے جس کے ساتھ پاکستان کے تعلقات زیادہ عرصے تک کشیدہ رہے۔تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی پاکستان کے ساتھ گہری وابستگی پائی جاتی ہے۔افغانستان سے درہ خیبر کے راستے ان گنت لشکر اس علاقے میں آتے رہے ہیں جو آج پاکستان کہلاتا ہے۔آریہ، ہن، غوری، غزنوی، تغلق، سادات، لودھی اور مغل اسی راہ سے آئے۔ان کے علاوہ بھی کئی گروہ برصغیر میں حملہ آور بن کے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔آج نسلی اعتبار سے لاتعداد خاندان برصغیر میں ایسے آباد ہیں جو افغانستان سے آئے تھے۔یوں پاکستان اور افغانستان کے درمیان نسلی تاریخ اور مذہبی تعلقات کا تاریخ پتہ دیتی ہے۔کئی حوالوں سے باہمی طور پر مضبوط جڑیں رکھنے کے باوجود اعلیٰ روایات پر مبنی تعلقات استوار ہونے کی بجائے بدقسمتی سے ان میں بار ہا بگاڑ پیدا ہوتا گیا جس نے دونوں ممالک کو ایک دوسرے سے دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔افغانستان کی بدقسمتی ہے کہ اگر اس کے ہمسائے ممالک میں سے کسی ایک کے حالات خراب ہوں تو اس کا افغانستان پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد افغانستان کی حکومت نے خصوصی پالیسی کے تحت پاکستان کے خلاف زہر افشاں پراپیگنڈا شروع کر دیا۔فقیر ایپی کے آدمیوں نے پاکستان کے کونسل خانے پر حملہ کر کے پاکستانی پرچم کی بے حرمتی کی جس پر پاکستان نے سفارتی تعلقات ختم کر دیے اور سفارتی نمائندے واپس بلا لیے۔

افغانستان تقریباً سوا سو سال سے مغربی سامراج اور روسی اشتراکیت کے درمیان کچلا جا رہا ہے۔پہلے اس پر برطانیہ نے اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔20 ویں صدی کے آخر میں سوویت یونین نے اس پر جارحیت کی لیکن وہ خود

شکست وریخت کا شکار ہو گیا۔ 21 ویں صدی کے ابتدائی سالوں میں امریکہ نے پوری دنیا کی فوج کے ہمراہ اس پر چڑھائی کی لیکن ہنوز اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ دراصل پاکستان کی طرح، افغانستان میں بھی لوگوں کی خاص تعداد اگرچہ بہت تھوڑی ہے، اشتراکی نظام فکر سے جڑی ہوئی ہے جس کی ماضی میں قیادت سوویت یونین کے ہاتھ میں تھی۔ اسی طرح دونوں ممالک میں عوام کی اکثریت اسلامی و سرمایہ درانہ نظام سے وابستہ ہے جس کا آج کل رہبر امریکہ ہے۔ دونوں سپر طاقتیں افغانستان میں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہی ہیں لیکن کسی کو فتح نہیں مل سکی۔ پاکستان نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ افغانستان میں امن ہو اور وہ ترقی کرے لیکن کچھ بیرونی طاقتیں اور مقامی نا عاقبت اندیش عناصر دونوں ممالک کے باہمی دوستانہ تعلقات میں مختلف ایشوز کے ذریعے رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ روس کو چونکہ ابتدا ہی سے افغانستان میں اثر و رسوخ حاصل تھا اس لیے اس کے تعلقات ان ممالک سے استوار رہے ہیں جن کو روس کی خوشنودی حاصل تھی۔ پاک افغان تعلقات میں رکاوٹ بننے والے متنازعہ ایشوز کا جائزہ لینے سے پہلے دیکھتے ہیں کہ ایوب خان کے دور حکومت میں دونوں ممالک میں ہونے والے معاہدوں کا کیا بنا تھا۔

## پاک افغان راہداری کا معاہدہ

1958 میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان راہداری کا جو معاہدہ طے پایا وہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا۔

1۔ افغانستان کے پاکستان سے گزرنے والے مال کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہو گی۔

2۔ انتظامی اخراجات اور کرایہ کے سوا کسی قسم کی کسٹم ڈیوٹی، مرکزی، صوبائی یا میونسپلٹی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

3۔ پاکستان نے افغان مال کے گذرنے کے طریقہ کار کو آسان بناتے ہوئے پورٹ ٹرسٹ، کسٹمز اور ریلوے حکام کو حکم دیا کہ کراچی، پشاور اور چمن میں مال کو گوداموں میں رکھنے کے کرائے میں کمی کر دی جائے۔

4۔ افغانستان سے مال لے جانے کے عمل کو مزید آسان بنانے کے لیے پاکستان نے

چمن سے افغانستان تک ریلوے لائن بچھانے کی منظوری دی لیکن افغانستان نے ایسا نہ کیا۔

5۔ پاکستان افغان مال پر وہی کرایہ وصول کرتا تھا جو اندرون ملک اپنے مال پر کرتا تھا۔

6۔ پاکستان نے ریلوے ویگنوں کی فراہمی کے لیے ذمہ داری کا مظاہرہ کیا لیکن افغان حکام نے اس کا مناسب جواب نہ دیا۔

یہ معاہدہ تین سال تک کارآمد رہا اور افغان حکومت کے ناروا سلوک کی وجہ سے 1961 میں ختم ہو گیا۔

## سفارتی تعلقات کا خاتمہ

6 ستمبر 1961 میں پاکستان نے افغانستان کے منفی سلوک کی وجہ سے اس سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے اور برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ وہ افغانستان میں پاکستان کے مفادات کا خیال رکھے لیکن افغانستان نے برطانیہ کو پاکستان کے مفادات کا نگران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم پاکستان کے وزیر خارجہ منظور قادر نے کہا کہ دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات کے انقطاع کے باوجود 1958 کے معاہدے کے مطابق افغانستان پاکستان سے مال گزار سکتا ہے۔ لیکن پاکستانی کوششوں کے باوجود حالات خراب ہوتے گئے اور افغان حکومت نے 14 ستمبر 1961 کو پاکستانی تاجروں کی املاک ضبط کر لیں۔ 21 ستمبر 1961 کو افغانستان کے وزیر اعظم سردار داؤد نے دونوں ملکوں کے تعلقات کی بحالی کے لیے مندرجہ ذیل شرائط پیش کر دیں۔

1۔ پاکستان اس امر کی ضمانت دے کہ پختون قبائل کو حق خود ارادیت دیا جائے گا، کسی دوست ملک کی ضمانت دی جائے کہ جو پاکستان کی یقین دہانی کا ضامن ہو اس سلسلے میں امریکہ کو ترجیح دی جائے گی۔

2۔ ڈیورنڈ لائن کے مشرق میں واقع قبائلی علاقہ سے، جسے افغان آزاد پختونستان کہتے ہیں، پاکستانی فوج ہٹالی جائے۔

3۔ مقید افغان لیڈروں کو رہا کر دیا جائے۔

4۔ پاکستان میں افغانستان کے قونصل خانے اور تجارتی دفاتر دوبارہ کھول دیے جائیں۔

## معاہدہ تہران

ستمبر 1961 میں پاکستان اور افغانستان کے سفارتی تعلقات کے انقطاع کے بعد دونوں ملکوں میں تعلقات کی بحالی کی متعدد کوششیں کی گئیں جو ناکام رہیں، تاہم 23 مئی 1963 کو تہران میں ہونے والے مذاکرات کامیاب رہے۔ جس کے نتیجے میں 28 مئی کو دونوں ممالک تعلقات کی بحالی پر رضامند ہو گئے۔ پاکستان اور افغانستان کی طرف سے اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ دونوں ممالک دوستی، خیر سگالی اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ تہران کی بات چیت کے لیے شاہ ایران کا شکریہ ادا کیا گیا جن کی کوششوں سے دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ لیکن ابھی اس معاہدے کی سیاہی خشک نہ ہوئی تھی کہ افغان وزیر اطلاعات سید قاسم شیشہ نے کہا کہ 'افغانستان نے ڈیورنڈ لائن کو تسلیم نہیں کیا'۔ دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات کی بحالی کے بعد یکم جولائی 1964 کو صدر ایوب خان نے کابل کا دورہ کیا جہاں ظاہر شاہ کے ساتھ بات چیت ہوئی۔ 7 فروری 1967 کو ظاہر شاہ اپنی ملکہ حمیرہ کے ساتھ پاکستان آئے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ انہوں نے پاکستان کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ 1971 کی جنگ میں افغانستان غیر جانبدار رہا۔ حالانکہ بھارت اور روس نے اس موقع پر ظاہر شاہ کو پاکستان پر حملہ کرنے پر اکسایا تھا۔

## ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں

6 اگست 1972 میں ذوالفقار علی بھٹو نے صدر پاکستان کی حیثیت سے افغانستان کا دورہ کیا جس کے نتیجے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ زمینی راستے سے افغانستان سے بھارت کو تازہ پھلوں کی برآمد کی اجازت دے دی جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ظاہر شاہ کے زمانے میں پاکستان کے ساتھ افغانستان کے تعلقات کافی بہتر تھے۔ لیکن 17 جولائی 1973 کو سردار داؤد نے فوجی انقلاب کے ذریعے شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اپنی پہلی تقریر میں کہا کہ "پاکستان واحد

ملک ہے۔جس کے ساتھ افغانستان کا کوئی جھگڑا ہے، ہم یہ تنازعہ حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے، افغانستان پختونستان کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا"۔سردار داؤد خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد افغان پالیسی یکسر بدل گئی اور اس نے پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا تیز کر دیا۔وزیر اعظم بھٹو نے افغان حکمرانوں کو متعدد بار مذکرات کی پیش کش کی لیکن افغان حکومت نے اس کی پرواہ نہ کی اور پاکستان کی طرف سے دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا۔ چنانچہ پاکستان کو مجبوراً اپنی شمال مغربی سرحدوں کا دفاع کرنے کے لیے انتظامات کرنے پڑے۔حالات اس وقت سنگین ہو گئے جب اکتوبر 1974 میں افغانستان کے نائب وزیر داخلہ وحید عبداللہ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں پاکستان کے جن علاقوں پر افغانستان کا قبضہ تھا ان کے لیے وہ پاکستان سے مذاکرات کرنے کے لیے تیار ہیں۔جولائی 1973 کو سردار داؤد کے برسر اقتدار آنے کے کچھ عرصہ تک پاک افغان تعلقات کشیدہ رہے۔ 9 ستمبر 1973 کو الجزائر میں غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس منعقد ہوئی جہاں افغان مندوب نے دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کا ذکر بھی کیا اور اسلامی ممالک کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل جناب حسن التہامی کی مفاہمت کرانے کی پیش کش کو بھی سراہا۔اس ضمن میں انہوں نے ستمبر 1974 میں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی اور بعد ازاں وہ سردار داؤد سے مذاکرات کے لیے کابل گئے۔چار روز بعد پاکستان واپس آ کر انہوں نے بتایا کہ جب وہ تین ماہ پہلے یہاں آئے تھے تو تعلقات اس قدر کشیدہ نہ تھے، دونوں ملکوں کے مابین تمام اختلافات کو منصفانہ اور مستقل طور پر حل کرنے کی فوری ضرورت ہے۔تاہم پاکستان نے تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے اس وقت پہل کی جب اپریل 1976 میں افغانستان میں زلزلہ آیا۔پاکستان زلزلہ زدگان کے لیے ایک لاکھ ڈالر کی امداد کا عطیہ افغانستان کو دیا۔

خیر سگالی کے جذبات کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر داؤد نے وزیر اعظم پاکستان کو افغانستان کے دورے کی دعوت دی جو جون 1976 میں کیا گیا۔اس چار روزہ دورے میں دونوں ہمسایہ ممالک کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے اور انہیں پر امن خطوط پر قائم رکھنے کے لیے اہم قرار دیا گیا۔اس کے بعد افغان صدر داؤد بھی پاکستان کے پانچ روزہ دورے پر پاکستان آئے اور انہوں نے لاہور میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان اور افغانستان کے

تعلقات میں جو مشکلات حائل ہیں وہ ایک یا چند بار کی بات چیت سے حل نہیں ہو سکتیں، لیکن اگر دونوں ممالک نیک نیتی سے ایک دوسرے کے قریب آئیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ منزل مراد تک پہنچ جائیں گے۔ بلاشبہ یہ حقیقت وضاحت کی محتاج نہیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو مفاہمت اور خلوص کے جذبے سے سرشار ہو کر پرامن بات چیت سے ہی فروغ دیا جا سکتا ہے"۔ افغان صدر کے دورہ پاکستان کے اختتام پر جو اعلان ہوا اس میں دونوں ملکوں نے بات چیت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

## تنازعات اور کشیدگی

جنرل کے ایم عارف (working with Zia) میں لکھتے ہیں کہ تین دہائیوں تک پاک افغان تعلقات کشیدگی کا شکار رہے اور ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں یہ اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ذیل میں ہم نے ان حالات اور واقعات کو بیان کیا ہے جو دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کا باعث بنے رہے۔

## ڈیورنڈ لائن تنازعہ

ماضی میں افغانستان کمیونسٹ روس اور برطانوی سامراج (ہند) کے درمیان ایک بفراسٹیٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ روس دریائے آمو تک جبکہ مشرق میں برطانیہ ڈیورنڈ لائن تک آ کر رک گیا اور افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان 12 اکتوبر 1893 کو ایک معاہدے کے ذریعے اسے مستقل سرحد کا درجہ دیدیا گیا۔ 1905 میں امیر عبدالرحمان کے بیٹے اور جانشین امیر حبیب اللہ نے بھی اس پر کاربند رہنے کی یقین دہانی کرائی۔ اس کے بعد 1919 میں راولپنڈی معاہدہ اور 1921 میں اینگلو افغان معاہدے کے ذریعے اس کی توثیق کی گئی۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو دولت مشترکہ کے سیکرٹری نے بھی ڈیورنڈ لائن کو ایک بین الاقوامی سرحد قرار دیا۔ 1950 سے 1960 تک برطانیہ نے مختلف مواقع پر اس بات کا کئی بار اعادہ کیا کہ ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ 1944 میں اس وقت ختم ہو گیا تھا جب برطانیہ نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے افغانستان کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس لیے ڈیورنڈ لائن پر آ کر افغانستان کے مفادات ختم ہو

جاتے ہیں۔ قیام پاکستان کے فوری بعد 30 ستمبر 1947 کو جب پاکستان نے اقوام متحدہ میں رکنیت حاصل کرنے کے لیے درخواست دی تو جنرل اسمبلی میں درخواست پر بحث کے دوران افغان نمائندے نے کہا تھا کہ افغانستان اس وقت تک کے پی کے صوبے کو پاکستان کا حصہ تسلیم نہیں کر سکتا جب تک اس صوبے کے عوام کو اپنی آزاد مرضی سے اس بات کا چناؤ کرنے کا موقع نہ دیا جائے کہ یہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا الگ حیثیت سے۔ افغانستان وہ واحد ملک ہے جس نے پاکستان کے خلاف ووٹ دیا۔ پاکستان کو اقوام متحدہ کی رکنیت تو مل گئی لیکن افغان حکمرانوں کی نیت کھل کر سامنے آ گئی۔ افغانستان ایک ایسا ملک ہے جہاں کبھی انتخابات نہیں ہوئے، ہمیشہ بندوق کے زور پر حکومتیں تبدیل ہوئیں، لیکن پاکستان کے مغربی حصوں میں اس نے انتخاب کرانے کی بات کر کے دوطرفہ تعلقات کو ٹھیس پہنچائی۔ افغانستان ڈیورنڈ لائن کے متعلق قیام پاکستان سے لے کر اب تک چار نکات اٹھاتا رہا ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان نے طاقت کے ذریعے اس سرحد کو قائم کیا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سر ہنری مور ٹائمر ڈیورنڈ اور امیر عبدالرحمان کے درمیان پائے جانے والے معاہدے کی مدت 100 سال تھی جو 1993 میں ختم ہو چکی ہے۔ افغان سیاستدانوں اور سماجی و مذہبی رہنماؤں نے عوام کی اکثریت کو اس نکتے کا بہکاوا دے رکھا ہے۔ افغانستان میں اس سلسلے میں دوسرا نکتہ یہ اٹھایا جاتا ہے کہ برطانیہ نے یہ معاہدہ امیر عبدالرحمان سے جنگ کی دھمکی اور اقتصادی پابندیوں اور ناکہ بندیوں کے ذریعے مجبور کر کے کیا تھا۔ لہٰذا دنیا کا کوئی قانون جبری طور پر کیے گئے معاہدے کی توثیق نہیں کرتا بلکہ اس کی تنسیخ کرتا ہے۔ افغانستان کے امیر نے اس سلسلے میں لویہ جرگہ طلب کیا نہ حکومتی ارکان سے مشورہ کیا تھا۔ اس ضمن میں تیسرا نکتہ یہ اٹھایا جاتا ہے کہ 31 جولائی 1947 میں برطانیہ کے برصغیر سے جانے کے بعد، افغان وزیر اعظم شاہ محمود خان اور برطانوی سیکرٹری آف امور خارجہ، کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ خود بخود ختم ہو جائے گا، اس سرکاری نکتہ نگاہ کو 14 اگست 1947 سے پہلے افغانستان کی طرف سے اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں افغان خارجہ پالیسی میں ڈیورنڈ لائن اور پختونستان کے قیام کو خاص جگہ دے دی گئی۔ افغان سیاست میں اس سلسلے کا چوتھا نکتہ یہ اٹھایا جاتا ہے کہ صدیوں سے اس سرحد کے دونوں طرف بسنے والے پشتون دراصل مقامی سطح پر تحریک چلانے کی راہ میں

مزاحم ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ نسلی، مذہبی اور سماجی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ افغان لیڈروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ڈیورنڈ لائن کو اخلاقی طور پر قبول کر رکھا ہے۔ دراصل یہ سیاسی نعرے ہیں حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان کر دی گئی ہے۔

## پختونستان کا شوشہ اور روس بھارت مداخلت

پاکستان وجود میں آیا تو اس کے ساتھ ہی افغانستان نے بعض پاکستانی علاقوں پر اپنا حق جتلانا شروع کر دیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ پاکستان کے شمال مغربی علاقے اس کا حصہ تھے جن پر انگریزوں نے زبردستی قبضہ کیا تھا۔ لہٰذا افغانستان اب بین الاقوامی معاہدے کے تحت طے شدہ سرحد کو تسلیم نہیں کرتا۔ کبھی اس کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں شامل قبائلی علاقے پر اس کا حق ہے، کبھی وہ اپنی سرحد پشاور، نوشہرہ اور مردان تک قرار دیتا ہے، کبھی دریائے اٹک تک کا سارا علاقہ افغانستان میں شامل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ جہلم تک کا علاقہ اپنے میں شامل کرنے کی بات کرتا ہے۔ یہ شوشہ افغانستان کی طرف سے 1947 سے چھوڑا جا رہا ہے۔ اس کا یہ موقف اگرچہ بے بنیاد اور سراسر غلط ہے لیکن اس کے حکمرانوں کے لیے سودمند ثابت ہوتا رہا ہے۔ کیونکہ جب بھی افغانستان نے ڈیورنڈ لائن کا ایشو اجاگر کیا بھارت اور روس کی طرف سے اسے بھاری امداد ملنے لگی۔ دوسرا عوام کی توجہ ان کے حقوق سے ہٹانے کے لیے بھی شوشہ کارگر ثابت ہوتا رہا ہے۔ جب بھی افغانستان سے روس اور بھارت کا اثر ختم ہوا پاکستان سے اس کے تعلقات معمول پر آجاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں ملکوں کی عوام ایک دوسرے کو چاہتی ہے اور اسلامی، ثقافتی اور معاشی حوالوں سے ایک بندھن میں بندھی ہوئی ہے۔ لیکن افغان حکمرانوں نے پاکستان کے خلاف روس اور بھارت کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھانا شروع کیا تو پاکستان نے بھی اپنی پالیسی پر نظرثانی شروع کی۔ 24 اکتوبر 1974 کو روسی وزیراعظم الیکسی کوسیجین نے پاکستان کو مشورہ دیا کہ "ہمارے دوست ہمسایہ ملک، افغانستان کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کرو"۔

## وزیراعلیٰ حیات محمد خان شیر پاؤ کا قتل

فروری 1975 میں کے پی کے (اس وقت کے صوبہ سرحد) کے وزیراعلیٰ حیات محمد خان شیر پاؤ کو ایک بم دھماکے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے ردعمل میں مرکزی حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس قتل میں افغانستان کا بھی ہاتھ ملوث ہے۔ حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ ایک ہمسایہ ملک پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ یہ بقائے باہمی کے اصولوں کے خلاف ہے جس کی بنیاد 'خود جیو اور دوسروں کو بھی جینے کا حق دو' جیسے سنہری اصول پر استوار ہے۔ پاکستان کے وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان نے دھمکی آمیز بیان دیا کہ اگر پاکستان کو مجبور کیا گیا تو وہ بھی جوابی کارروائی کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ افغانستان نے اس الزام کی فوری تردید کی اور اسے ایک سیاسی حربہ قرار دیتے ہوئے پاکستان سے کہا کہ باہمی تعلقات کا راز بلوچوں اور پختونوں کی امنگوں کی توقیر اور احترام میں پنہاں ہے۔ پاکستان کے دفتر خارجہ میں 1973 سے ایک افغان سیل بھی قائم تھا جس کے اجلاسوں کی صدارت خود وزیراعظم کرتے تھے۔ بعد میں یہ سیل خوابیدہ ہو گیا۔ اس کا کام افغان پالیسی کے رہنما اصول وضع کرنا ہوتا تھا۔ اس کے آپریشنل منصوبوں کی نگرانی ڈی جی فرنٹیئر کانسٹیبلری اور ڈی جی آئی ایس آئی کرتے تھے جو افغانستان کے اندر بھی کارروائیاں کرتے تھے۔ اس سیل کے تعاون سے ہی پاکستان نے افغانستان سے پروفیسر برہان الدین ربانی اور انجینئر گل بدین حکمت یار کو پشاور بلایا۔ جب ان کی مدد سے افغانستان میں جوابی کارروائی کی گئی تو افغانستان فوراً مذاکرات کے لیے تیار ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں پاک افغان تعلقات کشیدہ ترین سطح تک پہنچ چکے تھے۔ صدر داؤد نے جون 1976 میں پاکستان کے دورے کے دوران وزیراعظم سے کہا کہ علاقائی استحکام اور خوشگوار تعلقات کی فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بلوچستان میں اندرونی سلامتی کے لیے جاری فوجی آپریشن کو ختم کیا جائے، بلوچ اور پشتون عوام کی مشکلات پر ہمدردی سے غور کیا جائے۔ عسکری خفیہ اداروں کے مطابق،

ذوالفقار علی بھٹو نے افغان صدر کو جواب میں کہا تھا کہ کچھ پشتون اور بلوچ رہنما منفی سرگرمیوں میں ملوث ہیں تاہم پاکستان کے عوام مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد صوبوں کی طرف سے زیادہ خودمختاری کے مطالبے کے حق میں نہیں ہیں۔ جب افغان صدر نے نیشنل عوامی پارٹی کے گرفتار رہنماؤں کا سوال اٹھایا اور بلوچستان میں شورش کا ذکر کیا تو وزیراعظم نے کہا ''بعض معاملات میں جرنیلوں کے موڈ کو بھی دیکھنا پڑتا ہے، میں اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کروں گا''۔ لیکن افغان صدر کے تین ماہ بعد اگست 1976 میں دورے تک کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے بعد بھٹو نے کہا کہ سردار داؤد سے معاملات طے پاچکے تھے لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ مارچ 1977 میں ذوالفقار علی بھٹو خود مشکلات میں پھنس چکے تھے لہٰذا اگلے 8 ماہ تک کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

## ضیاالحق کا دور حکومت اور افغانستان

جنرل ضیاالحق نے جب اقتدار پر قبضہ کیا تو انہوں نے افغانستان کے ساتھ اعلیٰ سطحی روابط قائم کیے۔ وہ افغانستان کے خیر سگالی کے دورے پر اکتوبر 1977 میں گئے اور اپنے میزبان کو پاکستان کی سیاسی صورتحال سے آگاہ کیا۔ صدر داؤد نے کہا کہ وہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر دوستی اور خیر سگالی کے ایک نئے دور کا آغاز کریں گے۔ افغان صدر نے وہ تمام گفتگو جو چند ماہ قبل وزیراعظم ذوالفقار علی سے کی تھی ضیاالحق کے گوش گزار کی۔ دونوں سربراہوں نے خطے میں امن کے قیام پر رضامندی کا اظہار کیا اور دونوں کے تعلقات میں حائل رکاوٹیں دور کرنے پر بھی اتفاق کیا گیا۔ اس ملاقات میں دونوں رہنماؤں کے زاتی مراسم بھی قائم ہو گئے۔ اس دو روزہ دورے میں صدر داؤد کو پاکستان کے دورے کی دعوت بھی دی گئی اور پاک افغان تعلقات ایک بہتر سمت میں رواں ہوئے۔ فوجی حکومت نے وہ حیدرآباد ٹربیونل توڑ دیا جو نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں کے مقدمے کی سماعت کر رہا تھا۔ حکومت کے اس فیصلے سے بلوچستان میں حالات معمول پر آگئے، کے پی کے میں حکومت پر اعتماد بڑھنے لگا اور افغانستان کے ساتھ صلح کا راستہ متعین ہونے لگا۔ مارچ 1978 میں افغانستان کے صدر داؤد نے پاکستان کا چار روزہ دورہ کیا اور باہمی امور جو دونوں ممالک کی پالیسیاں متاثر کر رہے تھے کا جائزہ بھی لیا

گیا۔ اس ملاقات میں خطے میں آنے والے اس طوفان کا ذکر بھی کیا گیا جس نے دس سالہ جنگ کا آغاز کیا تھا۔ بلوچ اور پختون رہنماؤں کی رہائی کے لیے جنرل ضیاء کے اقدام کو بھی سراہا گیا، اقتصادی تعاون اور وفود کے تبادلے پر بھی بات چیت ہوئی۔ صدر داؤد کے اعزاز میں دی جانے والی ضیافت ایک شاندار تقریب تھی جس میں جیل سے رہا ہونے والے سیاستدان بھی شامل تھے۔ افغان صدر چند روز پہلے رہا ہونے والے خان عبدالولی خان، سردار عطااللہ مینگل، خیر بخش مری اور غوث بخش بزنجو کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ (یہ سب روس نواز تھے) افغانستان واپسی سے پہلے صدر داؤد نے راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس کی اور کچھ ماہ بعد کابل میں دوبارہ ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان سے روانہ ہونے سے پہلے صدر داؤد نے جنرل ضیاء سے کہا ''افغانستان پاکستان سے دیرپا اور مضبوط تعلقات کا خواہاں ہے، ہم نے تین دہائیوں سے زیادہ عرصے سے ایک موقف اپنا رکھا تھا جسے تبدیل کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے، میں افغان رہنماؤں کے جرگے میں اس بات کو رکھوں گا تاکہ پاکستان سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم کیے جاسکیں''۔ جنرل ضیا کو یقین تھا کہ صدر داؤد اپنا وعدہ پورا کریں گے لیکن حالات کسی دوسری طرف نکل گئے، پھر نہ داؤد رہے نہ ضیاء۔

اپریل 1978 میں افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور صدر داؤد کو قتل کر دیا گیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی جن کمیونسٹ افغان فوجیوں نے 1973 میں اسے اقتدار دلوایا تھا وہی اس کے قاتلوں میں شامل تھے۔ ان کی جگہ نور محمد ترہ کئی مسند اقتدار پر بیٹھے۔

اس کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے۔ فوج نے ٹینکوں کی مدد سے وزارت دفاع اور صدارتی محل پر قبضہ کر لیا۔ (اس کا نام تبدیل کر کے پیپلز ہاؤس رکھ دیا گیا) عام بغاوت شروع ہوگئی جس میں افغان فضائیہ بھی شامل ہوگئی، حکومت متزلزل ہوگئی، خلق پارٹی کی مرکزی قیادت کے سات افراد جیل میں بند تھے جن میں نور محمد ترہ کئی اور ببرل کارمل بھی شامل تھے۔ انقلابی منصوبے پر عمل شروع ہو چکا تھا اور ہر طرف جنگ اور قتل و غارت جاری تھی کہ 27 اپریل 1978 کو افغان سرکاری ریڈیو نے شام کے وقت اعلان کیا کہ 'افغانستان میں تاریخ بدل چکی ہے، شہنشاہیت کا خاتمہ ہو چکا ہے، نادر خان کے خاندان کا سورج غروب ہو چکا ہے، ظلم اور اقربا پروری کی لعنت سے چھٹکارے کے بعد تمام اختیارات عوام کے سپرد ہو چکے ہیں'۔ آئین

منسوخ کردیا گیا اور ملک کا نام تبدیل کر کے 'ڈیموکریٹک ریپبلک آف افغانستان' رکھ دیا گیا۔ اس خونی ڈرامے کے پیچھے اصل طاقت روس کی تھی جسے اس خانہ جنگی سے کچھ ماہ پہلے داؤد کی وہ پالیسیاں پسند نہ تھیں جو وہ افغانستان کی معاشی حالت بہتر بنانے اور افغان عوام سے اقتصادی بوجھ کم کرنے کے لیے اپنائے ہوئے تھے۔ روس جو پاکستان میں فوجی حکومت اور ایران میں اسلامی تحریک کے احیاء پر ناخوش تھا، افغانستان کی صورتحال سے بوکھلا اٹھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دریائے آمو کے شمال میں واقع سوویت مسلمان ریاستیں افغانستان میں ہونے والی کسی تبدیلی سے متاثر ہوں۔ چنانچہ اس نے داؤد کو ہی ٹھکانے لگادیا جس سے خطے کے حالات عدم استحکام کا شکار ہوگئے۔ جب افغانستان میں مطلع صاف ہوا تو پاکستان نے افغان سیل کو از سر نو فعال کیا جس کے ذمہ دستیاب معلومات کی روشنی میں حکومت کو افغان معاملات میں رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ افغانستان میں جاری شورش کا پاکستان پر بھی اثر پڑنا ایک یقینی امر تھا جس سے سلامتی کے خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ نور محمد ترہ کئی بظاہر عوام کا حقیقی نمائندہ تھا لیکن اصل 'بادشاہ گر' امریکی تعلیم یافتہ اور کٹر کیمونسٹ حفیظ اللہ امین تھا جس نے افغان فوج میں مارکسی نظریات رائج کیے تھے۔ پرچم اور خلق پارٹی کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے۔ اول الذکر اہم رہنماؤں کو بیرون ملک تعینات کر کے نجات حاصل کی گئی اور سوویت یونین سے ایک دوستی معاہدہ عمل میں لایا گیا۔ فروری 1979 میں حفیظ اللہ امین نے وزارت دفاع اور داخلہ کا قلمدان سنبھال لیا۔ اسی مہینے شاہ ایران کی شہنشائیت کا خاتمہ ہوا اور کابل میں امریکی سفیر کو قتل کر دیا گیا۔ ضیا الحق ایران کے دورے پر جانے لگے تو انہوں نے کابل میں مختصر قیام کیا اور نور محمد ترہ کئی سے بھی ملاقات کی۔ پغمان تپہ میں بلاقات کے دوران نور محمد ترہ کئی نے جنرل ضیاء کو بتایا کہ شاہی خاندان دوسو برس تک عوام کا استحصال کرتا رہا۔ اب انقلاب کے بعد عوام ہر چیز کے مالک ہیں اور 1 کروڑ 10 لاکھ بے زمین عوام کو زمینوں کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ نئے نظام میں افراد کی کوئی حیثیت نہیں وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہونے والی گفتگو کی چند سطور کچھ یوں ہیں۔

ضیا الحق: بطور مسلم ہمارا ایمان ہے کہ ساری زمین خداوند بزرگ و برتر کی ملکیت ہے اور انسان اس زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نگران ہے۔

ترہ کئی: ساری زمین عوام کی ملکیت ہے۔
ضیاالحق: بنی نوع انسان کو اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔
ترہ کئی: خدا عادل ہے ہمیں ایک عادل سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔
ضیاالحق: بندوں کے ذمہ اللہ تعالیٰ اور بنی نوع انسان کے چند فرائض بھی ہیں۔
ترہ کئی: انسانوں کی خدمت کرنا خدا کی خدمت کرنا ہے۔

دونوں سربراہوں میں یہ ملاقات تقریباً چار گھنٹے تک جاری رہی۔ (مذکورہ بالا مکالمہ اشتراکی نظام اور اسلامی سرمایہ درانہ نظام میں فرق کو سمجھنے میں کافی مدد دے سکتا ہے) جب ترہ کئی قتل ہوئے تو حفیظ اللہ امین اقتدار میں آئے۔ انہوں نے پاکستان کے خارجہ امور کے مشیر آغا شاہی کو باہمی تعلقات پر بات چیت کے لیے دورہء افغانستان کی دعوت دی جو موسم کی خرابی کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ ادھر 26 دسمبر 1979 کو روس کے فوجی دستے کابل ائیر پورٹ پر اترنے شروع ہو گئے۔ اس کے بعد کے حالات اوپر بیان کر دیے گئے ہیں۔ پاکستان میں فوجی مارشل لاء کے بعد اے این پی کی قیادت روس اور افغانستان میں پناہ گزین تھی۔ جب افغانستان میں انقلاب آیا تو سرخ پوش لیڈر خاں عبد الغفار خان جلال آباد میں تھے۔ وہ افغانستان کی نئی حکومت سے ناخوش تھے کیونکہ پختونستان کے مسئلے پر وہ ان کی ہمنوا نہ تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ترہ کئی حکومت زیادہ دیر باقی نہیں رہ سکتی، اور ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد اگلے 25 برسوں تک افغان پالیسی فوج نے ہی مرتب کی جس کا مرکزی نکتہ مجاہدین کا تحفظ اور پاکستان مخالف عناصر کا افغانستان سے اخراج تھا۔

## افغانستان ایک بفر اسٹیٹ یا پناہ گاہ

قیام پاکستان سے پہلے برطانیہ اور سوویت یونین ایک دوسرے کے اندرونی حالات کا سراغ لگانے اور عدم استحکام سے دوچار کرنے کے لیے اپنے کارندوں کو افغانستان میں ٹھہرایا کرتے تھے اور اسی راستے کو ایک دوسرے کے ملک میں داخل ہونے کا آسان راستہ خیال کیا جاتا تھا۔ 1922 سے 1927 کے درمیان برطانوی ہند میں سوشلزم کا پیغام دینے والے بھی اسی راستے سے داخل ہوئے تھے۔ ان پر مقدمات چلائے گئے جو ''پشاور سازش کیسز'' کے

نام سے مشہور ہوئے۔ان سے قبل محمود غزنوی سے لے کر بابر تک اور پھر ہمایوں کے مقابلے کے لیے شیر شاہ سوری تک بھی لوگ افغانستان کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے۔اسی طرح تحریک شیخ الہند کے کارکنوں کی قیام گاہ کافی عرصے تک افغانستان ہی رہا۔ان کو ترک، افغان اور جرمن کی حمایت حاصل تھی۔افغانستان سے ہی مولانا عبیداللہ سندھی نے سودیت یونین جا کر لینن سے ملاقات کی تھی اور پھر واپس بھی افغانستان ہی آئے تھے۔

پاکستان میں دہشت گردی اور فرقہ واریت سے لے کر سیاسی اور انفرادی فوجداری قسم کے جرائم میں ملوث پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد افغانستان میں پناہ لیتی رہی ہے۔ہم نے کتاب کے شروع میں ''لیاقت علی خان کا قاتل کون'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ سید اکبر نامی شخص جس نے وزیر اعظم لیاقت علی خان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا وہ ایک افغان شہری تھا۔اکبر کا دوسرا بھائی مزدک خان بھی ایک برطانوی ایجنٹ تھا۔دونوں بھائیوں نے 1946 میں افغان حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے تھے۔اس کے بعد دونوں بھائی کے پی کے (اس وقت کے صوبہ سرحد) میں بطور انگریز ایجنٹ کام کر رہے تھے۔پاک افغان سرحد جو 2200 کلومیٹر لمبی ہے ایک پہاڑی علاقے پر مشتمل ہے۔اسے عبور کرنا انتہائی آسان ہے، یہ کسی دور میں بھی کلی طور پر بند نہیں ہو سکی۔اس کے ذریعے ہر قسم کا اسلحہ دونوں ممالک میں آزادی سے منتقل ہوتا رہتا ہے۔

1970 کی دہائی تک پاکستان میں فوجی حکومتوں کا دور تھا اور عسکری ادارے پڑوسی ممالک کی سرحدوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔لیکن جونہی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی سول حکومت قائم ہوئی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔اس گڑبڑ میں روس اور افغانستان کا ہاتھ ملوث تھا جس کا ذوالفقار علی بھٹو نے منہ توڑ جواب دیا تھا۔لیکن جب پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو افغانستان نے ذوالفقار علی بھٹو کے بیٹوں اور ان کی عسکری تنظیم 'الذوالفقار' کو نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ ان کو اپنے ملک میں پناہ دی اور وہ دنیا بھر میں تخریبی کارروائیاں کرنے لگے۔یہ وہ وقت تھا جب پاکستان میں تشدد کی سیاست عروج پر تھی۔مارشل لاء کے نفاذ

کے بعد سوشلسٹ رہنما افغانستان اور روس چلے گئے۔ حکومت کو عدم استحکام سے دو چار کرنے کے لیے مختلف نوعیت کی دہشت گردانہ کاروائیاں ہونے لگیں۔ مارچ 1981 کو پی آئی اے کا ایک طیارہ جو کراچی سے پشاور جا رہا تھا کو ہائی جیک کر لیا گیا جس میں ڈیڑھ سو افراد سوار تھے۔ طیارے میں سوار تین مسلح افراد نے پائلٹ کو کابل کی طرف جانے کا حکم دیا۔ کابل ایئر پورٹ پر طیارے کو خوش آمدید کہا گیا اور ہائی جیکروں کو گلے لگایا گیا۔ اغواء کنندگان تین تھے جن کا سرغنہ اسلام اللہ عرف ٹیپو تھا جو عالمگیر کے جعلی نام سے سفر کر رہا تھا۔ ٹیپو کے بقول الذوالفقار کا سربراہ مرتضیٰ بھٹو تھا۔ کابل ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کے بعد ہائی جیکروں نے اپنے پانچ پاکستانی ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جو کراچی یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے قتل میں ملوث تھے۔ افغان حکومت نے ہائی جیکروں کو مزید جدید اسلحہ فراہم کیا اور پاکستانی مذاکراتی ٹیم کو ایئر پورٹ پر ان سے نہ ملنے دیا گیا۔ پی آئی اے نے ایک اضافی پرواز بھی کابل بھیجی تاکہ مذاکرات کی کامیابی کی صورت میں مسافروں کو واپس لایا جا سکے لیکن افغان حکام نے اسے اپنے ملک میں اترنے کی اجازت نہ دی اور اسے واپس پشاور بھیج دیا۔ افغانستان نے تمام سفارتی اور بین الاقوامی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کو مشورہ دیا کہ وہ ہائی جیکروں کے مطالبات تسلیم کر لے۔ ہائی جیکروں کو افغان حکام نے تمام مطلوبہ سہولتیں بہم پہنچائیں اور ان کے پاس پستول کے بجائے مشین گنیں اور دستی بم بھی آ گئے۔ پاکستان کے سیکرٹری دفاع ایم رحیم خان نے ایک پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ افغان حکومت کی ملی بھگت سے طیارے کو ہائی جیک کیا گیا تھا۔ پاکستانی حکومت کے پاس اس بات کے شواہد موجود تھے کہ مرتضیٰ بھٹو اس واقعہ سے ایک ہفتہ پہلے کابل جا کر ایک اعلیٰ سطح کے دہشت گرد سے بھی ملے تھے جس میں افغان حکومت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ کابل ایئر پورٹ پر بھی مرتضیٰ بھٹو موجود تھے اور انہوں نے افغان حکام کا شکریہ ادا کیا اور ٹیپو کو شاباش دی۔ افغانستان کے کہنے پر ہائی جیکروں نے ایک سو کے قریب قیدیوں کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا جسے پاکستان نے مسترد کر دیا۔ کابل ایئر پورٹ پر مارچ کے پہلے ہفتے ہائی جیکروں نے ایک مسافر

میجر طارق رحیم جو ایران میں پاکستان کے سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری تھے کو قتل کر کے لاش طیارے سے باہر پھینک دی۔ اس قتل کی عالمی سطح پر مذمت کی گئی اور افغانستان کو اس دہشت گردی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ افغانستان پر بین الاقوامی دباؤ بڑھا تو ہائی جیکر طیارے کو شام لے گئے۔ بعد ازاں پاکستان نے 54 قیدی شام بھیج کر مسافروں کو رہائی دلائی۔ پاکستان کے خفیہ اداروں کی فائلوں میں 'پی ایل اے' نامی تنظیم کا نام اور اس کے کارنامے درج ہیں جس کا ہیڈ کوارٹر کابل میں تھا۔ افغان حکام ایک طرف پاکستان سے مذاکرات کے ڈورے ڈال رہے تھے اور دوسری طرف پاکستان مخالف عناصر کی بھرپور مدد کر رہے تھے۔ اس تنظیم کا ہیڈ کوارٹر بعد میں دہلی اور پھر لیبیا منتقل کر دیا گیا۔ افغانستان میں تنظیم کو تخریبی سرگرمیوں کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ 1980 کی دہائی میں اس تنظیم کے افغانستان میں 20 کیمپ موجود تھے جہاں اسے تربیت دی جاتی تھی۔ فروری 1981 میں لاہور میں ایاز سموں، الیاس صدیقی، جاوید ملک اور رحمت اللہ انجم نے چوہدری ظہور الٰہی کو قتل کر دیا۔ قتل کرنے کے بعد یہ چاروں ملزمان پہلے بھارت فرار ہوئے اور وہاں سے افغانستان چلے گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ افغانستان نے ایسے افراد کے لیے ایک محفوظ 'جنت' کا درجہ رکھتا تھا جو پاکستان میں غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔

پاکستان پر افغانستان کی طرف سے یہ الزام تواتر کے ساتھ لگایا جاتا رہا ہے کہ وہ افغانستان میں ایسے عناصر کی مدد کر رہا ہے جو امن و امان خراب کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ 1980 کی دہائی کے آغاز میں افغانستان پر جب روس نے حملہ کیا تو پاکستان نے روس کو افغانستان سے باہر نکالنے کے لیے بھرپور مدد کی۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان سے ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین بھی افغانستان بھیجے گئے۔ ایران میں انقلاب آنے کے بعد جب اس کا عمل دخل پاکستان میں بڑھا تو ایک خاص فرقے کی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اس کے رد عمل میں پاکستان میں بھی کئی فرقہ وارانہ تنظیمیں قائم ہوئیں۔ ان تنظیموں کے کارکنوں نے افغانستان سے ٹریننگ حاصل کر کے ملک میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم کیا جس میں

ہزاروں قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کے لیے افغانستان کے کیمپوں میں اسلحہ اور بارود کے استعمال کی تربیت دی گئی۔ پاکستان سے سینکڑوں افراد افغانستان میں جا کر چھپے ہوئے ہیں جو قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مطلوب ہیں۔ پاکستان نے ہمیشہ کوشش کی کہ افغانستان کو بحران سے نکال کر ترقی وخوشحالی کے راستے پر گامزن کیا جائے لیکن افغانستان نے اس کے برعکس سلوک کا مظاہرہ کیا۔ ایک وقت ایسا تھا کہ افغان حکومت کے اہلکاروں کی تنخواہ تک پاکستان ادا کرتا تھا۔ ایک دفعہ گندم کی ترسیل کا ایشو سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ پاکستانی ڈیلرز گندم افغانستان سمگل کر کے پیسے کماتے ہیں۔ اس موقع پر پاکستانی حکومت نے اعلان کیا کہ افغانستان کی آبادی کو بھی پاکستان کی آبادی میں شامل سمجھا جائے اور اسے اسی طرح گندم فراہم کی جائے جیسے پاکستانی عوام کو دی جاتی ہے۔

جب امریکہ نے نائن الیون کے بعد افغانستان پر چڑھائی کی تو کرزئی کو افغان حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس کے دور میں تو پاکستان مخالف اقدامات کی انتہا کر دی گئی۔ کرزئی نے ڈیورنڈ لائن کے ایشو کو پارلیمنٹ میں پیش کیا اور کہا کہ پاک افغان سرحد کا مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ اگر اس وقت اس مسئلے کو چھیڑا گیا تو دہشت گردی کی جنگ متاثر ہوگی۔ پاکستان کی مخالفت میں افغانستان کی کرزئی حکومت اس حد تک آگے چلی گئی کہ اس نے بھارت کو پاک افغان سرحد کے قریب درجنوں قونصل خانے قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ پاکستان میں دہشت گردی کی ایک بڑی وجہ یہ قونصل خانے ہیں جہاں دہشت گردوں کو تربیت دیکر پاکستان روانہ کیا جاتا۔ پاکستان کے عسکری ادارے اس کے ثبوت کئی بار بھارت کو دے چکے ہیں کہ اس کے تربیت یافتہ دہشت گرد افغانستان میں رہ کر پاکستان کے خلاف کارروائیاں کر رہے ہیں۔

بلوچستان میں حالات خراب کرنے کی ذمہ داری بھی بھارت کے ساتھ ساتھ افغانستان پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اس کے ملک کی سرحدوں کے اندر سے پاکستان کے خلاف منصوبے بنتے اور ان پر عمل کرایا جاتا ہے۔ بلوچستان سے تعلق رکھنے والے درجنوں قانون شکن

افراد افغانستان میں چھپے بیٹھے ہیں پاکستان کی طرف سے کئی باران کی حوالگی کا مطالبہ کیا گیا لیکن افغانستان نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ماضی قریب میں پاکستان سے اہم شخصیات اوران کی اولادوں کواغواء کر کے افغانستان لے جایا گیااور کئی ایک تو کروڑوں ڈالرز کا تاوان دیکر رہا ہوئے جبکہ کچھ کوقتل کر دیا گیا۔ اس ضمن میں سابق گورنر پنجاب سلیمان تاثیر اور سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے بیٹوں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

o
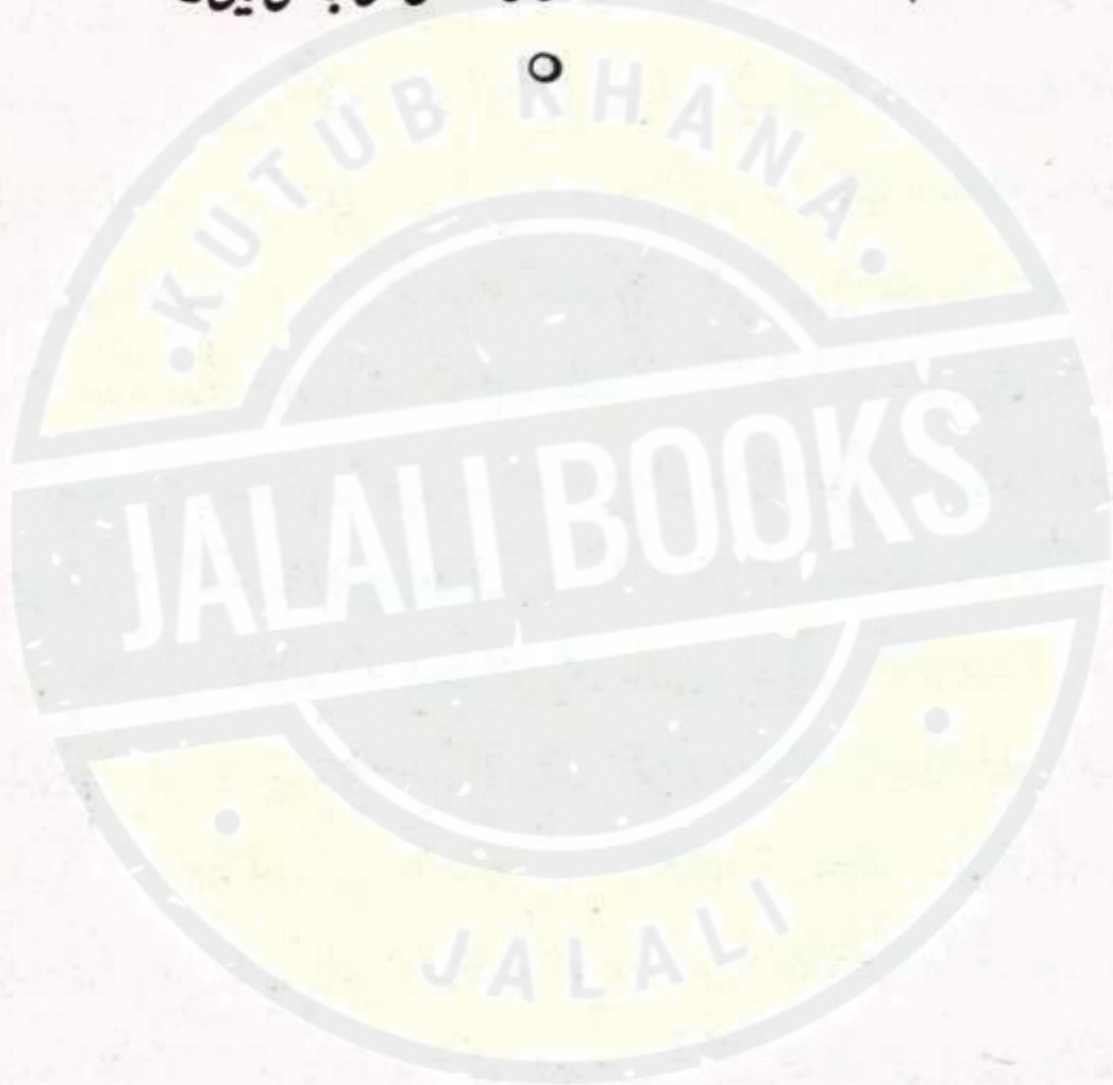
باب نمبر 4

# پاکستان اور اسرائیل

## یہودی قبل مسیح سے اسرائیل میں آباد ہونے تک

آج کے مشرق وسطیٰ کے تقریباً وہ تمام ممالک جہاں جنگ، اندرونی سازشیں اور غیرملکی مداخلت جاری ہیں، کے علاقوں کی تاریخ کے اوراق اسی طرح بکھرے پڑے ہیں جیسے ایک ہزار سال قبل مسیح سے پہلے سامی النسل عبرانی یہودا میں آباد ہونے سے پہلے دنیا میں بکھرے پڑے تھے۔ان کا اہم ترین شہر یروشلم تھا۔ ان کے جنوب میں مصر، شمال میں شام، اشوریہ اور بابل کی مائل بہ تغیر سلطنتیں تھیں جن کے بیچ سے مذکورہ قدیم شہر، جو ایک چھوٹی سی بادشاہت تھی، ایک اہم راستے کی حیثیت سے قائم تھی۔وہ بھی تاریخ عالم، ضابطہ ہائے قوانین، بھجن کی داستانوں، دانش وحکمت کے صحائف، شاعری ونثری ادب کے علاوہ بنیادی سیاسی تصورات کے ان وارثوں کی طرح ہی عالمی نقشے پر ظہور پزیر ہوئے جو اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن سماجی وسیاسی ضابطوں کے مجموعہ کے مرتبین ان کو ہی خیال کیا جاتا تھا جسے عیسائی عہدنامہ قدیم یا عبرانی انجیل کا نام دیتے ہیں۔ان کا مذکورہ بالا ادب اور قوانین تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح میں عالمی ادب میں ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے جن کو بابل میں یکجا کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ان تحریروں کا کافی حصہ، فرعون نیچو دوم کے اشوریہ پر حملے سے، جو ایرانیوں اور میڈیوں سے لڑائیوں میں مصروف تھا ضائع ہو گیا لیکن بابل میں محفوظ کی ہوئی تحریروں سے اسے کئی دہائیاں بعد میں مکمل کیا گیا۔یہودا کا بادشاہ جوشی جب مذکورہ جنگ (اسے قدیم کتب میں میگیڈو کی جنگ کہا گیا ہے) میں مزاحمت کے دوران مارا گیا تو یہودا مصر کا

باج گذار بن گیا۔ لیکن جلد ہی بابل کے بادشاہ نیبو اعظم نے فرعون دوم کو جب مصر تک محدود کر دیا اور اس نے چند علاقائی سرداروں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے بابلی سرکاری اہلکاروں کے ذریعے یہودا کا نظام سنبھالنے کوشش کی جسے لوگوں نے ناکام بنا دیا اور اہلکاروں کو قتل کر دیا۔ اس نے یروشلم کو لوٹا اور جلا دیا، زندہ بچ جانے والوں کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا۔ یروشلم کے یہ قیدی بابل میں 538ء قبل مسیح تک رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سائیرس نے بابل پہ قبضہ کیا اور ان کو جمع کر کے واپس بھیج دیا تا کہ یروشلم میں آباد ہو کر اس کے مندر اور فصیلیں از سر نو تعمیر کر سکیں۔

مغربی مفکرین کو یقین ہے کہ یروشلم کے یہ قیدی مستقبل کے یہودیوں کے سیاسی، مذہبی اور سماجی رہنما تھے جنہوں نے پہلے سے تحریر شدہ لٹریچر میں ثانوی سطح کی معمولی تبدیلی کی اور آس پاس کی ریاستوں میں پھیل کر اپنی علمی برتری کا پرچار کرنے لگے۔ لیکن مذکورہ بالا تحریروں کے بارے مسلم مورخین کا کہنا ہے کہ یہ زمانہ اور اس سے پہلے کی کئی صدیاں انبیاء کے نزول کی صدیاں ہیں جن کے صحائف اور آسمانی کتب میں بعد میں آنے والی قوموں نے تحریف کی جسے یورپی مورخین نے ان کا ادب اور قانون قرار دیا ہے۔ مفتی ابولبابہ شاہ منصور کے نام کے موجودہ زمانے کے ایک مسلم مورخ نے بعض اہل علم کی 'سامری جادوگر اور دجال' میں پائی جانے والی مماثلت سے انکار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بعض اہل علم کی رائے ہے کہ سامری سے مراد حیرم آبیف (صحرایا آصف) مراد ہے۔ یہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ہیکل سلیمانی کے نو بڑے معماروں کا سربراہ تھا اور جنات سے تعلق رکھتا تھا۔ یہودی مذہبی داستانوں کے مطابق اس کو (معاذ اللہ) فرشتوں نے کائنات کی تعمیر کے جادوئی راز بتا دیے تھے۔ اس سے وہ راز لینے کے لیے اسے قتل کر دیا گیا۔ یہود کی بدقسمتی دیکھیے کہ وہ اللہ کے سچے پیغمبر حضرت سلیمانؑ سے اپنی نسبت کرتے ہیں لیکن ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ ان پر جھوٹے بہتان لگاتے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ حیرم کو دیوتا (الوہی شخصیت) تصور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق قرآن شریف میں جو یہ مذکور ہے: "اور (ہم نے) جنوں کو اس (سلیمان) کا تابع فرمان بنا دیا جن میں ہر قسم کے معمار اور غوطہ خور تھے"۔ (سورہ ص: 37) ان معماروں جنوں میں حیرم آبیف بھی تھا۔ نیز آیت قرآنی "اور ہم نے آزمایا سلیمان کو اور ڈال دیا اس کی

کرسی پر ایک جسم۔۔۔۔۔'' سے یہی حیرم آبیف مراد ہے جس نے مسخ شدہ یہودی روایات کے مطابق سلیمانی انگوٹھی چرائی تھی اور تخت سلیمانی پر قابض ہو گیا تھا۔ اس اسرائیلی روایت کو ہمارے مفسرین نے نقل کیا ہے اور اس پر سخت تردید کی ہے۔ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ یہ روایت بیان کرتے ہیں جو علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق یہودی علماء سے لی گئی ہے:

''حضرت سلیمانؑ کو حکم دیا گیا کہ بیت المقدس اس طرح تعمیر کریں کہ لوہے کی آواز سننے میں نہ آئے۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ تب انہوں نے ایک جن کے بارے میں سنا جس کا نام صخر یا آصف تھا۔ وہ اس تکنیک سے آگاہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے آصف کو بلایا۔ اس نے ہیرے کے ساتھ پتھروں کو کاٹنے کا عمل دکھایا۔ اس طریقہ سے شرط پوری ہو گئی۔ چنانچہ ہیکل سلیمانی یا بیت المقدس تعمیر ہو گیا۔ ایک دن حضرت سلیمانؑ غسل کے لیے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی انگوٹھی آصف کے حوالے کی۔ یہ انگوٹھی بہت مقدس اور سلیمانؑ کی سلطنت کی مہر تھی (ایک اور روایت کے مطابق سلیمانؑ نے یہ انگوٹھی اپنی ایک بیوی کو دی جس سے آصف نے لے لی) آصف نے یہ انگوٹھی سمندر میں پھینک دی اور خود سلیمانؑ کا روپ دھار لیا۔ اپنا چہرہ اور وضع قطع تبدیل کر لی۔ اس طرح آصف نے سلیمانؑ کی سلطنت اور تخت چھین لیا۔ آصف نے سلیمانؑ کی سوائے بیویوں کے ہر چیز پر اختیار حاصل کر لیا۔ اب اس نے بہت سے کام ایسے شروع کر دیے جو اچھے نہیں تھے۔ حضرت سلیمانؑ کے ایک صحابی نے بھانپ لیا کہ یہ سلیمانؑ کے روپ میں آصف ہے لہٰذا کچھ سوالوں کے جواب نہ دے سکنے پر اس کی حقیقت لوگوں پر عیاں ہو گئی۔ سلیمانؑ نے اس سے اپنا تخت اور سلطنت واپس لے لی اور آصف کو گرفتار کر لیا''۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر جلد 3 صفحہ 300)

18 ویں اور 19 ویں صدی میں کچھ مصنفین نے قومی تفاخر یا کسی دوسری ''مصلحت'' کے تحت تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ یہودی چونکہ حضرت سلیمانؑ کے سچے پیروکار نہیں تھے اس لیے انہوں نے اس داستان میں کئی توہین آمیز واقعات بھی شامل کر دیے۔ کچھ مشرقی مورخین نے بھی ایسے واقعات کو 'فری میسن' تحریک کی تاریخ میں نقل کیا جو مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث بنے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل کتاب (یہودیوں) کا ایک گروہ اس بات پر ایمان نہیں رکھتا تھا کہ حضرت سلیمانؑ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے زیادہ

امکان یہی ہے کہ ایسے لوگوں نے یہ داستانیں وضع کرلی ہوں۔" الغرض حیرم آبیف نامی انسانی جن یا جناتی انسان یہود کی محرف داستانوں کے مطابق "کائنات کا گرینڈ آرکیٹکٹ" تھا۔ اسے مقدس ہیکل کے کلس پر لے جایا گیا۔ اس کی ایک آنکھ خراب تھی۔ اس پر مرتے وقت تشدد کیا گیا جس سے اس کا حلیہ بگڑ گیا۔ یہود کی عالمی تنظیم "فری میسن" کی مخصوص علامت حرف G کا اشارہ God کی طرف نہیں، یہ The Grand Architect Of The Univers کا مخفف ہے۔

ہربرٹ جارج ویلز (1946-1866) عبرانی انجیل اور عہد نامہ قدیم کے حوالے سے لکھتا ہے کہ بابل کی اسیری نے انہیں مہذب اور مستحکم بننے میں مدد دی۔ وہ لوٹے تو اپنے ادب کی افادیت سے آگاہ تھے، وہ مکمل طور پر خود شعور اور سیاسی بصیرت کے حامل لوگ بن گئے۔ تب ان کی انجیل عہد عتیق کی ابتدائی پانچ کتابوں پر ہی مشتمل تھی جسے عہد نامہ قدیم کا نام سے ہم جانتے ہیں۔ یہ کتب کئی ایک دیگر کتب کا مجموعہ تھیں۔ یہ مختلف قصص، مناجات اور ضرب الامثال پر مشتمل ہیں۔ آفرینش کائنات، آدم وحوا اور سیلاب عظیم کی حکائتیں بابلی دیو مالا سے گہری مماثلتیں رکھتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ساری سامی النسل لوگوں کے مشترکہ عقائد کی صورتیں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹوں اور حضرت موسیٰؑ اور کنعان کا زمانی ترتیب کے بغیر ذکر کرنے کے بعد ہربرٹ لکھتا ہے کہ موسیٰؑ شہر موعودہ کے سنگلاخ مضافات کو فتح کرنے کے علاوہ وہ کچھ اور حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اب ساحل کنعانیوں کے ہاتھ سے نکل کر نوواردوں کے اختیار میں آچکا تھا۔ یہ نئے اجنبی لوگ فلسطینی تھے۔ ان کے شہروں غزہ، غات، اشدد، اسکالن اور جوپا نے عبرانیوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ بعد ازاں کئی نسلوں تک آل ابراہیم ملک کے پسماندہ سنگلاخ علاقے کے غیر اہم لوگوں کی حیثیت سے رہی اور فلسطینیوں، قریبی قبائل جیسے موبائی اور میدینائی قبائل سے تصادم اور لوٹ مار میں مصروف رہی۔ کتاب انصاف میں ان کی سرگرمیوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد عبرانیوں نے ایک بادشاہ 'ساول' کو جنگی قیادت کے لیے منتخب کیا جو جلد ہی فلسطینیوں کے ساتھ ایک جنگ میں ان کے تیروں سے مارا گیا۔ رابرٹ کے بقول 'ساول' کی جنگ میں موت کے بعد حضرت داؤدؑ کا دور شروع ہوا اور وہ ایک کامیاب بادشاہ ثابت ہوئے کیونکہ یہی دور عبرانیوں کی آسودگی

کا دور تھا جس کے ٹائر کے فونیشین شہر سے قریبی تعلقات تھے جو بادشاہ حرم کا پایہ تخت تھا۔ حرم ایک زیرک اور متحرک انسان تھا جو عبرانی علاقوں سے بحیرہ احمر کی طرف ایک محفوظ تجارتی راستہ بنانا چاہتا تھا کیوں کہ مصر میں انتشار سے تجارت متاثر ہوتی تھی۔ حرم نے داؤدؑ اور اس کے بیٹے سلیمان سے قریبی تعلقات پیدا کر لیے، اس کی مدد سے ہی یروشلم کے مندر، محل اور فصیلیں استوار ہوئیں۔ اس کے بدلے میں بادشاہ حرم نے اپنے بحری جہاز بنائے اور انہیں بحیرہ اسود میں اتارا۔ یروشلم کے راستے بہت سا تجارتی سامان جنوب اور شمال کی طرف جانے لگا۔ سلیمانؑ کے دور میں خوشحالی اپنے عروج پر پہنچ گئی جو ان لوگوں کے لیے غیر متوقع تھی۔

اس بادشاہت کا تقابل اگر ایشیاء سے کیا جائے تو یہ ایک چھوٹی اور کمزور سلطنت تھی جس پر سلیمانؑ کی وفات کے بعد مصر کے 22 ویں شاہی خاندان کے پہلے فرعون شیشک نے یروشلم پر قبضہ کر لیا اور اس کے تمام خزانوں کو لوٹ لیا۔ بائبل کے بیان کے مطابق سلیمانؑ نمود نمائش کے عادی تھے۔ انہوں نے عوام پر زیادہ ٹیکس لگائے، انہیں زیادہ کام کرنے پر مجبور کیا۔ ان کی وفات کے فوری بعد بادشاہت کا شمالی حصہ یروشلم سے جدا ہو گیا اور اسرائیل کی ایک خود مختار سلطنت قائم ہوئی۔ یروشلم البتہ یہودا کا اہم شہر رہا۔ عبرانیوں کی فارغ البالی چند روزہ تھی۔ ٹائر نے اپنی امداد بند کر دی، مصر پھر طاقتور ہو گیا، اسرائیل کی تاریخ چھوٹی ریاستوں اور چھوٹے بادشاہوں کی تھی، جن کے درمیان ایک طرف شام کا خطہ تھا اور دوسرا اشوریہ کا۔ شمال میں بابل اور جنوب میں مصر واقع تھا۔ یہ تباہیوں اور فیصلوں کی داستان ہے، فیصلے جنہوں نے فقط تباہی کو موخر کیا۔ یہ وحشی بادشاہوں کا قصہ ہے جو وحشی قوموں پر حکمران تھے۔ 721 قبل مسیح میں اشوریوں نے اسرائیلیوں کو مغلوب کر کے اپنا قیدی بنا لیا جب کہ یہ لوگ کلی طور پر منظر سے غائب ہو گئے۔ یہودا نے 604 قبل مسیح تک اسرائیل کو تقسیم کر دیا۔ مصنفین کے زمانے میں عبرانی تاریخ کا قصہ قابل تنقید تفصیلات سے مملو ہے۔ تاہم مذکورہ بالا واقعات 19 ویں صدی میں مصر، اشوریہ اور بابل میں سے کھود کر لائی گئی شہادتوں کی بنیاد پر پیش کیے گئے ہیں۔

## پیغمبروں اور پروہتوں کے پیروکار

سامی النسل لوگ سب سے پہلے اشوریہ اور بابل کے زوال کے وقت تباہی سے

دوچار ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو یکجا کیا اور تہذیب سیکھ لی۔ وہ جلد ہی اشوری سلطنت کے مالک بنے اور ساتویں صدی قبل مسیح میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ تمام مہذب دنیا سامی النسل فرمانرواؤں کی مطیع ہو جائے گی۔ اشوری، بابلی اور شامی سبھی سامی النسل تھے جنہوں نے مصر فتح کیا۔ دنیا کا تجارتی نظام سامیوں کے ہاتھوں میں تھا اور یہ باہم مماثل زبانیں بولتے تھے۔ خوشحالی سے پائیدار معاشرت اور حکومت کی بدولت نئے شہر اور آبادیاں وجود میں آنے لگیں جو سسلی، سپین اور افریقہ تک پھیل گئیں۔ 8 سو سال قبل مسیح میں آباد ہونے والے کارتھیج کی آبادی 10 لاکھ کی حد کو چھونے لگی۔ اس عظیم شہر سے نکلنے والے بحری جہاز برطانیہ، بحراوقیانوس حتیٰ کہ مارہرہ تک پہنچ گئے۔ فرعون نیچو جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں کے دور میں ایک فونیشن بیڑے نے کامیابی سے افریقہ کا چکر مکمل کیا۔ اس زمانے میں، ایچ جی ویلز کے بقول آریائی لوگ ابھی تک وحشی تھے جبکہ یونان تہذیب کی ان سیڑھیوں کی تعمیر کر رہا تھا جن کے ذریعے اس نے دنیا کو فتح کرنے کے لیے اوپر جانا تھا۔ لیکن میڈی لوگ ناقابل تسخیر قوت بن رہے تھے۔ وسطی ایشیا میں ایک اشوری دور کی تختی دریافت ہوئی ہے جس پر یہی الفاظ درج ہیں۔

آٹھ سو قبل مسیح میں یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے آریائی زبان بولنے والے لوگ سامی النسل لوگوں کی بادشاہتوں کو تاراج کر کے فاتحین بن جائیں گے اور سامی اسیر یا ماتحت ہوں گے یا پھر اطراف میں منتشر ہو جائیں گے۔ سوائے عرب کے شمالی صحراؤں کے جہاں خانہ بدوشی پر مبنی طرز معاشرت بدوؤں کے مزاج میں رچ بس چکی تھی ان پر ہر طرف سے افتاد پڑی۔ کیونکہ تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ آریائی کبھی عرب بدوؤں کو اپنا مطیع نہ کر سکے۔ پانچ صدیوں کی مسلسل پسپائی اور وقفے وقفے سے برپا ہونے والی بربادی کے دوران ایک قوم آریاؤں کی آنکھ سے اوجھل رہی جو متحد تھی اور اپنی قدیم روایت سے بھی وابستہ تھی۔ یہ وہی یہودی تھے جن کو سائرس اعظم نے بابل سے واپس بھیجا تھا اور وہ اپنے صحائف اور بائبل کو یکجا کر چکے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ بائبل نے یہودیوں کو مستحکم کیا جس سے مختلف تصورات نے نمو پائی جو دیگر لوگوں کے تصورات سے بھی مختلف تھے۔ ایسے تصورات جن سے ان کو مہم جوئی اور جفاکشی میں مدد ملی اور وہ 25 صدیوں تک جبر سے جڑے رہے۔ ان

صیہونی تصورات میں سب سے اہم اور نمایاں تصور یہ تھا کہ ان کا خدا قوت کا سرچشمہ تھا جو بعید از قیاس فاصلے پر تھا۔ دیگر اقوام کے ملکی اور مندروں کے خداؤں کے برعکس ایسا خدا جسے ہاتھوں سے نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ قدیم تصور کے بجائے ایک نیا تصور تھا جس میں مندر کی مسماری، شبیہ کے توڑنے کے باوجود خدا باقی تھا جو آسمانوں پر تخت نشیں تھا۔ پروہتوں اور قربانی کی رسم سے بہت بلند۔ یہودیوں میں یہ عقیدہ پختہ ہو چکا تھا کہ ابراہیمؑ کے خدا نے ان کو اپنے خاص بندوں میں چن لیا تھا تا کہ یروشلم کو بحال کر سکیں، اسے دنیا بھر کی سچائی کا مرکز بنا سکیں۔ بابل کی اسیری گزار کر لوٹنے والوں کو اس عقیدے نے ایک ہی رنگ میں رنگ دیا تھا۔

یہ الوہی پیغام کی کشش اور آسمانی نعمتوں کی ترغیب تھی جس نے اردگرد پھیلے ہوئے بابلیوں، شامیوں اور مشترکہ رسوم وعادات اور روایات کی حامل اقوام کو، اس متاثر کن عقیدے میں دلچسپی لیتے ہوئے پیروی کرنے پر مجبور کیا۔ الہامی الفاظ کی طاقت نے ان کو یکجا کیے رکھا۔ ٹائر، سائیڈن، کارتھیج اور ہسپانوی فونیشن کے زوال کے فونیشن قوم یک دم تاریخ سے غائب ہو گئی۔ اور سپین، افریقہ، مصر، عرب اور مشرق میں یہودی آبادیاں قائم رہیں جن کا دارالخلافہ یروشلم تھا۔ مندر اور دربار سے چمٹے ہوئے یہودی جو رہنمائی کے لیے پروہتوں کی حکمت اور فرزداؤں کی خواہش کے اسیر تھے ان سے نجات حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ میں ایک نئی اور قائدانہ قوت محسوس کرنے لگے۔ وہ غیر متجانس عناصر کے باوجود یکجا اور مستحکم ہوئے۔ ان میں نئی طرح کے انسانوں جو ماورائی قوت اور حکمت کے حامل تھے کا ورود ہو چکا تھا۔ آگے چل کر جوں جوں منقسم عبرانیوں کے مصائب میں اضافہ ہوتا گیا ان پیغمبروں کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں مشترک بات یہی تھی کہ انہوں نے خدا کی عظمت کو بیان کیا اور براہ راست انسانوں سے مخاطب ہوئے۔ وہ کسی اجازت نامے اور حوالے کے بغیر آئے تھے۔ انہوں نے پروہتوں کے نظام کی بے معنویت اور بادشاہ کے سنگین گناہوں پر صدائے احتجاج بلند کی۔

## مسلم دورِ حکومت میں یہودیوں کی تاریخ

اسرائیلی اور یہودا کے علاقوں کے علاوہ یہودی کم از کم 2700 سال (بابلی قبضہ)

پہلے سے مشرق وسطیٰ میں رہتے آرہے تھے۔ اسلام کے جزیرۃ العرب سے مشرق وسطیٰ میں پھیلنے کے بعد یہودی بھی، عیسائیوں اور پارسیوں کے ساتھ ساتھ ذمیوں کی ہی ایک خاص قانونی حیثیت رکھتے تھے۔ معاہدوں کے ذریعے خاص حقوق کے تفویض کیے جانے کے بعد، قرون وسطیٰ کے یورپ کے کچھ حصوں برعکس، مذہبی عقائد کی بنیاد پر ان کو ظلم کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ ایک طویل مگر غیر یقینی عرصے تک یہودیوں کی ایک بڑی تعداد عرب میں مقیم تھی۔ مورخین کا دعویٰ ہے کہ 80,000 یہودی پہلے مندر کی مسماری کے بعد عرب میں پہنچے جہاں پہلے سے وادیء خیبر، مدینہ اور مکہ میں ان کی تجارتی آبادیاں قائم تھیں۔ (جہاں ان کے اپنے قبرستان بھی تھے) ایک دوسرے نقطہ نظر کے مطابق، یہ یہودی بازنطینی ظلم وستم سے تنگ آئے ہوئے پناہ گزین تھے۔ عرب مورخین نے 20 کے قریب یہودی قبائل کا ذکر کیا ہے جن میں 'کوہانم' کے قبیلے بھی شامل تھے۔ ہجرت کے فوری بعد تحریر کیے جانے والے میثاق مدینہ میں شہر کے اندر اسلامی ماحول میں رہنے والے یہودیوں کی مذہبی اور سماجی حیثیت کے متعلق کچھ نکات کو مد نظر رکھا گیا۔ مثال کے طور پر میثاق میں بیان کیا گیا کہ "یہودی اور مسلمان اپنے اپنے مذہب کو مانیں گے"۔ اور وہ اپنے اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے"۔ جنگ بدر کے بعد یہودیوں کے قبیلے بنو قینقاع نے حضرت محمد ﷺ سے کیے گئے معاہدے کو توڑ دیا تو آپ ﷺ نے اسے جنگ کا جائز سبب گردانا اور بنو قینقاع کا محاصرہ کیا جن کے سرنڈر کرنے پر قبیلے کو مدینہ بدر کر دیا گیا۔ اس کے دوسرے سال قبیلہ بنو نظیر کو محمد ﷺ کو جان سے مارنے کی منصوبہ بندی کے الزام میں مدینہ سے خروج کرنا پڑا۔ تیسرا بڑا یہودی قبیلہ بنو قریظہ تھا جسے جنگ خندق میں مسلمانوں سے غداری کے جرم میں مدینہ سے نکال دیا گیا۔ ان واقعات کے بعد درجنوں یہودی قبائل عرب میں پرامن طریقے سے رہتے رہے۔

عرب میں اسلامی حکومت کے قیام کے 20 سال بعد خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی خلافت میں ان کو خلیفہ نے عرب کی سرحدوں سے باہر نکل جانے کا حکم دیا سوائے جنوب اور مشرقی عرب سے۔ یہ حکم ایک حدیث کی روشنی میں دیا گیا تھا جس کا مفہوم ہے کہ 'عرب میں دو مذاہب نہیں رہ سکتے'۔ اس قول کے مطابق شمال میں خیبر کے یہودی اور نجران کے عیسائی مراد تھے۔ لیکن بحر احمر کی جدہ کی بندرگاہ پر یہودی تاجروں کے بدستور قیام کی اجازت دیدی گئی۔

## قرون وسطیٰ سے خلافت عثمانیہ تک

قرون وسطیٰ کے زمانے میں مسلم دور حکومت کے دوران یہودیوں نے رواداری اور وحدت کا مظاہرہ کیا۔ کچھ مورخین نے اس دورانیہ کو یہودیوں کے لیے ایک سنہری دور قرار دیا ہے جس میں ان کو زیادہ مواقع میسر تھے۔ قاہرہ یونیورسٹی میں 'قرون وسطیٰ کی تاریخ' کے ایک پروفیسر عبدالفتح کا کہنا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں اسلامی دور حکومت میں یہودی لوگ تسلی بخش زندگی گزارتے تھے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کا باہمی رویہ برادرانہ تھا حتیٰ کہ وہ، دونوں کے مذہبی اختلافات سے واقف تھے۔ ایک دوسرے مصنف میریلن سوارٹز کے مطابق یہ وقت یہودیوں کے لیے ایک نئے دور کی طرح تھا جس میں رواداری کے برتاؤ نے عرب کے اسلامی معاشرے میں یہودیوں کو قومی وحدت میں ضم کر دیا۔ یہودی قومی وحدت نے ان کو زندگی کے نئے شعبوں میں ترقی کرنے کی راہ ہموار کی جن میں ریاضی، اجرام فلکی، فلسفہ، کیمسٹری اور لسانیات شامل ہیں۔ انہوں نے اسلامی دور حکومت میں کئی سیاسی کارہائے نمایاں بھی انجام دیے۔ اسی طرح اقتصادی حوالے سے بھی انہوں نے اپنے آپ کو متحرک رکھا جس سے عرب کی منڈیوں میں وہ ایک نمایاں مقام حاصل کر گئے۔ 'لیون پولیاکوو' لکھتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں یہودیوں کو کئی استحقاقات حاصل تھے اور ان کے طبقے خوشحال تھے۔ ان کو یورپ کی طرح، کاروباری سرگرمیوں کی انجام دہی میں کسی قانونی یا سماجی رکاوٹ کا سامنا نہ تھا۔ ان کو اسلامی دور میں کسی مخصوص پیشے سے دور نہ رکھا گیا جس نے ان کے منفی تاثر کو زائل یا کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہت سے یہودیوں نے مسلم فاتحین کے نئے مفتوحہ علاقوں میں ہجرت کر کے نئی بستیاں آباد کیں۔ بغداد یہودی بینکاروں کے سرمائے سے ایک مضبوط مرکز تھا جہاں کروڑوں درہم کی معاشی سرگرمیاں روزانہ ہوتی تھیں۔ مخصوص بحری حصوں اور غلاموں کی تجارت کے انچارج یہودی تھے۔ 10ویں صدی میں خلافت کی مرکزی بندرگاہ سیارف کا گورنر ایک یہودی تھا۔

ایک مورخ مارک آر کوہن لکھتا ہے کہ، مسلم دور حکومت میں یہودیوں کی زندگی کے متعلق، حقائق جاننے کے لیے تقابلی جائزے کی ضرورت ہے۔ مسلم حکومتوں میں، مغربی عیسائی حکومتوں کی نسبت، یہودیوں پر بہت کم جسمانی تشدد کیا گیا۔' کوہن' کا موقف ہے کہ اس

کی وجہ شائد یہ ہے کہ عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کو یہودیت سے الگ شناخت کی ضرورت نہیں۔کوہن مزید لکھتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں یہودیوں کو عیسائیوں کی نسبت مسلمانوں سے کم خطرہ تھا۔انفرادی سطح پر ایذ ارسانی کے واقعات رونما ہوتے رہے لیکن یہ اس حقیقت کو تبدیل نہ کر سکے کہ یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ درست تھا۔

ایشیا صغیر میں یہودی 2,400 سے آباد چلے آرہے تھے جہاں سے انہیں ابتدا میں پانچویں اور گیارھویں صدی کے درمیان بازنطینی حکومت کے دوران باہر نکالا گیا تھا۔اس خطے میں وہ دوبارہ مسلم سلجوقی افواج کے قبضے کے بعد آباد ہوئے۔ یہودی تہذیب کو سلجوقی اور خلافت عثمانیہ کے دور حکومت میں پنپنے کا موقع ملا جبکہ ترکی ان کے لیے بعد میں ایک لمبے عرصے تک 'محفوظ جنت' کی طرح تھا جہاں وہ دیگر خطوں سے تکلیف کے مارے آکر آباد ہوتے رہے۔ترکی میں یہودیوں کی آمد جاری رہی جو 26,000 نفوس تک پہنچ گئی۔مسلم ممالک میں ایران کے بعد ترکی میں دوسری بڑی آبادی یہودیوں کی ہے۔

سلطنت عثمانیہ، 1492 میں مسلم سپین کے زوال کے بعد ہسپانیہ اور اسکے زیر اثر حصوں، سے نکالے گئے یہودیوں کے لیے ایک محفوظ مقام کا درجہ رکھتی تھی۔یہی صورتحال شمالی افریقہ کی تھی جہاں اہم اور بڑے عرب شہروں میں یہودی کوارٹرز (محلوں) کی بنیادیں رکھی گئیں۔ بعد ازاں تبدیل شدہ یہودیت کو سپین سے دیس نکالا ملا تو اس نے سرکاری رومن کیتھولک سے رجوع کرلیا۔

## 20ویں صدی اور اسرائیل کا قیام

آج اسرائیل مشرق وسطیٰ کی ایک صیہونی ریاست ہے جو سرزمین فلسطین پر قبضہ کر کے بنائی گئی۔ پاکستان سمیت دنیا کے کئی مسلم ممالک اسرائیل کو ملک تسلیم نہیں کرتے۔ آسٹروی یہودی تھیوڈور ہرتزل یا تیفادار ہرتزل سیاسی صیہونیت کا بانی ہے۔وہ بڈاپسٹ میں پیدا ہوا اور ویانا میں تعلیم پائی۔اس کا اصلی نام بن یامین بتایا جاتا ہے۔اس نے جرمن زبان میں ایک کتاب ''ڈر جوڈن شٹاٹ''یعنی یہودی ریاست لکھی جس کا انگریزی ترجمہ اپریل 1896 میں ہوا۔اس ریاست کے قیام کے لئے ارجنٹائن یا مشرق وسطیٰ کا علاقہ تجویز کیا گیا تھا۔

برطانوی حکومت نے ارجنٹائن میں یہودی ریاست قائم کرنے کی سخت مخالفت کی اور اسے فلسطین میں قائم کرنے پر زور دیا۔ لارڈ بیلفور نے 1905ء میں جب وہ برطانیہ کا وزیرِ اعظم بنا تو برطانیہ میں یہودیوں کا داخلہ روکنے کے لئے ایک قانون منظور کرایا اور اُس کے بعد برطانیہ نے یہ ڈکلیریشن منظور کی' حکومت برطانیہ اِس کی حمائت کرتی ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کا وطن بنایا جائے'۔ اس کے بعد باسل، سوئٹزرلینڈ میں صیہونی کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں فلسطین میں خالص صیہونی ریاست بنانے کی منظوری دی گئی اور ساتھ ہی بین الاقوامی صیہونی تنظیم بنائی گئی تا کہ وہ صیہونی ریاست کا قیام یقینی بنائے۔ اس ریاست کا جونقشہ بنایا گیا اس میں دریائے نیل سے لے کر دریائے فرات تک کا سارا علاقہ شامل دکھایا گیا یعنی مصر کا دریائے نیل سے مشرق کا علاقہ بشمول پورٹ سعید۔ مکمل فلسطین۔ اردن اور لبنان، شام اور عراق کا دو تہائی علاقہ اور سعودی عرب کا ایک چوتھائی علاقہ اس میں شامل تھا۔

فلسطین میں یہودی ریاست بنانے کے لئے وہاں بڑی تعداد میں یہودی داخل کرنا مندرجہ بالا پروگرام کا اہم حصہ تھا اور اس کے لئے مسلمانوں کو فلسطین سے باہر دھکیلنا بھی ضروری قرار پایا۔ 1895ء میں تھیوڈور ہرتسل نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا'' ہم فلسطین کے غریب عوام کو فلسطین سے باہر ملازمت دلانے کا چکمہ دینے کی کوشش کریں گے اور ساتھ ہی اُن کو فلسطین میں ملازمت نہیں کرنے دیں گے''۔

باقی صیہونیوں نے راست اقدام کا منصوبہ بناتے ہوئے مندرجہ ذیل فیصلہ کیا:

'' جونہی ہماری تعداد فلسطین میں زیادہ ہو گی، ہم زمینوں پر قبضہ کر لیں گے۔ ہم طاقتور ہو جائیں گے پھر ہم دریائے اُردن کے بائیں طرف کے علاقہ کی خبر لیں گے اور فلسطینیوں کو وہاں سے بھی نکال دیں گے۔ وہ جائیں عرب ملکوں کو۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ جب اس طرح کافی یہودی آباد ہو جائیں گے تو اس وقت برطانیہ فلسطین میں حکومت یہودیوں کے حوالے کر دے گا''۔ مگر ہوا یہ کہ شروع میں کچھ فلسطینی عربوں نے اپنی زمین یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی مگر باقی لوگوں نے ایسا نہ کیا جس کے نتیجہ میں باون سال گزرنے کے بعد 1948ء میں فلسطین کی صرف 6 فیصد زمین یہودیوں کی ملکیت تھی۔ یہودیوں نے 1886ء سے ہی یورپ سے نقل مکانی کر کے فلسطین پہنچنا شروع کر دیا تھا جس سے 1897ء میں فلسطین میں

یہودیوں کی تعداد دو ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ اُس وقت فلسطین میں مسلمان عربوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زائد تھی۔ 1903ء تک یورپ اور روس سے ہزاروں یہودی فلسطین پہنچ گئے اور ان کی تعداد 25000 کے لگ بھگ ہوگئی۔ 1914 تک مزید چالیس ہزار کے قریب یہودی یورپ اور روس سے فلسطین پہنچے۔

## خفیہ معاہدہ

لارڈ بیلفور نے 1905ء میں جب وہ برطانیہ کا وزیر اعظم تھا تو اس خیال سے کہ کہیں روس میں قتل عام کی وجہ سے یہودی برطانیہ کا رُخ نہ کر لیں۔ برطانیہ میں یہودیوں کا داخلہ روکنے کے لئے ایک قانون منظور کرایا اور پھر کمال عیاری سے متذکرہ بالا ڈیکلیریشن منظور کرائی۔ مصر میں برطانیہ کے ہائی کمشنر ہنری میک موہن نے 1916ء میں وعدہ کیا کہ عربوں کے وہ علاقے جو سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے آزاد کر دیئے جائیں گے مگر برطانیہ نے عیاری برتتے ہوئے ایک خفیہ معاہدہ "سائیکس پیکاٹ" کیا جس کی رو سے برطانیہ اور فرانس نے عربوں کے علاقہ کو اپنے مشترکہ انتظام کے تحت تقسیم کر لیا۔

چنانچہ مصر سے بدعہدی کرتے ہوئے انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر 1918ء میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ جمعیت الاقوام (لیگ آف نیشنز) نے 25 اپریل 1920 کو فلسطین پر انگریزوں کے قبضہ کو جائز قرار دے دیا۔ برطانیہ نے مزید عیاری یہ کی کہ 1917ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ آرتھر بیلفور نے برطانیہ کی طرف سے لارڈ راتھ شِلڈ نامی صیہونی لیڈر کو ایک خط لکھا جس میں فلسطین میں یہودی ریاست بنانے کی یقین دہانی کرائی۔ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کا مقصد ایک صیہونی اڈا بنانا تھا جو وہاں سے فلسطینیوں کے انخلاء اور ان کی جائیدادوں پر قبضے کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جوں جوں یورپ سے یہودی آتے گئے توں توں فلسطینیوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ برطانیہ نے دوسری جنگ عظیم سے ہوش سنبھلنے کے بعد 1947ء میں فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا۔ اس وقت تک فلسطین میں یہودیوں کی تعداد ایک تہائی ہو چکی تھی لیکن وہ فلسطین کی صرف 6 فیصد زمین کے مالک تھے۔ اقوام متحدہ نے ایک کمیٹی بنائی جس نے سفارش کی کہ فلسطین کے

ساڑھے 56 فیصد علاقہ پر صرف 6 فیصد کے مالک یہودیوں کی ریاست اسرائیل بنادی جائے اور ساڑھے 43 فیصد علاقہ میں سے بیت المقدس کو بین الاقوامی بنا کر باقی تقریباً 40 فیصد فلسطین کو 94 فیصد فلسطین کے مالک مسلمانوں کے پاس رہنے دیا جائے۔ 29 نومبر 1947 کو جنرل اسمبلی نے 13 کے مقابلہ میں 33 ووٹوں سے اس کی منظوری دے دی۔ 10 ممبر غیر حاضر رہے۔ فلسطینیوں نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا اور صیہونیوں نے فلسطینی مسلمانوں پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔

## صیہونی دہشت گردی

صیہونیوں نے بیت المقدس میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل اڑا دیا جس میں 91 آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ ان میں برطانوی فوجی۔ فلسطینی مسلمان۔ عیسائی اور چند یہودی شامل تھے۔ برطانوی حکومت پہلے ہی مزید یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے امریکی دباؤ سے پریشان تھی۔ برطانوی فوجیوں کی ہلاکت کی وجہ سے برطانیہ کے اندر حکومت پر فلسطین سے فوجیں نکالنے کا دباؤ پڑنے لگا۔ چنانچہ برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ وہ فلسطین میں اپنی حکومت 15 مئی 1948 کو ختم کر دے گا۔ صیہونیوں نے جن کے لیڈر معروف دہشت گرد تھے فلسطینیوں پر حملے اور ان کا قتل تو پہلے ہی شروع کر دیا تھا لیکن 1948ء میں اچانک فلسطین کے مسلمانوں پر بڑے پیمانہ پر عسکری کمانڈو حملے کر کے یہودیوں نے بیت المقدس کے مغربی حصہ اور کچھ دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ امریکہ صیہونیوں کی پشت پر تھا اور ان کو مالی اور فوجی امداد مہیا کر رہا تھا۔

## صیہونی ریاست کے قیام کا اعلان

روس، یورپ اور بالخصوص امریکہ کی مدد سے یہودیوں نے 14 مئی 1948 کو 4 بجے بعد دوپہر اپنی دو ہزار سال پرانی آرزو "یہودی ریاست اسرائیل" کا اعلان کر دیا۔ مسلم عربوں کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔ یہ دراصل صیہونی ریاست تھی کیونکہ کئی یہودی مذہبی پیشواؤں نے اس کی مخالفت کی۔ اگلے دن برطانیہ کے بقیہ فوجی بھی اپنی چھاؤنیاں صیہونیوں

کے حوالے کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد مار دھاڑ روز کا معمول بن گیا۔ صیہونی مسلح دستے مسلمان عربوں کی املاک پر قبضہ کرتے چلے گئے کیونکہ وہ دہشت گرد تنظیموں کے تربیت یافتہ کمانڈو تھے اور انہیں امریکہ اور برطانیہ کی امداد بھی حاصل تھی۔ یہودیوں کی دہشت گرد تنظیموں کے نام بدل دیے گئے۔ کیونکہ وہ یورپ میں بھی دہشت گردی کر چکی تھیں جن کو وہاں دہشت گرد قرار دیا جا چکا تھا۔ ان کے مشہور نام یہ ہیں۔ ہاگانہ، اوردے ونگیٹ، ارگون، لیہی، لیکوڈ، ہیروت، مالیدت وغیرہ۔ ان کے چند مشہور سرپرستوں کے نام یہ ہیں: موشے دیان جو 1953 سے 1957ء تک اسرائیل کی مسلح افواج کا چیف آف سٹاف رہا۔ مناخم بیگن جو 1977 میں اسرائیل کا وزیراعظم بنا۔ یتزہاک شمیر جو 1983 میں وزیراعظم بنا۔ ایریئل شیرون جو سابقہ وزیراعظم ہے۔ موشے دیان کو دہشت گرد ہونے کے باوجود برطانوی فوج میں کسی خاص کام کے لئے کچھ عرصہ کے لئے بھرتی کیا گیا تھا۔ وہ برطانوی فوج کی ملازمت چھوڑ کر پھر صیہونی دہشت گرد تنظیم میں شامل ہوا اور اس کا کمانڈر بن گیا۔ عربوں کی املاک پر قبضہ کرنے کے لئے جو حملے کئے جاتے رہے ان کا کمانڈر موشے دیان ہی تھا۔ ان تنظیموں نے نہ صرف وہ علاقے زبردستی قبضہ میں لئے جو اقوام متحدہ یہودیوں کو دینا چاہتی تھی بلکہ ان علاقوں پر بھی قبضہ کیا جو اقوام متحدہ کے مطابق فلسطینیوں کے تھے۔ قبضہ کے دوران جو فلسطینی مسلمان نظر آتا اسے قتل کر دیا جاتا۔ مناخم بیگن اس دہشت گرد گروہ کا سربراہ تھا جس نے بیت المقدس میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل اڑایا تھا۔ صابرہ اور شتیلا کو گھیرے میں لے کر وہاں مقیم 4 ہزار نہتے فلسطینی مہاجرین کو قتل کرنے کا حکم دینے والا ایریئل شیرون ہی تھا جو اُن دنوں اسرائیل کا وزیر دفاع تھا۔

## صیہونی توسیعی پروگرام پر عملدرآمد

اسرائیل نے 1955ء میں غزہ اور اردن کی شہری آبادیوں پر چھاپہ مار حملے شروع کر دیئے۔ جس سے فلسطینی مسلمان تو شہید ہوتے رہے مگر اسرائیل کو خاص فائدہ نہ ہوا۔ 1956ء میں برطانیہ۔ فرانس اور اسرائیل نے مصر پر بھرپور حملہ کر دیا جس میں مصر کے ہوائی اڈوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ ان مشترکہ فوجوں نے سینا، غزہ اور مصر کی شمالی بندرگاہ پورٹ سعید پر قبضہ کر کے نہر سوئز کا کنٹرول سنبھال لیا جو حملے کی بنیادی وجہ تھی۔ روس کی دھمکی پر اقوام متحدہ بیچ میں آ گئی

اور جنگ بندی کے بعد سارا علاقہ خالی کرنا پڑا۔ اسرائیل نے امریکہ اور دوسرے پالنہاروں کی پشت پناہی سے 5 جون 1967 کو مصر، اردن اور شام پر حملہ کر دیا اور غزہ، جزیرہ نما سینا، مشرقی بیت المقدس، گولان کی پہاڑیوں اور دریائے اُردن کے مغربی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں امریکہ کی مدد سے مصر، اردن اور شام کے راڈار منجمد کر دیئے گئے اور اسرائیلی ہوائی جہازوں نے مصر کے ہوائی جہازوں کو زمین پر ہی تباہ کر دیا۔ اقوام متحدہ نے ایک قرارداد 242 کے ذریعے اسرائیل کو تمام مفتوحہ علاقہ خالی کرنے کو کہا جس پر آج تک عمل نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے مطابق مزید پانچ لاکھ فلسطینیوں کو اپنے ملک فلسطین سے مصر، شام، لبنان اور اُردن کی طرف دھکیل دیا گیا۔

## 1973ء کی جنگ رمضان

مصری فوج کے ایک طبقہ پر 1967ء کی شکست نے گہرا اثر چھوڑا تھا۔ انور سادات کے صدر بنتے ہی انہوں نے اپنا صحرائے سینا کا علاقہ اسرائیل سے واپس لینے کی تجاویز دینا شروع کر دیں۔ اس وقت تک اسرائیل نے بلڈوزروں کی مدد سے نہر سوئز کے کنارے کنارے 20 میٹر اونچی ریت کی دیوار بنا دی تھی۔ مصری فوج دریائے نیل کے کنارے ایک ریت کی دیوار بنا کر اسے عبور کرنے کی مشقیں کرنے لگی۔ ان کو بہت مایوسی ہوئی کیونکہ ہر قسم کے بم اور میزائل ریت کی دیوار میں شگاف ڈالنے میں ناکام رہے۔ ہوتا یوں تھا کہ میزائل ریت کے اندر پھٹتا مگر دیوار کو خاص نقصان نہ ہوتا۔ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ریت کا ڈھیر لگایا جائے تو ریت سرک کر زمین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ 40 درجے کا زاویہ بناتی ہے۔ اس طرح ریت کی 2 میٹر اونچی دیوار کے لئے بنیاد یا قاعدہ ساڑھے پانچ میٹر چوڑا بنتا ہے جبکہ اوپر سے چوڑائی صفر ہو۔ اگر 20 میٹر اونچی ریت کی دیوار بنائی جائے جس کی اوپر چوڑائی صرف 5 میٹر رکھی جائے تو زمین پر اس کی چوڑائی 60 میٹر یا 197 فٹ ہوگی۔ اتنی چوڑی دیوار کو توڑنا ناممکن سمجھ کر ہی اسرائیل نے یہ دیوار بنائی ہوگی۔ ریت کو اگر کسی جگہ سے بھی ہٹائیں تو اس کے اوپر اور ساتھ والی ریت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

مصری فوج کا ایک میجر جو کہ مکینکل انجنیئر تھا ریت کی دیوار گرانے کے ناکام

تجربے دیکھتا رہا تھا۔ ایک دن ڈویژن کمانڈر نے اس معاملہ پر غور کے لئے تمام افسران کا اجلاس طلب کیا۔ اس میجر نے تجویز دی کہ ریت کی دیوار آتشیں اسلحہ کی بجائے پانی سے گرائی جاسکتی ہے مگر کمانڈر نے اس میجر کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ وہ میجر دھن کا پکا تھا اُس نے کہیں سے ایک پانی پھینکنے والا پمپ لے کر ایک کشتی پر نصب کیا اور ریت کی ایک چھوٹی سی دیوار بنا کر دریا نیل کا پانی اس پمپ سے نوزل کی مدد سے ریت کی دیوار پر ایک ہی جگہ پھینکتا رہا۔ تھوڑی دیر میں ریت کی دیوار میں شگاف بن گیا۔ اُس نے اپنے کمانڈر کو بتایا مگر کمانڈر نے پھر بھی حوصلہ افزائی نہ کی۔

کچھ عرصہ بعد صدر انور سادات اس علاقہ کے دورہ پر آیا تو اس میجر نے اس کے سامنے تجربہ کرنا چاہا مگر کمانڈر نے ٹال دیا۔ بعد میں کسی طرح اس میجر کی انور سادات سے ملاقات ہوگئی اور میجر نے اس سے اپنے تجربہ کا ذکر کیا۔ انور سادات نے میجر سے کہا کہ خفیہ طور پر تجربہ کرتا رہے اور پھر حساب لگا کر بتائے کہ 20 میٹر اونچی دیوار میں شگاف ڈالنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ میجر دلیر ہوگیا اور ملک میں سب سے بڑا پمپ حاصل کر کے ریت کی بڑی دیوار بنا کر تجربہ کیا جو کامیاب رہا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس سے بڑے پمپ چاہیئے تھے جو صرف خاص طور پر آرڈر دے کر یورپ کی کسی بڑی کمپنی سے بنوائے جاسکتے تھے اور راز فاش ہونے کا خطرہ بھی تھا۔ بہر کیف کسی طرح بہت بڑے پمپ بنوا کر درآمد کر لئے گئے۔ پھر مضبوط کشتیاں بنائی گئیں۔ 6 کشتیوں پر چھ چھ پمپ نصب کئے گئے۔

جب مذاکراتی اور سیاسی ذرائع سے اسرائیل پر کوئی اثر نہ ہوا تو مصر اور شام نے 1973ء میں رمضان کے مہینے میں اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ گولوں کی بارش کے دوران یہ کشتیاں نہر سوئز میں اتار دی گئیں اور 20 میٹر اونچی دیوار کے تین مقامات کا رُخ کر کے پمپ چلا دیئے۔ 6 کشتیوں کے پمپ باری باری چلائے گئے اور چند گھنٹوں میں بیس میٹر اونچی دیوار میں تین جگہوں پر کافی چوڑے شگاف بن گئے۔ پُل بنا کر مصری فوج ہلکے ٹینکوں سمیت صحرائے سینا میں داخل ہوگئی اور ریت کی دیوار کے دوسری طرف موجود ساری اسرائیلی فوج کا صفایا کر دیا۔

یہ حملہ جنگ یوم کپور، جنگ رمضان یا جنگ اکتوبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مصر

نے اسرائیلی فضائیہ کے دوسو کے قریب ہوائی جہاز سام مزائیلوں سے مار گرائے۔ اسرائیل کے گھر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ ان کے 6 ہزار فوجی اور 200 پائلٹ ہلاک ہو چکے تھے اور مصری فوج صحرائے سینا عبور کر کے اسرائیل کی سرحد کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اگر امریکہ پس پردہ اسرائیل کی بھرپور امداد نہ کرتا تو فلسطین کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ امریکہ بظاہر جنگ میں حصہ نہیں لے رہا تھا مگر اس کا طیارہ بردار بحری جہاز سینا کے شمالی سمندر میں ہر طرح سے لیس موجود تھا۔ اس کے راڈاروں اور ہوائی جہازوں نے اسرائیل کے دفاع کے علاوہ مصر میں پورٹ سعید کے پاس ہزاروں اسرائیلی کمانڈو اتارنے میں بھی رہنمائی اور مدد کی۔ اسرائیلی کمانڈوز نے پورٹ سعید کا محاصرہ کر لیا جو کئی دن جاری رہا۔ وہاں مصری فوج موجود نہ تھی کیونکہ اسے جغرافیائی لحاظ سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اپنے دور حکومت میں جمال عبدالناصر نے ہر جوان کے لئے 3 سال کی ملٹری ٹریننگ لازمی کی تھی جو اس وقت کام آئی۔ پورٹ سعید کے شہریوں نے اسرائیلی کمانڈوز کا دلیری سے مقابلہ کیا اور انہیں شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ سعودی عرب کے بادشاہ فیصل نے تیل کا ہتھیار موثر طور پر استعمال کیا۔ پھر امریکہ، روس اور اقوام متحدہ نے زور ڈال کر جنگ بندی کرا دی۔

## دہشت گرد حکمران

1953ء میں ہی ایک بدنام زمانہ دہشت گرد موشے دیان چیف آف سٹاف اسرائیل آرمڈ فورسز بن گیا تھا۔ مگر صیہونی دہشت گرد تنظیمیں (ارگون۔ لیہی۔ ہیروت۔ لیکوڈ وغیرہ) اسرائیل میں 1977ء تک حکومت میں نہ آسکیں۔ اس کے باوجود فلسطینی مسلمانوں پر ظلم و تشدد ہوتا رہا۔ 1977ء میں ارگون کے لیڈر مناخم بیگن نے وزیراعظم بنتے ہی غزہ اور باقی علاقے میں جن پر 1967ء میں قبضہ کیا گیا تھا زمینی حقائق کو بدلنے کے لئے تیزی سے یہودی بستیاں بسانی شروع کر دیں تا کہ کوئی ان سے علاقہ خالی نہ کرا سکے۔ ان صیہونی تنظیموں کا پروگرام ایک بہت بڑی صیہونی ریاست بنانے کا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ نقشہ تھیوڈور ہرتسل جس نے صیہونی ریاست کی تجویز 1896ء میں پیش کی تھی، نے ہی تجویز کیا تھا اور یہی نقشہ 1947ء میں دوبارہ ربی فشتمن نے پیش کیا تھا۔ اسرائیل نے 1982ء میں لبنان پر بہت

پر حملہ کر کے اس کے بہت سے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اسرائیلی فوج نے فلسطینی مہاجرین کے دو کیمپوں صابرا اور شتیلا کو گھیرے میں لے کر اپنے مسلحہ حواریوں فلین جسٹس کی مدد سے وہاں مقیم چار ہزار نہتے فلسطینی مہاجرین کو شہید کروا دیا جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے شامل تھے۔ یہ کاروائی ایریئل شیرون کے حکم پر کی گئی تھی جو اُن دنوں اسرائیل کا وزیر دفاع تھا۔

## یہودی ریاست کا حق

حضرت اسحاق علیہ السّلام مسجد الاقصٰی میں عبادت کرتے رہے مگر حج کے لئے وہ مکہ مکرّمہ میں خانہ کعبہ ہی جاتے تھے۔ ان کے پوتے حضرت یوسف علیہ السّلام جب مصر کے بادشاہ بنے تو انہوں نے اپنے خاندان کے 31 اشخاص کو جن میں ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السّلام اور سارے بھائی بھی شامل تھے مصر بلا لیا تھا۔ بنی اسرائیل کے یہودی پہلے ہی دولت و ثروت کی خاطر فلسطین چھوڑ کر مصر میں آباد ہو گئے تھے اور مصریوں کے غلام ہونا قبول کر چکے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السّلام نے جاتے ہوئے مسجد الاقصٰی فلسطینی باشندوں کے سپرد کر دی تھی جو کہ نیک لوگ تھے مگر بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کے 300 سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السّلام مصر میں پیدا ہوئے۔ جس سرزمین پر یہودی اپنی میراث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اسے انہوں نے اپنی مرضی سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے 400 سال پیشتر خیر باد کہہ کر مصر میں دولت کی خاطر غلام بننا قبول کیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے 40 سال بعد تک بنی اسرائیل صحرائے سینائی میں بھٹکتے رہے یہاں تک کہ ان کی اگلی نسل آ گئی لیکن اگر یہودیوں کی بات مان لی جائے تو بھی یہ حکومت اس وقت مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی جب آج سے 2591 سال قبل بابل والوں نے اس پر قبضہ کر کے بمع عبادت گاہ سب کچھ مسمار کر دیا تھا اور بنی اسرائیل کو وہاں سے نکال کر اپنا غلام بنا لیا تھا۔ بابل عراق کے شمالی علاقہ میں تھا اور ہے۔

اسرائیل کے تمام لیڈروں کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی فلسطین تو کیا سرزمینِ عرب سے بھی تعلق نہیں رکھتا۔ تھیوڈور ہرتسل بڈاپسٹ (ہنگری) کا تھا۔ بن گوریاں پولانسک (پولینڈ) کا۔ گولڈا میئر کیو (یوکرین) کی۔ مناخم بیگن

بریسٹ لطواسک (روس) کا۔ پتسہاک شمیر زوزینوف (پولینڈ) کا۔ خائم وائسمین جو اسرائیل کا پہلا صدر بنا وہ موٹول (پولینڈ) کا تھا۔

ثابت یہی ہوتا ہے کہ نہ تو اسرائیل کے لیڈروں کا فلسطین سے کوئی تعلق تھا یا ہے اور نہ فلسطین یا اس کا کوئی حصہ کبھی بھی یہودیوں کی مملکت تھا۔ ریاست اسرائیل کا وجود جور و جبر کا مرہون منت ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ چونکہ 1005 قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت شروع ہونے سے وہاں بابل والوں کے قبضہ تک۔400 سال یہودی فلسطین کے علاقہ میں رہے (یعنی آج سے 2610 سے 3010 سال پہلے تک) تو اس کی بنیاد پر یہودیوں کی ریاست وہاں ہونا چاہیئے تو پھر ہسپانیہ، مشرقی یورپ، مغربی چین، مغربی روس اور ہندوستان پر 800 سال یا اس سے زیادہ عرصہ مسلمانوں کی حکومت رہی ہے چنانچہ یہ سارے ملک مسلمانوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اِسی طرح اور کئی ملکوں کا تنازع کھڑا ہو جائے گا۔ کوئی عجب نہیں کہ کل کو بھارت کے ہندو کہیں کہ موجودہ پاکستان کے کافی علاقہ پر تو ہمارے موریہ خاندان (چندر گپت اور اشوک کمار۔322 سے 183 قبل مسیح) نے 129 سال حکومت کی تھی اور اسے واپس لینے کے لئے بھارت پاکستان پر حملہ کر دے اور امریکہ وغیرہ اسرائیل کے متذکرہ اصول پر بھارت کا ساتھ دیں۔ اِسی طرح مسلمانوں کا بھی حق بنتا ہے کہ سارے مل کر جنوبی اور مشرقی یورپ پر حملہ کر دیں کہ یہاں کسی زمانہ میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ قدیم امریکی موجودہ سفید فام امریکیوں کو جو کہ دراصل انگریز، جرمن اور ہسپانوی وغیرہ ہیں امریکہ سے نکل جانے کا کہیں۔ آسٹریلیا کے اصل باشندوں کی خاطر سفید فام آسٹریلیوں کو نکل جانے کا حکم دیا جائے۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تو پھر اِسرائیل بنانا کس طرح جائز ہے؟

حکیم الامت علامہ اقبال نے اسی لئے فرمایا تھا:

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پہ حق نہیں کیوں اہل عرب کا

## موساد

دنیا کے تمام ممالک کا جائزہ لے لیں ان تمام ممالک کے انٹیلی جنس اداروں کے درمیان

جو چند مشترکہ پہلو ملیں گے ان میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان اداروں کو ان ممالک کی حکومتوں نے دفاعی مقاصد کے لئے اور دشمنوں کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے قائم کیا ہے مگر اسرائیلی ادارے موساد جس کا سرکاری نام The institute for intelligence and special operations ہے کا جائزہ لینے کے بعد کئی طرح کے حیرت انگیز پہلو سامنے آتے ہیں وہ یہ کہ اگرچہ اس وقت موساد کو اسرائیل کے سراغرسانی کے ادارے کی حیثیت حاصل ہے مگر اس کا قیام ان تمام پہلوؤں کے برعکس ہے اور یہ دنیا کا واحد ادارہ ہے جو کہ مسلمہ طور پر دہشت گردی کی تنظیم کی جانب سے قائم کیا گیا ہے اور جس کی سرگرمیوں کو حکومت نے ملک کے قائم ہونے کے بعد تصدیق کرتے ہوئے ریاستی ادارے کی شکل دی جب کے اس کے قیام کے وقت دیگر ممالک کے انٹیلی جنس اداروں کے برخلاف اس ادارے کو کیموفلاج کرنے کے لئے اس کا نام اس طرح کا رکھا گیا کہ اس کے نام کو دیکھ کر کوئی بھی اس ادارے کے بارے میں یہ گمان نہ کرسکے کہ یہ سراغرسانی کا کوئی ادارہ ہے جیسا کہ اس نام The institute for intelligence and special operations ادارہ برائے معلومات اور خصوصی فرائض سے ظاہر ہوتا ہے یہ نام رکھنے کی بنیادی وجہ موساد کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا تھا اسرائیلی انٹیلی جنس ادارے موساد کے بارے میں دنیا کو اس وقت معلوم ہوا جب کے اسرائیلی پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اسرائیلی وزیراعظم بن گوریال نے انکشاف کیا کہ موساد کے نام سے کوئی ادارہ کام کررہا ہے۔جس کا مقصد سراغرسانی کرنا ہے اس انکشاف کے بعد موساد کے بارے میں ہر طرح کی خبر کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی حتیٰ کہ اسرائیلی اخبارات پر بھی اس بارے میں مکمل طور پر پابندی عائد تھی کہ وہ اس اہم اور خفیہ ادارے کے بارے میں کسی بھی طرح کی کوئی خبر شائع نہیں کرسکتے ہیں مگر اسرائیلی پارلیمنٹ نیسٹ (KNESSEST) میں موساد کے بارے میں انکشاف کے بعد اس پابندی کا اگرچہ خاتمہ ہو گیا مگر اس کے باوجود موساد کے بارے میں اسرائیلی اخبارات میں کوئی بھی خبر شائع نہیں ہوتی تھی 1980 میں ایک اخبار کی ایک رپورٹ میں جب موساد کے اس وقت کے سربراہ کا نام شائع ہوگیا تو اس کا ایکریڈیشن کارڈ ہی حکومت نے ضبط کرلیا جس رپورٹر نے اس خبر کی رپورٹنگ کی اس کا صحافتی کارڈ بھی کینسل کردیا گیا یہ بات واضح رہے کہ اسرائیل کے دفاع

انٹیلی جنس اور جوابی حملوں کے لئے قائم کئے گئے اداروں کی تعداد یوں تو بہت ہے مگر بنیادی طور پر یہ تین اداروں موساد امن اور شین باتھ کا حصہ ہی تصور کئے جاتے ہیں جو کے اسرائیل کے دفاع کے لئے قائم ہوئے ہیں دنیا بھر کے انٹیلی جنس اداروں امریکی ادارے ایف آئی اے FIA اور CIA برطانوی ادارے M16 اور M15 اور سابقہ روسی ادارے KGB اور اس کی جگہ لینے والے موجودہ روسی ادارے ایف ایس بی FSB اور فرانس کے انٹیلی جنس اداروں اور جرمنی کے سابقہ اور موجودہ انٹیلی جنس اداروں کا اگر تاریخ کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو انٹیلی جنس اداروں کے حوالے سے یہ بات سامنے آئے گی کہ ان اداروں کے مقابلے میں اسرائیلی کے انٹیلی جنس اداروں کا صدیوں پرانا تاریخی پس منظر ہے (اگر چہ اسرائیل کے اخبارات اور ذرائع نشر و اشاعت کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ موساد کا قیام 1951 میں عمل میں آیا تھا) جس کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اسرائیل کی اساس اور بنیاد یہودیت کا ایک مختصر سا جائزہ لیا جائے یہودیت ایک ایسا مذہب ہے جس کے ماننے والے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے خفیہ سرگرمیاں مختلف ادوار میں انجام دیتے رہے ہیں۔ ان سرگرمیوں کا تعلق معاشی طور پر یہودی مذہب کے ماننے والوں کی ہر اعتبار سے مضبوطی اور ان کے مخالفین کی تباہی تھا۔ ان خفیہ سرگرمیوں کو باقائدگی کے ساتھ انجام دیا گیا۔ اس اعتبار سے یورپ کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے۔ اسی لئے یورپ کے بعض ممالک سے جب یہودیوں کو نکالا گیا تو ان پر بالعموم یہی الزام عائد کیا گیا کہ یہودیوں کی اکثریت اس حکومت کے خلاف ایسی سرگرمیوں میں ملوث تھی جن کی وجہ سے ان حکومتوں کی بنیادیں کمزور ہو گئیں۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں مشرق وسطیٰ اور دنیا کے بیشتر ممالک جن میں افغانستان، ترکی، برصغیر ہندوپاک، ایران، عراق، شام، افریقی ممالک، مصر، تیونس، مراکش، ساوتھ افریقہ، اریٹیریا، ایتھوپیا، کینیا، چین، ہانگ کانگ، تائیوان، روس، برازیل، ارجنٹینا، کولمبیا کینیڈا اور یورپ کے تمام ممالک شامل ہیں یہودیوں کی بڑی تعداد مقیم تھی۔ صدیوں سے ان ممالک میں مقیم ہونے کے باعث یہ یہودی مقامی تہذیب و بود باش اور زبان کو اس طرح اختیار کر چکے تھے کہ ان میں اور عام مقامی میں فرق کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ یہ کیفیت عالمی صیہونی تنظیم کے قائدین کے لئے بہت سازگار ثابت ہوئی اور انہوں نے اس کے ذریعے

سے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ان یہودیوں کو اسرائیل کے قیام کے لئے کام کرنے والے انٹیلی جنس اداروں میں بھرتی کیا گیا۔ چونکہ اسرائیل کا قیام ہر یہودی کے نزدیک ایک مذہبی یہودی فریضہ ہے۔ اس لئے اسرائیل کے دفاع، استحکام اور تعمیر کی خاطر کام کرنے والے اداروں میں کام کرنا اور ان کی اعانت کرنا مذہبی فریضہ ہے، اسی لئے موساد اور اسرائیل کے دیگر انٹیلی جنس ادارے وہ چند ادارے ہیں جہاں پر کارکن مذہبی فریضہ تصور کرتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسرائیلی انٹیلی جنس اداروں کو وہ امداد دنیا کے ہر ملک اور علاقے میں حاصل ہو جاتی ہے جو کہ کسی دوسرے ملک کے انٹیلی جنس ادارے کو اب تک حاصل نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس اداروں کو دنیا کے کامیاب ترین ادارے تصور کیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے اور پہلی عالمی جنگ عظیم سے قبل اور اس کے بعد جب فلسطین میں دنیا بھر کے یہودیوں کی بڑی تعداد آنے اور بسنے لگی تو اس کے بعد فلسطین میں اسرائیلی حکومت کے قیام کے لئے فلسطین میں اور دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف نام سے ایسے ادارے قائم کئے گئے جن کا کام اور مقصد ایک ہی تھا مگر ان ممالک کے معروضی حالات کے پیش نظر ان کے مختلف نام رکھے گئے، وہ کام تھا دنیا کے ہر خطے میں موجود یہودیوں کے مفادات کے لئے اور دنیا بھر میں ان کی حکمرانی کو قائم کرنے کے لئے ایسے حالات پیدا کرنا جن کی مدد سے وہ اپنے تمام منصوبوں پر عمل درآمد کر سکیں۔ اسرائیل کے قیام کے بعد اسرائیل کے دفاع کے لئے راہ میں آنے والی تمام روکاوٹوں کو ہٹانے کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے اسرائیل کے قیام کے بعد سے باضابطہ طور پر موساد نے بھرپور کردار ادا کیا۔
جبکہ اسرائیل کے قیام سے قبل 1929 میں سوئزرلینڈ کے شہر زیورچ میں منعقد ہونے والی صیہونی کانگریس کے اجلاس میں جو اسرائیل کے قیام کے لئے منعقد کی گئی تھی، ایک ایسی انٹیلی جنس ایجنسی کا قیام باضابطہ طور پر عمل میں لایا گیا جو دنیا بھر میں صیہونی مفادات کی حفاظت کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس ادارے کا نام جیوش ایجنسی رکھا گیا۔ جیوش ایجنسی کا کام ایسی تمام اطلاعات کا حصول تھا جو کہ صیہونیت کے تحفظ اور دفاع کے لئے ضروری تھیں۔ یہ بات واضح رہے کہ اسی کانگریس میں ایک دوسرے ادارے ہگانہ کو بھی قائم کیا گیا جو فلسطین کے اندر

اسرائیل کے قیام کے لئے باضابطہ طور پر اقدامات اور مسلح جدوجہد کر سکے۔اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے ادارے شائی کا بھی قیام عمل میں لایا گیا۔اسرائیل کے خفیہ جاسوس ادارے موساد کا پورا نام ''انسٹی ٹیوٹ فار انٹیلی جنس اینڈ اسپیشل سروسز'' ہے یہ ایجنسی بظاہر اپنے آپ کو سائنسی ادارہ کہتی ہے، مگر یہ حیثیت صرف ان کی اصلیت چھپانے کے لیے ہے، ورنہ اس کا اصل کام دشمن ممالک کو نقصان پہنچانا اور ان کی پوشیدہ سرگرمیوں سے اپنی حکومت کو آگاہ کرنا ہے۔

## موساد کے مقاصد

موساد کی بنیاد رکھتے ہوئے اسرائیلی خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے 1953 میں ایک فرمان جاری کیا تھا کہ ''ہماری ریاست اپنے قیام کے پہلے روز ہی سے خطرات میں گھری ہوئی ہے چنانچہ خفیہ ایجنسی ہمارے لیے پہلی دفاعی لائن کا کام کرے گی، ہمارا محل وقوع مشرق وسطیٰ کے قلب میں ہے، اس لیے ہمیں ہر وقت اردگرد کے حالات سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے'' لیکن اس ادارے کو صرف باخبر رہنے تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ یہ تنظیم دنیا میں سینکڑوں تخریب کاری کے واقعات میں ملوث پائی گئی ہے۔

موساد اسرائیل کا جاسوسی نہیں بلکہ تخریب کاری کا ادارہ بن چکی ہے۔یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ جرمن نازیوں نے چالیس کے عشرے میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کا قتل کیا تھا۔ اسرائیلی حکومت اور پرانی نسل کے یہودی اپنی نئی نسل کو اس قتل عام کی یاد دلاتے ہیں کہ کس طرح تم کو بکروں اور مینڈھوں کی طرح ذبح کر دیا گیا۔یہ خوف یہودیوں کے بے مثال اتحاد کی ایک اہم وجہ ہے۔اس کے علاوہ ان کو یہودیت پر فخر ہے اور احساس برتری میں مبتلاء یہودیوں میں یہ عزم پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ریاست کو کمزور نہیں ہونے دیں گے۔موساد کی اعلیٰ کارکردگی انہی احساسات کی عکاس ہے۔موساد کے لیے کام کرنے والے مرد ہوں یا خواتین، دوسرے ممالک کے جاسوس اداروں سے زیادہ تن دہی کے ساتھ ہر خطرہ مول لیکر اسرائیل کو مستحکم کرنے کی خدمت بجالاتے ہیں۔ان کے جاسوس نہ صرف مسلمان ممالک بلکہ امریکہ اور یورپ میں بھی اسرائیل کے مفادات کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں۔

## بھارت میں آباد یہودی

برصغیر پاک و ہند بالخصوص انڈیا میں یہودیوں کی غیر معمولی موجودگی حیران کن ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ بھارت جیسے بڑے ملک میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد اقلیتی حیثیت میں عرصہ دراز سے سکونت اختیار کئے ہوئے ہے۔ بنی اسرائیل کی یہ دربدر بھٹکتی ہوئی قوم جو بھارت میں موجود بنی اسرائیل کی یہ کمیونٹی مغربی مہاراشٹر میں کونکان ساحل کے قریب ایک گاؤں میں آباد تھی انیسویں صدی کے اوائل میں ان یہودیوں نے شہروں کی جانب رخ کرنا شروع کیا، جس میں قابل ذکر نام ممبئی کا ہے۔اس کے علاوہ پونا، احمد آباد اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں انہوں نے نقل مکانی شروع کردی۔ 1950ء کے بعد سے اب تک ان یہودیوں نے اسرائیل ہجرت کرنا شروع کردی تھی۔ بھارت میں بنی اسرائیل کی یہ قوم پوری دنیا میں موجود اسرائیلی کمیونٹی سے مکمل طور پر کٹی ہوئی تھی۔ بھارت میں یہ اپنے آپ کو بنی اسرائیل کے نام سے کہلوانا پسند کرتے تھے۔ بھارت میں موجود ان یہودیوں کا دعوی ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ہیکل سلیمانی کی دوسری تباہی سے قبل بھارت میں آباد ہوئے تھے۔ان کے بقول ان کے آباؤ اجداد ایک تجارتی بحری جہاز کے ذریعے اسرائیل سے بھارت آئے تھے، مگر کونکان کے ساحل کے قریب ان کا بحری جہاز ایک سمندری حادثہ کا شکار ہو کر تباہ ہو گیا تھا۔جس میں سے صرف چودہ افراد ہی زندہ بچ سکے تھے اور ان میں سات مرد اور سات عورتیں شامل تھیں۔ان لوگوں نے تیر کر اپنی جان بچائی اور نیوگاؤں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے، باقی تمام افراد سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ تیر کر ساحل تک آنے والی کچھ لاشوں کو انہوں نے اسی نیوگاؤں (Navagaon) میں دفن کیا تھا۔ بعد میں ان بچ جانے والے یہودیوں نے اپنے آپ کو اسی گاؤں میں مقیم رکھا اور کھیتی باڑی اور تیل پیدا کرنے جیسے کاموں سے اپنا ذریعہ معاش شروع کیا جو آگے چل کر ان کا اہم روزگار ثابت ہوا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان زندہ بچ جانے والے یہودیوں کی نسل اپنی مقامی زبان جو عبرانی تھی، بھولتی چلی گئی اور اپنی مذہبی رسوم کو بھی پس پشت ڈال دیا جس سے ان کی بنیادی پہچان وابستہ تھی، مگر کچھ رسومات کو انہوں نے نسل در نسل جاری رکھا۔ ہفتہ کا دن ان کے

ہاں ''سبت'' کہلاتا ہے، اس دن یہ کسی بھی قسم کا کام کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہفتہ کے دن ان کے نزدیک کسی بھی قسم کا کام کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے، اسی طرح دوسرے یہودیوں کی طرح بھارت میں مقیم یہ یہودی بھی اپنے بچے کا ختنہ اسکی پیدائش کے آٹھویں دن کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بغیر چھلکے اور پروں والی مچھلی بھی نہیں کھاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان انڈین یہودیوں نے اپنے مذہبی تہواروں کو ہندی نام دینا شروع کر دیے مگر جب تک دنیا میں موجود دوسری یہودی کمیونٹی سے ان کے تعلقات بحال نہیں ہوئے تھے تب تک یہ انڈین یہودی ہنوکہ (Hanukkah) اور دوسرے اہم یہودی تہواروں سے ناواقف تھے۔ کیونکہ ان کے بقول ان کے آباؤ اجداد ہیکل کی دوسری تباہی سے قبل بھارت میں آباد ہوئے تھے جبکہ ہنوکا اور گیارہویں موسوی مہینے کے روزے جیسے تہوار ہیکل کی دوسری دفعہ تباہی کے بعد رائج ہوتے تھے۔

بھارت میں مقیم یہ یہودی مردوں کو دفنانے جیسی رسومات میں شیما (Shema) جو کہ یہودیوں کی مذہبی کتاب ہے اس کی آیات پڑھا کرتے تھے۔ بھارت میں بنی اسرائیل کی یہ قوم آہستہ آہستہ پروان چڑھتی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بھارت میں تیل کے کاروبار سے وابستہ یہ قوم پہچانی جانے لگی۔ اپنے آبائی گاؤں نیوگان سے آہستہ آہستہ ہجرت کر کے انہوں نے دوسرے دیہات اور ٹاؤن وغیرہ میں پھیلنا شروع کر دیا۔ تیل کی پیداوار اور اس پر کنٹرول کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان انڈین یہودیوں نے اپنے بنائے ہوئے بام وغیرہ کے نام اور خطاب ان دیہاتوں پر رکھے تھے جو تیل کی پیداوار اور تجارت کے حوالے سے پورے بھارت میں مشہور تھے۔ مثلاً روحا گاؤں سے روحکر کا خطاب، بن گاؤں سے پنکار کا خطاب، پالی گاؤں سے پالکر کا خطاب اور آشتم گاؤں سے آشتم کار کا خطاب۔ یہ انڈین یہودی ہفتہ کے روز کسی بھی کام کرنے کو برا تصور کرتے ہیں۔ جبکہ بھارت میں مقیم ہندوؤں میں اس قسم کا کوئی تصور نہ تھا جس کی وجہ سے یہ انڈین بنی اسرائیل ''شنیدوار تیلی'' کے نام سے مشہور تھے۔ ان انڈین یہودیوں کی روایات کے مطابق تقریباً ایک ہزار سال سے چودہ سو سال قبل مسیح کے درمیانی دور کے ایک یہودی تاجر جس کا نام ڈیوڈ ربی کہا جاتا ہے، ایک دن یہاں مغربی بھارت پہنچا تھا۔ بنی اسرائیل کے نزدیک ربی کو بطور ایک عظیم یہودی عالم کے طور پر

عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ یہودی ربی ڈیوڈ یہودیوں کی اس جماعت کو بھارت میں یہودی رسم ورواج کے تحت زندگی گزارتے ہوئے دیکھ کر نہایت حیران وششدر رہ گیا، بعد میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان انڈین بنی اسرائیل کو تمام یہودیوں کی رسومات سے بہرہ ور کرے گا۔ اس مقصد کیلئے اس نے انڈین یہودیوں میں سے تین اشخاص کا انتخاب کیا جنہیں وہ تمام یہودی رسوم ورواج جن میں خاص کر تلمود (Talmud) اور دوسری یہودی کتب شامل ہوتی ہیں ان سب کی تعلیم دینے لگا۔ بعد میں یہی تین اشخاص اس انڈین یہودی کی کمیونٹی میں ''قاضی'' کے خطاب سے پہچانے جانے لگے (اور یہ عربی لغت میں منصف کو کہا جاتا ہے) اور یہ انڈین بنی اسرائیل کمیونٹی کے مذہبی اور سماجی قائد بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ ان نظریات نے بھارت کے یہودیوں میں وہ روح پھونک دی جس نے آگے چل کر انہیں صحیح معنوں میں یہودیت کی پٹری پر ڈال دیا۔ بعد میں اٹھارہویں صدی کے اوائل میں انڈیا کے ان یہودیوں کے روابط آہستہ آہستہ دنیا میں موجود دوسری غیر یہودی کمیونٹی سے بحال ہونا شروع ہو گئے۔ سب سے اہم بات جس نے آگے چل کر ان انڈین یہودیوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ غیر یہودی عیسائی مشنریز کا کام تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں بہت سی عیسائی مشنریوں نے برصغیر پاک وہند میں عیسائیت کی تبلیغ کیلئے دھاوا بول دیا تھا۔ ان عیسائی مشنریوں میں ایسے بھی تھے جو محض بھارت میں اس لئے وارد ہوئے تھے کہ ان کا مقصد علم البشر پر تحقیق کرنا تھا۔

## پاکستان (کراچی) میں یہودی، ایک تاریخی جائزہ

''یروشلم پوسٹ'' اسرائیل کا سب سے بڑا اخبار ہے جو دنیا کی ۱۵ مختلف زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار اتوار سے لے کر جمعے تک روزانہ شائع ہوتا ہے، جب کہ ہفتے کا دن چونکہ یہودیوں کے ہاں مذہبی طور پر چھٹی کا دن ہے اس لیے اسرائیل میں کوئی اخبار نہیں چھپتا۔ اس اخبار کی پہلی اشاعت یکم دسمبر 1932ء کے دن ہوئی۔ امریکا کے دوسرے بڑے اخبار ''والاسٹریٹ جرنل'' ''کیڈیٹر'' ''ڈیوڈ ہورویٹز'' پہلے یروشلم پوسٹ کے ایڈیٹر تھے۔ 27 فروری 2009ء کو یروشلم پوسٹ نے اپنے پہلے صفحے پر ایک خبر کو نمایاں سرخی کے طور پر پیش کیا ''تعجب! یہودی ابھی تک پاکستان میں'': اخبار نے یہ خبر کراچی سے بھیجی گئی ایک ای میل سے لی تھی۔ یہ

میل کراچی میں رہنے والے ایک یہودی ڈاکٹر اسحاق موسی اخیری نے بھیجی تھی۔ اسحاق نے اپنا تعلق یہود کے قبیلے ''سپہردی'' (Sdpgardi) سے بتایا۔ سپہردی یہودیوں کا اصل تعلق شمال مغربی یورپ میں اس کے 13 سالہ بیٹے نے تورات پڑھ کر مذہب سے وفاداری کا وعدہ کیا۔ یہاں کے لوگ سوائے چند ایک کے بہت اچھے ہیں۔ ہم اور ہماری کمیونٹی گھر پر ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی تہوار پر کسی ایک یہودی کے گھر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میرے تعلق کے یہاں دس سے زائد یہودی خاندان آباد ہیں جو کراچی کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔ اسحاق نے اسرائیل جا کر اپنے مذہبی مقامات دیکھنے کی بھی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم اپنی چھوٹی سی دنیا کو ہی فوقیت دیتے ہیں اور اجنبیت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہمارا سیاسی استعمال کرے۔ ہم کراچی میں دو سال سے آباد ہیں اور اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

1881ء میں صوبہ سندھ میں صرف 153 یہودی آباد تھے۔ 1919ء میں یہ تعداد بڑھ کر 650 تک پہنچ گئی۔ 1947ء میں تقسیم سے پہلے صرف کراچی میں 2500 سے زائد یہودی خاندان آباد ہو چکے تھے، جو بھارتی صوبہ مہاراشٹر سے نقل مکانی کر کے کراچی آئے تھے۔ ان میں سے اکثر تاجر، شاعر، فلاسفر اور سول سرونٹ تھے، جبکہ کچھ یہودیوں کا تعلق بغداد سے بھی تھا۔ دستیاب ریکارڈ اور مختلف ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق یہ خاندان مراٹھی زبان بولتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق اسرائیل کے علاقے بین (Bene) سے تھا۔ 1893ء میں ''یہودی نوجوان'' کے اپنا مذہبی مرکز ''میگن شیلوم'' تعمیر کیا جو 1980ء تک کراچی کے علاقے ''رنچھوڑ لائن'' میں قائم رہا۔ 1903ء میں ''یہودی نوجوان'' کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد بظاہر کھیلوں کے علاوہ یہودیوں کی دیگر سرگرمیوں کو فروغ دینا تھا۔ 1918ء میں بنی اسرائیل ریلیف فنڈ اور یہودی سنڈیکیٹ (Karachi Jewish Syndicate) کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد غریب یہودیوں کا انتہائی کم کرائے پر گھر فراہم کرنا تھا۔ یہودیوں کے اس مرکز کی خدمات سے مستفید ہونے والے دو خاندانوں کا تعلق پشاور سے بھی بتایا جاتا ہے۔ کراچی میں ان کا عمل دخل اس قدر بڑھ گیا تھا کہ 1936ء میں ان کا ایک لیڈر جس کا نام ابراہیم ریوبن تھا کراچی کارپوریشن کا کونسلر بھی منتخب ہو گیا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد 500 کے قریب یہودی خاندان ہندوستان نقل مکانی کر گئے۔ لیکن دو ہزار کے قریب نے پاکستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ سال 1948ء میں جب اسرائیل عمل میں آیا تو کراچی میں موجود یہودیوں کو مسلمانوں میں پائے جانے والے غم و غصے اور ردعمل کو سہنا پڑا اور کراچی کے باسیوں میں پائی جانے والی مذہبی حمیت کے باعث ان یہودی خاندانوں کا کراچی میں رہنا محال ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں یہودیوں کا عمل دخل کم ہونا شروع ہو گیا اور جلتی پر تیل کا کام 1948ء اور 1956ء کی عرب اسرائیل جنگوں نے کیا۔ ایوب خان کے دور میں بہت سے یہودی خاندانوں نے پاکستان کو چھوڑ دیا اور اسرائیل چلے گئے۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے یہودیوں کی ایک بڑی اکثریت نے "رملہ" میں رہائش اختیار کی ہے اور وہاں اپنا مذہبی مرکز "میگن شیلوم" (Magren Shalome) کے نام سے تعمیر کیا جس کو باقاعدہ طور پر کراچی کی یاد سے منسوب کیا گیا۔ آج کراچی میں اس جگہ پر ایک تجارتی مرکز قائم ہے۔ یہودی دنیا کی وہ واحد "غیرت مند" قوم ہے جو نقل مکانی سے پہلے اپنی ہر چیز کی قیمت وصول کر لینا چاہتی ہے یہاں تک کے اپنی عبادت گاہیں اور مقدس مذہبی مقامات کو بھی فروخت کر دیتی ہے۔ اسرائیل کے قیام کے بعد دنیا بھر کے یہودیوں کو وہاں بسانے کا انتظام کیا گیا اور دنیا میں موجود یہودیوں نے وہاں کا رخ کیا، لیکن اس کے باوجود یہودیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد دیگر اسلامی ممالک میں آباد ہے۔ اسلامی ممالک میں ان کی تعداد کچھ اس طرح ہے، مراکش میں سات ہزار، ایران میں 25 ہزار، ترکی میں 70 ہزار 4 سو پندرہ، عراق میں ایک سو، شام میں 4، تنزانیہ میں پندرہ سو، لبنان میں 40، مصر میں 100 جب کہ پاکستان میں دو سو کے قریب ہے۔ یہ اعداد و شمار یہودیوں کے سنسر بیورو سے حاصل کئے گئے ہیں، جبکہ عین ممکن ہے کہ فراہم کردہ معلومات زائد تعداد میں یہودی ان ممالک میں مقیم ہوں۔ پاکستان میں ان کی تعداد میں کچھ حد تک اضافہ ہوا ہے اور انکی یہ آمد 2005ء میں آنے والے زلزلے کے بعد ہوئی ہے۔ سابق صدر پرویز مشرف نے امریکی یہودی کمیونٹی سے خطاب کرتے ہوئے زلزلے میں انکی مدد اور تعاون پر شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ یہ یہودی مختلف این جی اوز کے ہمراہ پاکستان آئے اور پھر یہیں مقیم ہو گئے۔ آج پاکستان میں سب سے زیادہ

یہودی کراچی شہر میں آباد ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ انکی اکثریت ساحل سمندر کے پاس رہائش پزیر ہے، جو اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم اور یہودی تحریک کے سرخیل ڈیوڈ بنگوریان کی نصیحت اور مشورے پر عمل پیرا ہیں۔ اس نے 1967ء میں کہا تھا: ہمیں ہمیشہ بھارت کو اپنا دوست رکھنا ہوگا، کیونکہ پاکستان کیخلاف کام کرنے کے لیے بھارت ہمیں ایک مرکز کا کام دے گا۔ اس مقصد کیلئے ضروری تھا کہ بھارت میں یہودیوں کا ایک مضبوط نیٹ ورک موجود ہو اور ان کا پاکستان کے ساتھ رابطہ نہ ٹوٹے۔ اس کیلئے انہوں نے پاکستان سے بھارت جانے والے یہودیوں کو بھارت میں بسانا شروع کر دیا اور اور اس مقصد کیلئے کراچی کا ساحل استعمال کیا گیا۔ یہ روٹ ان کے لئے گلف ریاستوں اور ایران تک رسائی کے علاوہ بھارت پہنچنے کا راستہ تھا۔ یہودیوں کے اس خفیہ راستے کو 2000ء میں ایران نے دریافت کر لیا اور اس پر مکمل پہرہ بٹھا دیا۔ جس کے نتیجے میں وقتی طور پر ان کا یہ سمندری راستہ تو بند ہو گیا مگر بھارت کے ساتھ تعلقات کبھی سرد مہری کا شکار نہ ہوئے۔

آج کراچی میں موجود زیادہ تر یہودی اپنے آپ کو پارسی ثابت کرتے ہیں تا کہ یہودیوں کی سازشوں کے خلاف مسلمانوں میں پائے جانے والے ردعمل سے بچ سکیں۔ زیادہ تر پارسی پراپرٹی کا کام کرتے ہیں یا بلڈرز ہیں۔ میوہ شاہ قبرستان (کراچی) میں موجود یہودی لیڈر "سولیمن ڈیوڈ" کی قبر پر ویرانی کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب یہودی اس شہر سے جا چکے ہیں لیکن دوسری طرف جب 82 سالہ بوڑھی یہودی خاتون ریچل جوزف کو سندھ ہائی کورٹ کی سیڑھیوں پر چلتے دیکھا جائے جو 1980ء میں بیچے گئے "میگنی ڈیوڈ" کو دوبارہ آباد کرانا چاہتی ہے تو اس شہر میں یہودیوں کا عمل دخل اور وجود جنم لیتا محسوس ہوتا ہے۔

بعض پاکستانی اہل قلم کو یقین ہے کہ اسرائیل جیسے ملک کو جو بنا ہی ان یہودیوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے تھا، اپنے نظریاتی حریف پاکستان کے مالیاتی مرکز کراچی میں رہنا اور اسی شہر میں آئے دن حالات کا بگڑنا، لسانی فسادات کی آڑ میں ان دیکھی قوتوں کا فائدہ اٹھا کر ملک کو کمزور کرنا، کراچی سے غیر ملکی اسلحہ کا پکڑا جانا، ان تمام باتوں کے تانے بانے ضرور ملتے ہیں اور یہی کراچی کو درپیش اصل خطرہ ہے۔

## یہودیوں کی ملکیت عالمی طاقتور میڈیا گروپس

آج کی دنیا میں کون سی ایسی طاقتور چیز ہوگی جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے، جس کے آگے بڑی سے بڑی عسکری طاقتیں کھڑی نہ ہو سکیں، جس کے بل بوتے پوری دنیا پر حکومت کی جا سکے۔ اس کا جواب ڈھونڈنے کے لئے صیہونیوں کی ایک کتاب ''پروٹوکولز'' کا مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔ جس میں چند رونگٹے کھڑے کر دینے والے حقائق سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو دنیا میں موجود غربت، بیروزگاری، نفسانفسی، مادہ پرستی، بے سکونی، جنگ وجدل، جرائم اور فحاشی جیسے مسائل کی موجودگی کی اصل وجہ معلوم ہو جائے گی۔ اس کتاب کو کسی ایک آدمی نے تصنیف نہیں کیا بلکہ اس کو یہودیوں کی ایک اعلیٰ دماغ جماعت نے لکھا ہے جس کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر سامنے آ چکا ہے۔ اس کا اردو زبان میں ترجمہ محمد یحیٰ خان نے کیا ہے۔ اس کتاب کے بارہویں باب میں لکھا ہے'' ہماری منظوری کے بغیر کوئی ادنیٰ سی ادنیٰ خبر بھی کسی سماج تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس بات کو یقینی بنانے کیلئے ہم یہودیوں کے لیے ضروری ہے کہ ہم خبر رساں ایجنسیاں قائم کریں جن کا بنیادی کام ساری دنیا کے گوشے گوشے سے خبروں کا جمع کرنا ہو۔ اس صورت ہم اس بات کی ضمانت حاصل کر سکتے ہیں۔ کہ ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی خبر شائع نہ ہو'' یہ اقتباس ایک سادہ سا پیرا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے پس پردہ صیہونی عزائم انتہائی بھیانک ہیں۔ یعنی عوام کو اپنی مٹھی میں ایسے جکڑ لینا کہ ان کو جو کچھ یہ لوگ بتانا چاہیں صرف وہی بتایا جائے اور جو بات عوام کو بتانے والی نہیں ہے اسے مخفی رکھا جائے۔ اس طریقے سے لوگوں کے اذہان کو اپنی مرضی سے جدھر چاہے موڑا جا سکتا ہے۔ عوام کو اپنی مرضی سے ہنسایا جا سکتا ہے اور اپنی مرضی سے رلایا بھی جا سکتا ہے۔ جب چاہیں انہیں جذباتی کیفیت میں مبتلا کر کے ان کے جذبات کو ایک دہکتے ہوئے الاؤ میں تبدیل کیا جا سکتا اور اسی الاؤ سے شہروں کے شہر خاکستر بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے طاقتور چیز میڈیا ہے اور یہی یہودی آج میڈیا کے ساتھ ساتھ امریکہ سمیت دنیا کی سیاست، سفارت، تجارت اور معیشت پر قابض نظر آ رہے ہیں۔ امریکہ، یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک میں موجود ان یہودیوں نے امریکہ کو اس حد تک مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان

کی ناجائز ریاست اسرائیل کا ہر ممکن تحفظ کر رہا ہے۔اس کے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ اس وقت یہودیوں کی دنیا کے تمام بڑے اداروں اور سیاست وتجارت تک رسائی میڈیا ہی کی وجہ سے ہے۔امریکا اور یورپ میں یہودی اس طرح پنجے گاڑھ چکے ہیں کہ وہاں کی حکومتیں بھی ان کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہیں۔الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ اب سوشل میڈیا کو بھی اسرائیل اور امریکا ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جس کا نتیجہ ہم عرب سپر نگ کے کھیل میں دیکھ چکے ہیں۔انہی میں سوشل نیٹ ورک فیس بک بھی شامل ہے۔جس کے ذریعے اسرائیل خفیہ ایجنسی ''موساد'' نے جاسوسی کا نیٹ ورک پھیلا رکھا ہے۔فیس بک کا بانی نوجوان دنیا کا ارب پتی یہودی ہے۔انٹرنیٹ پر فیس بک ایک ایسی سہولت ہے۔جس کے ذریعے آپ اپنے دوستوں،عزیزوں اور چاہنے والوں سے رابطہ میں رہ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ سائٹ ہر ایک کے لئے فری ہے اور یہاں کوئی بھی اپنا اکاؤنٹ بنا کر سماجی روابط کو فروغ دے سکتا ہے،لیکن ایسا ہرگز نہیں، بلکہ اس کے ذریعے صیہونی جاسوسی کے ساتھ ساتھ ہزاروں ڈالر روزانہ کما رہے ہیں۔اسی فیس بک کی وجہ سے امریکہ اور صیہونیوں نے مل کر تین طاقتور حکومتوں کو چند دنوں میں ختم کر دیا۔قذافی لیبیا کا طاقتور ترین شخص تھا۔لیبیا کی حکومت مکمل طور پر اس کی گرفت میں تھی لیکن عالمی الیکٹرک میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے اس کو چت کر دیا۔اس کی تمام سکیورٹی دھری کی دھری رہ گئی۔میڈیا کے ذریعے اس قوم کو بھی جذباتی کر کے باہر نکالا گیا جن کا معیار زندگی دنیا کا بہترین معیار زندگی تھا۔فی کس آمدنی بھی دنیا میں سب سے زیادہ لیبیا میں تھی۔لیکن پھر بھی وہاں کی عوام کو اسی میڈیا کے ذریعے کھلونا بنا دیا گیا۔ان کے دماغوں میں آزادی اور جمہوریت کا بھوت سوار کر دیا گیا، جواب واقعی جمہوریت کے ثمرات سے ''لطف اندوز'' ہو رہے ہیں۔

اسی میڈیا کے ذریعے سے عوام کی برین واشنگ یا ذہنی دھلائی کی جاتی ہے۔جب عوام کی برین واشنگ ہو جائے تو اس پر اپنی مرضی کی تحریر لکھی جا سکتی ہے۔ان کے خیالات کو اپنے تابع کر لیا جاتا ہے اور ان سے ایک مفعول کی طرح کام لیا جاتا ہے جو صریحا اس کی مرضی اور شعور کے خلاف ہوتا ہے۔اس کے نتیجے میں مفعول اپنی سوچ، اپنے رویے، اپنے جذبات اور اپنی قوت فیصلہ پر اپنا قابو کھو دیتا ہے۔کنٹرولڈ مائنڈڈ آدمی حقیقت اور فکشن میں فرق نہیں

کر پاتا اور جھوٹ کو بھی اپنے تئیں حقیقت ہی سمجھتا ہے۔ بعض اوقات کسی آدمی کے لاشعور میں اس کی مرضی کے خلاف ایسی چیز ڈالی جاتی ہے جس کا کسی کو تصور بھی نہیں ہوتا کہ ایک جیتے جاگتے انسان کے دماغ میں کوئی چیز کیسے چسپاں کی جاتی ہے۔ اس کے لئے یہودیوں نے کافی تجربات کئے ہیں۔ اس میں ایک پروجیکٹ جس کا نام شارٹ ویژن ہے جس میں ٹیلی ویژن پروگرام کے ذریعے عوام کے دماغ میں ایسی چیز نقش کی جاتی ہیں جس میں ان کے شعور کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ چھوٹی سی بے ضرر دکھائی دینے والی ٹیلی ویژن سکرین کو ذہنی تخریب کے لیے ایک خاص تکنیک کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔ شارٹ ویژن ایک کامیاب پروجیکٹ ہے جو لوگوں کے ذہنوں تک پیغام پہنچانے کے لیے چلایا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے ٹیلی ویژن کو مخصوص سگنل نشر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کسی مخصوص امیدوار کو منتخب کروانے کے لئے بھی اس پروگرام کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں دنیا کی سیاست کو اسی طریقہ سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا جاتا ہے۔ اپنی مرضی کے حکمران اس ملک کی عوام پر مسلط کردیئے جاتے ہیں اور ان حکمرانوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروائے جاتے ہیں۔ جس سے ایک عالمی دجالی نظام وجود میں آرہا ہے۔ مغرب یہ جانتا ہے کہ آج کا دور میڈیا' برین واشنگ اور فکری یلغار کا ہے۔ اس لئے وہ اسلام کا مقابلہ کرنے اور اسے پسپا کرنے کے لئے نت نئے طریقے استعمال میں لاتا ہے۔ وہ باہر سے بھی دباؤ ڈالتا ہے اور اندر سے بھی جڑیں کھوکھلی کر کے نقب لگاتا ہے۔ آج کے دور میں ہم سر سے پاؤں تک اس دجالی نظام میں جکڑے جا چکے ہیں۔ یہ بات اب منظر عام پر آچکی ہے کہ امریکہ میں مقیم یہودیوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے صیہونی ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے میڈیا پر تسلط حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور آج امریکی میڈیا میں ان کے تسلط کی داستان سناتی ایک رپورٹ کے مطابق صرف چھ کمپنیوں نے 96 فیصد میڈیا کو اپنی ملکیت میں لیا ہوا ہے۔ جن کے مالک یہودی ہیں میڈیا کی ہی بدولت یہودیوں نے امریکہ کو یرغمال بھی بنایا ہوا ہے۔ امریکہ کے اقتدار کے ایوانوں اور امریکی معیشت پر چھائے ہوئے صیہونی ٹولے نے گزشتہ ایک صدی کے دوران رفتہ رفتہ تمام اخبارات اور چینلوں کو انکے اصل مالکوں سے خریدنا شروع کیا۔

انہی اخبارات اور چینلوں کو اب صیہونی پالیسیوں کی اشاعت اور مسلمانوں کے خلاف عالمی پراپیگنڈے اور عام امریکی باشندوں کو ایک خاص فکر ونظریے کے تحت ذہن سازی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس وقت امریکہ میں یہ صورت حال بن چکی ہے کہ سیاست کانگریس، ایوان صدر سے لیکر میڈیا کے تمام شعبوں میں اسرائیل نواز صیہونی ٹولے کا غلبہ ہے جو کہ خود امریکیوں کے لئے شدید تشویش کا باعث ہے۔ امریکہ میں میڈیا کمپنیوں میں سب سے بڑی کمپنی والٹ ڈزنی ہے جس کا مالک مائیکل آئیزنر ایک یہودی ہے۔ والٹ ڈزنی کمپنی میں شامل تمام ٹیلی ویژن چینل اور دو ویڈیو پروڈکشن کمپنیاں اسی شخص کی ملکیت ہیں۔ والٹ ڈزنی ٹیلی ویژن، ٹچ سٹون ٹیلی ویژن اور بیوناوز ناٹیلی ویژن اسی کمپنی کے مختلف چینل ہیں۔ اسی طرح فیچر فلموں کا گروپ، والٹ ڈزنی پکچر گروپ کا سربراہ راتھ جو بھی یہودی ہے۔ اس کی سربراہی اور انتظامی امور میں ہالی وڈ پکچرز، ٹچ سٹون پکچرز اور کاروان پکچرز جیسے مشہور ادارے اور فلمی کمپنیاں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈزنی گروپ وائٹ سٹائن برادرز کی سربراہی میں چلنے والی کمپنی "میرا فلمز" کا مالک بھی ہے۔ اس کمپنی کے صرف امریکہ کے اندر 225 الحاق شدہ سٹیشن ہیں جبکہ یورپ کے متعدد ٹیلی ویژن چینل بھی کسی حد تک اس کی ملکیت ہیں۔ امریکہ کی ایک اور مشہور میڈیا کمپنی اے بی سی کی ایک ذیلی شاخ espn کا صدر بورن سٹائن بھی یہودی ہے۔ ٹائم وارنر دنیا بھر میں میڈیا کمپنیوں میں دوسری بڑی کمپنی ہے جس کا مالک ڈینی گولڈ برگ نامی بھی ایک یہودی ہے۔ نت نئی نئی فلمیں دکھانے والا دنیا کا مشہور ترین ٹی وی چینل ایچ بی او اسی کا ایک ذیلی ادارہ ہے جو امریکہ میں میڈیا کی دنیا میں سب سے زیادہ منافع کما رہا ہے۔ تقریباً پچاس مختلف ناموں سے دنیا میں اس کمپنی کے معروف میوزک ریکارڈنگ ادارے موجود ہیں۔ ٹیڈ ٹرنر بھی ایک یہودی ہے جس نے 1985 میں سی این این کے نام سے ایک کامیاب کیبل ٹی وی نیوز چینل قائم کیا جو آج امریکہ میں خبروں کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس نے سی بی سی کو خریدنے کا ارادہ کیا تو ایک اور کھرب پتی یہودی لارنس ٹش نے اسے خرید لیا۔ ویاکام امریکہ کی تیسری بڑی میڈیا کمپنی ہے جسکا سربراہ سمنر ریڈسٹون بھی ایک یہودی ہے۔ اس کمپنی کا سالانہ ریونیو 10 ارب ڈالر ہے۔ ویاکام میڈیا کمپنی ٹی وی پروگراموں کو بناتی اور ملک کے تین بڑے نیٹ ورکس کو بیچتی ہے۔ اس کمپنی کے پاس 12 ٹیلی

ویژن سٹیشن اور 12 ریڈیو سٹیشن ہیں۔ پیراماؤنٹ پکچرز کے نام سے یہ فیچر فلمیں بناتی ہے۔جس کی سربراہ ایک یہودی خاتون شیری لیننگ ہے۔

آسٹریلوی نژاد کروڑ پتی تراسی سالہ روپرٹ مورڈاک جس کا نام سالہا سال سے میڈیا پر قابض کی حیثیت سے لیا جار ہا ہے جو کبھی برطانوی شہریوں اور حکام کے ذاتی ٹیلی فون کی ریکارڈنگ بھی کرتا رہا ہے۔ اس وقت وہ نیوز آف دی ورلڈ نامی میگزین نکالتا تھا جس کی ریکارڈنگ منظر عام پر آنے کے بعد بند کر دیا گیا۔ وہ گزشتہ کئی عشروں سے مختلف سیٹلائٹ چینلوں اور الیکٹرانک میڈیا پر مسلط ہے اور مختلف طریقوں سے مغربی کلچر اور صیہونی پالیسیوں کی ترویج میں مصروف ہے۔ مورڈاک کے زیر نظر چلنے والے ذرائع ابلاغ ثقافتی آزادی اور مختلف نظریات کا عوام میں پرچار کر رہے ہیں۔ اسکے پیش کئے گئے پروگراموں میں قوم پرستی اور اسلام دشمنی پر مبنی نظریات کثرت سے دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ مورڈاک افغانستان وعراق پر امریکی جارحیت اور لیبیا پر ناٹو کے حملے کا زبردست حامی بھی رہا ہے۔ اس کی کمپنی فاکس ٹی وی اور 20th سینچری فاکس فلم کی مالک ہے۔

پیٹر چرمن جو مرڈوک فلم سٹوڈیو اور اور سیز ٹی وی پروڈکشن کا سربراہ ہے وہ یہودی ہے۔ یونیورسل پکچرز بھی فلمی دنیا میں ایک جانا پہچانا اور معروف نام ہے۔ اس کا سربراہ ایڈ گر برونف مین ہے جو نہ صرف ایک یہودی ہے بلکہ یہودیوں کی ایک تنظیم عالمی یہودی کانگریس کا صدر بھی ہے۔ اس کے علاوہ پرنٹ میڈیا میں ان یہودیوں کے تسلط کا یہ عالم ہے کہ امریکہ میں ہر روز اخبارات کی 6 کروڑ کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اشاعت والے تین اخبارات نیویارک ٹائمز، وال سٹریٹ جرنل اور واشنگٹن پوسٹ بھی یہودیوں کی ملکیت ہیں ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک کوئی خبر نیویارک ٹائمز، وال اسٹریٹ جرنل اور واشنگٹن پوسٹ میں شائع نہیں ہوتی وہ اس وقت تک ایشو نہیں بن سکتی۔ ان حقائق کے جاننے کے بعد کوئی دو رائے نہیں کہ یہودی عالمی سطح پر حکومت قائم کرنے کے لئے عالمی میڈیا پر قابض ہو چکے ہیں۔ امریکہ اور یورپی ممالک کو اپنی انگلیوں پر نچا کر دنیا میں ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلا رہے ہیں۔ آج یہودی میڈیا اس پوزیشن میں ہے کہ وہ پوری دنیا کو جس نہج پر اور جس سمت میں لے جانا چاہے لے جا سکتا ہے۔ لوگ غیر ارادی

اور غیر شعوری طور پر میڈیا کے ذریعے پھیلائی ہوئی باتوں کو بسر و چشم قبول کر لیتے ہیں۔ گویا میڈیا واضح الفاظ میں دن کو رات' سفید کو سیاہ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر سکتا ہے۔ ان حقائق کے جاننے کے بعد اس میڈیا سے یہ امید بھی نہیں رکھی جا سکتی کہ یہ ہمیں دنیا میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم یا مسلمانوں کے متعلقہ کسی بھی واقعے کی حقیقی تصویر دکھائے گا، یقیناً نہیں، یہ وہی کچھ دکھاتا ہے جو اس کو دکھانے والے چاہتے ہیں۔ تہذیبوں کے تصادم کی جنگ میں اس کا اہم کردار ہے جو گھروں میں بیٹھے لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کر رہا ہے۔ ان کی اپنی تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو دکھایا جاتا ہے جس سے ایک نئی جنگ شروع ہوتی ہے اور لوگ باغیانہ خیالات کی پرورش کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایک دن یہ ابال کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر ایک داخلی جنگ شروع ہوتی ہے گلیوں، بازاروں تک پہنچ کر خون ریزی پر منتج ہوتی ہے۔

## پاکستان کے ایٹمی راز چرانے والا اسرائیلی جاسوس

امریکی تاریخ میں 1985ء کا برس ''سال جاسوساں'' (spiesofYear) کے طور پر مشہور ہے۔ اس سال امریکی انٹیلی جنس نے اپنے پانچ غیر ملکی جاسوس شناخت کیے جو امریکا کے مختلف اداروں میں جاسوسی کر رہے تھے۔ ماہ مئی میں انکشاف ہوا کہ امریکی بحریہ کا سابق افسر جان والکر سوویت خفیہ ایجنسی، کے جی بی کو انتہائی اہم قومی راز دے چکا ہے۔ پھر ستمبر میں معلوم ہوا کہ سی آئی اے کا افسر ایڈورڈ لی ہوورڈ بھی روسیوں کا ایجنٹ ہے۔ 22 نومبر کو سی آئی اے ہی کا ملازم، لسیری وو تی پکڑا گیا۔ اس پر چین کے لیے جاسوسی کرنے کا الزام تھا۔ دو دن بعد ایک امریکی خفیہ ادارے نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کا ملازم رونالڈ پیلٹن گرفتار ہوا۔ یہ بھی سوویت یونین کا جاسوس بنا بیٹھا تھا۔ لیکن امریکا میں 1985ء کا سب سے بڑا دھما کا 21 نومبر کو ہوا جب اسرائیلی جاسوس، جوناتھن پولارڈ امریکی ایف بی آئی کے ہتھے چڑھا۔ چونکہ امریکا کا قریب ترین ساتھی اسرائیل ہے، لہٰذا ایک اسرائیلی جاسوس کی گرفتاری پر ملک میں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کئی امریکی صحافیوں نے یہ سچ اُجاگر کیا: ''امریکا سب سے زیادہ اسرائیل کو امداد و سرمایہ دیتا ہے، لیکن اسی مملکت کا جاسوس امریکی راز چرا رہا ہے۔'' گویا اسرائیلی جس تھالی میں کھاتے تھے، اسی میں چھید کرنے لگے۔ جوناتھن پولارڈ پر مقدمہ چلا، اس پر امریکی

قانون، اسپیونیج ایکٹ (actEspionage) کی خلاف ورزی کرنے کاالزام تھا۔ الزام ثابت ہوا، چنانچہ 4 مارچ 1987ء کو اُسے عمر قید کی سنادی گئی۔ اس دوران امریکی سی آئی اے یہ چھان بین کرنے لگی کہ پولارڈ نے امریکی بحریہ کے انٹیلی جنس دفتر سے کتنی اہم اور خفیہ دستاویزات چراکر اسرائیل کو دے ڈالیں۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ وہ تقریباً 800 دستاویزات چرا چکا تھا جو ایک الماری میں سما جائیں۔ اس سنسنی خیز اسکینڈل کے متعلق سی آئی اے نے ایک انتہائی خفیہ رپورٹ بعنوان ''دی جوناتھن جے پولارڈ اسپیونیج کیس: اے ڈیمیج اسیسمنٹ'' تیار کی جو 30 اکتوبر 1987ء کو مکمل ہوئی۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا کہ جوناتھن نے کس قسم کے امریکی راز چرائے۔ رپورٹ منظرِ عام پر امریکا میں واقع جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے ایک غیر سرکاری تنظیم، نیشنل سیکیورٹی آرچیو پروجیکٹ کی سعی ہے کہ امریکی حکومت کے اندازِ کار میں پایا جانے والا خفیہ پن (Secrecy) کم کیا جائے۔ اسی سلسلے میں اس نے امریکی حکومت سے اپیل کی کہ جوناتھن پولارڈ کے متعلق سی آئی اے کی خفیہ رپورٹ افشا (Declassified) کر دی جائے۔ اپیل منظور ہوئی اور 14 دسمبر 2012ء کو رپورٹ جاری کر دی گئی۔

## پاکستان کے ایٹمی راز چرانے کی مہم کا آغاز

پاکستان کے متعلق اس رپورٹ میں ایک بڑا انکشاف کیا گیا کہ اسرائیلی حکومت نے پولارڈ کو یہ ذمے داری بھی سونپی کہ وہ پاکستانی ایٹمی پروگرام کے متعلق معلومات اکٹھی کرے۔ یہ معلومات امریکی سیکرٹ ایجنسیوں کے پاس خفیہ دستاویزات کی صورت میں محفوظ تھیں۔ چنانچہ 1984ء تا 1985ء کے دوران پولارڈ نے کہوٹہ یورینیم افزودگی پلانٹ اور دیگر پاکستانی ایٹمی تنصیبات کے متعلق معلومات امریکی خفیہ اداروں کے ڈیٹا سنٹر سے اڑائیں اور اسرائیلی حکومت کو دے ڈالیں۔ رپورٹ یہ بھی آشکار کرتی ہے کہ امریکی خفیہ ایجنسیوں میں گھسے اپنے ایجنٹ کو اسرائیلیوں نے یہ ذمے داریاں بھی تفویض کیں کہ عرب اور پاکستانی ایٹمی پروگراموں کی تفصیل جمع کرو، عرب افواج کے ہتھیاروں کی معلومات بشمول کیمیائی ہتھیار، سوویت جنگی جہازوں، میزائلوں کی تفصیلات اور یہ کہ عرب فوجیں مقابلے کے لیے کس حد تک تیار ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رپورٹ جاری کرتے ہوئے امریکی حکومت نے اُسے سنسر کا

نشانہ بنا ڈالا۔ اسی باعث پڑھنے والے کو صرف جستہ جستہ معلومات ہی ملتی ہیں۔ رپورٹ کے صفحہ 58 پر درج ہے:

''مسٹر پولارڈ نے جو دستاویزات چرائیں، ان سے اسرائیل کو بہت فائدہ ہوا۔''

''پولارڈ نے تیونس میں واقع تنظیم آزادی فلسطین کے ہیڈکوارٹر، تیونسی اور لیبیئن فضائی دفاع اور اسلام آباد (پاکستان) کے نزدیک واقع پروسیسنگ پلانٹ سے متعلق دستاویزات فراہم کیں۔''

ان دستاویزات سے یقیناً اسرائیلی حکومت کو اہم معلومات ملیں۔ اکتوبر 1985 میں اسرائیلی طیاروں نے تیونس میں پی ایل او کا ہیڈکوارٹر بمباری کر کے تباہ کر دیا۔ سی آئی اے کی رپورٹ میں کل 10 جگہ پاکستان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن بیشتر جگہ تفصیل سنسر کر دی گئی۔ اس باعث یہ امر بخوبی سامنے نہیں آتا کہ پولارڈ نے پاکستانی ایٹمی منصوبے کی کس قدر معلومات اسرائیل کو دے کر پاکستان کا مستقبل خطرے میں ڈالا۔ رپورٹ میں ایک جگہ درج ہے کہ اسرائیلی حکومت مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاسی و معاشرتی انٹیلی جنس سے زیادہ عسکری و ٹیکنیکل خفیہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی اور اسرائیلی نکتہ نگاہ سے مشرق وسطیٰ مراکش سے پاکستان اور لبنان سے یمن تک پھیلا ہوا ہے۔ امریکا اور پاکستانی ایٹمی پروگرام امریکیوں کی افشا کردہ رپورٹ میں افغان جہاد اور اس میں پاکستان کے کردار کی بابت بھی ذکر موجود ہے۔ تاہم رپورٹ یہ نہیں بتاتی کہ امریکی خفیہ ادارے پاکستانی ایٹمی منصوبے کے متعلق کتنی معلومات رکھتے تھے۔ تاہم سی آئی اے کی دیگر ڈی کلاسیفائیڈ دستاویزات سے خاصے اشارے ملتے ہیں۔ ان سے انکشاف ہوتا ہے کہ 1980 تک امریکی حکومت جان چکی تھی کہ پاکستان کا ایٹمی منصوبہ خاصا آگے بڑھ چکا ہے۔ تاہم اسی دوران افغانستان میں مجاہدین سوویت یونین کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ چونکہ امریکا اور پاکستان افغان سوویت جنگ میں قریبی ساتھی بن گئے، لہٰذا امریکی حکومت پاکستانی ایٹمی منصوبہ روکنے کی خاطر کوئی ٹھوس اقدام نہ کر سکی۔

1982ء میں سی آئی اے نے امریکی صدر رونالڈ ریگن کو یہ رپورٹ دی کہ پاکستانی بڑے جوش و خروش سے ایٹم بم بنانے کی جانب گامزن ہیں۔ اس پر رونالڈ ریگن نے سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ورنون والسٹرز کو پاکستانی حکمران، جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف

دوڑا دیا۔ پاکستانی صدر نے امریکی جنرل کو یقین دلایا کہ پاکستان ایٹم بم تیار نہیں کر رہا۔ مگر سی آئی اے کا دعویٰ تھا کہ پاکستانی کم از کم ایک ایٹم بم بنانے کے لیے یورینیم افزودہ کر چکے ہیں۔ بہرحال پاکستانی صدر کسی نہ کسی طرح امریکیوں کا دباؤ سہنے میں کامیاب رہے۔

سی آئی اے کی ایک دستاویز یہ دلچسپ انکشاف کرتی ہے کہ ریگن انتظامیہ نہیں چاہتی تھی کہ پاکستانی اسے اپنے راز بتائیں۔ دراصل ریگن حکومت کو خطرہ تھا، اگر یہ سچائی عیاں ہوگئی کہ پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے، تو پھر کانگریس میں شور مچ جاتا۔ تب کانگریس پاکستان کو دی جانے والی امداد روک سکتی تھی اور اسی امداد کی بنیاد پر افغانستان میں سوویت فوج کے خلاف جنگ بھی جاری تھی۔ سوال یہ ہے کہ بھارت و اسرائیل نواز امریکی سینیٹر کیوں خاموش رہے؟ جبکہ آج امریکی و اسرائیلی حکومتیں بڑے شدومد سے ایرانی ایٹمی منصوبے کے خلاف صف آرا ہیں۔

دراصل صدر جمی کارٹر کے دور (1976ء تا 1980ء) ہی سے امریکی حکومت نے خفیہ طور پر یہ کوششیں شروع کر دیں کہ پاکستانی ایٹم بم بنانے میں مستعمل حساس ٹیکنالوجی تک نہ پہنچ پائیں۔ اس ضمن میں انھیں یورپی حکومتوں کا تعاون بھی حاصل رہا، مگر پاکستانی بھی مختلف چالیں چل کر ٹیکنالوجی، پرزہ جات اور آلات حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ امریکی حکومت کو یقین تھا کہ اس طریقے سے پاکستانی ایٹمی پروگرام کی رفتار سست ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ اُسے دھچکا بھی لگے۔ (اسرائیلی اور امریکی حکومتیں اسی قسم کے اقدامات ایران کے خلاف بھی کر رہی ہیں مثلاً 2008ء میں سٹکس نیٹ وائرس کا حملہ) انہی خفیہ سرگرمیوں نے بھارت و اسرائیل نواز امریکی سینیٹروں کو پاکستانی ایٹمی منصوبے کے خلاف کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھانے دیا۔

وطن عزیز کا ایٹمی منصوبہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں پھلا پھولا۔ جنرل صاحب ستائش کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دو امریکی صدور جمی کارٹر اور رونالڈ ریگن کی حکومتوں کے زبردست دباؤ کا بھرپور مقابلہ کیا۔ آخرکار 1983ء میں کہوٹہ میں اتنا یورینیم افزودہ کر لیا گیا کہ ایک ایٹم بم بن سکے۔ جنرل ضیاء الحق کی حکمت عملی بہت کامیاب رہی۔ 1987ء میں امریکی کسٹمز افسروں نے پاکستانی نژاد امریکی، ارشد پرویز کو اس جرم پر گرفتار کر لیا کہ وہ کہوٹہ مرکز

کے لیے سامان اسمگل کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ریگن انتظامیہ نے یہ سرٹیفکیٹ کانگریس میں پیش کر دیا کہ پاکستان کوئی ایٹمی ہتھیار نہیں رکھتا۔ جوناتھن پولارڈ کی داستان امریکا سے غداری کرنے والا جوناتھن پولارڈ 7 جنوری 1957ء کو ریاست ٹیکساس میں پیدا ہوا۔ اس کا پروفیسر باپ ایوارڈ یافتہ ماہر جرثومیات اور نوٹرے ڈیم یونیورسٹی میں اُستاد تھا۔

جوناتھن کے والدین بڑے اسرائیل نواز تھے۔ چنانچہ ان کی آغوش میں پرورش پاتے ہوئے اسرائیل کی ہر ممکن مدد کرنا اس کا مذہبی فریضہ بن گیا۔ 1970ء میں وہ پہلی بار اسرائیل پہنچا اور مذہبی و تاریخی مقامات کی سیر کرتا رہا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد جوناتھن نے اسٹینفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور 1976ء میں سیاسیات میں ڈگری پالی۔

1979ء سے جوناتھن کسی امریکی خفیہ ادارے میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سی ائی اے میں درخواست دی مگر اُسے نوکری نہ مل سکی۔ دراصل سی ائی اے کو تفتیش سے معلوم ہو گیا کہ موصوف 1974 اور 1978ء میں منشیات کا عادی رہا ہے۔ وہ پھر امریکی بحریہ کے خفیہ ادارے، نیوی فیلڈ اپریشنل انٹیلی جنس آفس میں جا گھسا۔ جوناتھن بڑبولا، دوسروں کے کام میں دخل دینے والا اور مشکوک شخصیت کا مالک تھا۔ اسی لیے ادارے میں اُسے حساس نوعیت کے ریکارڈ سے دور رکھا گیا۔ اونچ نیچ کے باوجود وہ محکمہ جاتی ترقی کرتا رہا اور اکتوبر 1984ء میں اُسے امریکی بحریہ کی خفیہ ایجنسی، نیول انٹیلی جنس کمانڈ میں تجزیہ کار (Analyst) بنا دیا گیا۔ اسرائیلی افسر سے رابطہ اس حیثیت سے جوناتھن کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ حساس اور خفیہ دستاویزات تک رسائی پالے۔ انہی دنوں اس کی ملاقات اسرائیلی فضائیہ کے اعلیٰ افسر، ایویم سیلا سے ہوئی۔ ایویم نیویارک یونیورسٹی میں کمپیوٹر سائنس کی ماسٹرز ڈگری حاصل کرنے امریکا آیا ہوا تھا۔ جوناتھن جلد اپنے دوست سے گھل مل گیا۔ اس نے ایویم سے اپنا تعارف کرایا اور اُسے پیشکش کی کہ وہ ایسی خفیہ معلومات چرا کر اسرائیلی حکومت کو دے سکتا ہے جو امریکیوں نے دانستہ چھپا رکھی ہیں۔

ایویم شروع میں تو چوکنا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ سی آئی اے اُسے پھنسانے کے چکر میں ہے۔ لیکن پھر اس نے جوناتھن پر اعتبار کر ہی لیا۔ چنانچہ ایک دن ایویم نے تل ابیب اپنے ایئر فورس انٹیلی جنس کمانڈر کو فون کیا اور اُسے ساری تفصیل سنا کر مزید ہدایات مانگیں۔ کمانڈر

نے فضائیہ کے چیف سے رابطہ کر کے سارا ماجرا سنایا۔ چیف نے ایویم کو حکم دیا کہ وہ جوناتھن سے معاملات طے کر لے۔ چند روز کے اندر اندر، جون 1984ء سے جوناتھن کلاسیفائیڈ امریکی دستاویزات چرا کر ایویم کے حوالے کرنے لگا۔ جب اسرائیلیوں نے معلومات قیمتی اور حسب منشا پائیں، تو وہ خوشی کے مارے اچھلنے لگے۔ اسرائیلی حکومت نے اپنے وطن سے غداری کرنے پر جوناتھن کو بیش قیمت انعام بھی دیا۔ جوناتھن کو شروع میں ایک قیمتی ہیرا، زمرد کی انگوٹھی اور 10 ہزار ڈالر بطور انعام ملے۔ یہ دولت پا کر جوناتھن اس قابل ہو گیا کہ مدتوں سے چلی آ رہی اپنی گرل فرینڈ سے شادی رچا سکے۔ مزید برآں اسرائیل نے اُسے ماہانہ 1500 ڈالر بطور خرچہ پانی بھی دینا منظور کیا تا کہ وہ ارض موعود کی بدستور خدمت کرتا رہے۔ اسرائیلی حکومت کے اس فرمانبردار نے اہم امریکی دستاویزات اپنے کرم فرماؤں کے حوالے کیں۔

ooo
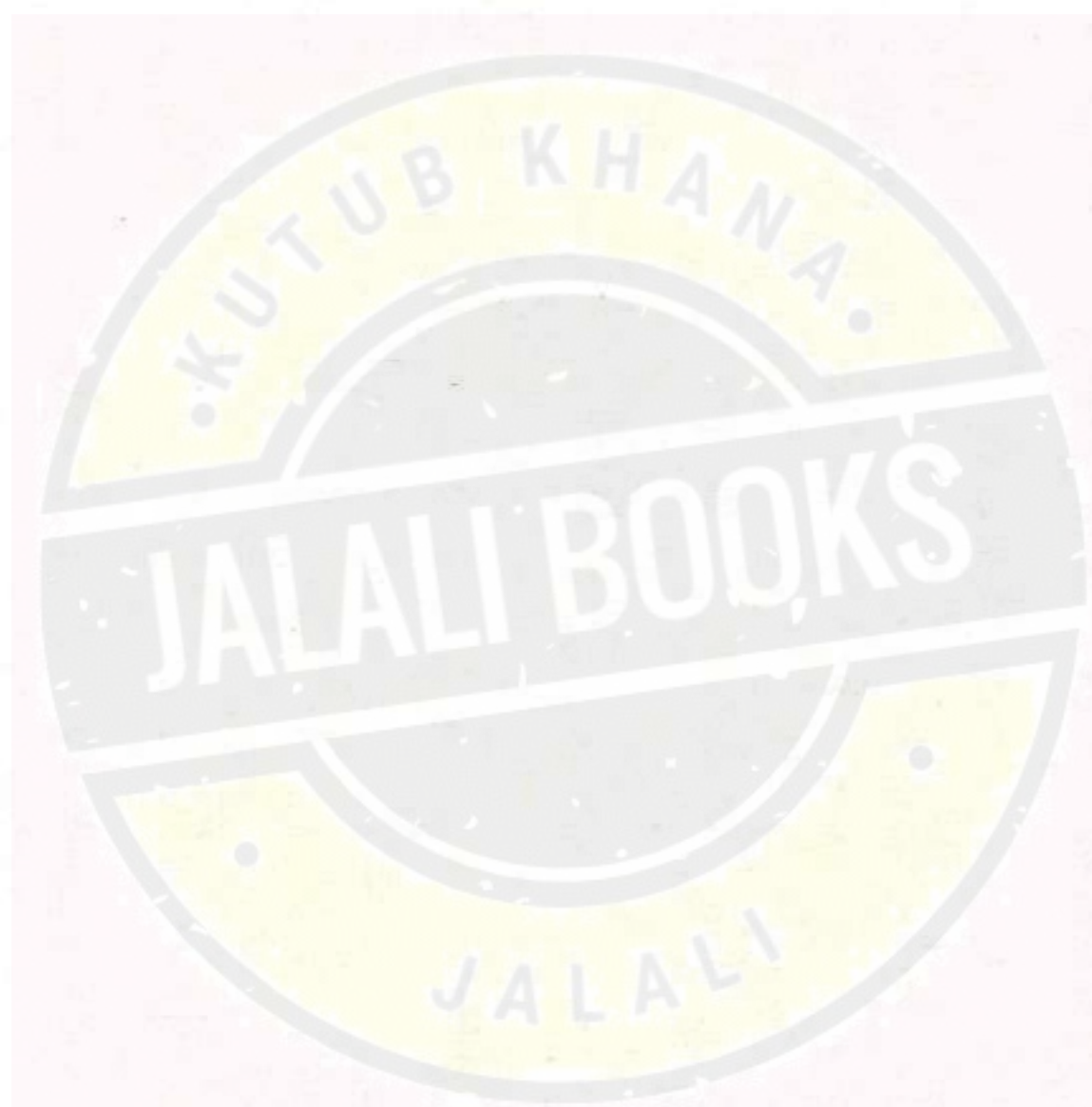
انسان ماضی حال اور مستقبل کے تغیرات کا سامنا کرتے ہوئے کس قدر تبدیل ہوجاتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نصف سے زائد زندگی گزارنے کے بعد اس کیلئے یہ فیصلہ کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے کہ ماضی کی سنگلاخ رہگذروں اور حال کی بے ثبات حقیقتوں سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے وہ شکست کھا چکا ہے یا فتح سے ہمکنار ہوا ہے۔ شکست اور فتح کے الگ الگ معیار ہیں، معنوی اعتبار سے یہ ہر نفس کیلئے الگ اہمیت کے حامل ہیں۔ بعض لوگ ہار کر بھی فتح مند دکھائی دیتے ہیں اور کچھ فتح یاب ہو کر بھی شکستگی کی عملی تصویر جیسے ہوتے ہیں۔

''پاکستان میں بین الاقوامی مداخلتیں'' کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی ناگزیر ہے کہ میرے نام میں لفظ ''صدیق'' کی ''مداخلت'' کیونکر ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ''ذبیح اللہ بلگن'' سے ''ذبیح اللہ صدیق بلگن'' بننے تک راقم نے ایام کی تلخی کو گھونٹ گھونٹ پیا ہے۔ مجھے کہہ لینے دیجئے کہ تلخی ایام کو قطرہ قطرہ حلق سے اتارا ہے مگر اس کے باوجود میں کسی طور بھی خود کو شکست خوردہ تصور نہیں کرتا اس کا واضح سبب یہ ہے کہ میں جہاں ہوں اور جیسا ہوں اس سے بڑھ کر مجھے کچھ درکار تھا اور نہ میسر۔ والد محترم چودھری محمد صدیق بلگن کی پرورش اور محبت کا تقاضا تھا کہ ان کے اسم کو اپنے نام کا حصہ بنالوں اس سے بڑھ کر اور بہت کچھ ہوسکتا تھا جسے ان کی خدمت اور محبت شمار کیا جاتا تاہم یہ ان کی خدمت اور محبت کی ایک صورت ہے کہ میں ذبیح اللہ سے ذبیح اللہ صدیق بن گیا۔

کتاب ''پاکستان میں بین الاقوامی مداخلتیں'' اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھوتی اور منفرد کتاب معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ پاکستان میں بین الاقوامی مداخلت کے حوالے سے ہر پاکستانی شہری بخوبی آگاہ ہے، تاہم میں اس بابت قارئین کو یقین دلاتا ہوں کتاب میں درج معلومات اور تاریخی حقائق آپ کیلئے یقیناً منفرد بھی ہیں اور نئے بھی۔ قیام پاکستان سے لے کر تادم تحریر امریکہ، اسرائیل، سعودی عرب، ایران، روس، ترکی، برطانیہ، افغانستان اور بھارت نے کس کس انداز سے پاکستان میں مداخلت کی؟ ان تمام ممالک کی پاکستان میں منفی اور مثبت سرگرمیوں کا مفصل ذکر کردیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مذکورہ کتاب آپ کیلئے بہتر معلومات کا موثر ذریعہ ثابت ہوگی۔

ذبیح اللہ صدیق بلگن


**نگارشات پبلشرز**

24 مزنگ روڈ، لاہور۔ پاکستان

Ph: +92-42-37322892 Fax: 37354205

E-mail: nigarshat@yahoo.com